لبادہ

محی الدین نواب

علی میاں پبلی کیشنز
۲۰۔عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔فون: ۷۲۴۷۴۱۴

بار اول ———— ۲۰۰۸ء

مطبع ———— یو اینڈ ڈی پرنٹرز، لاہور

کمپوزنگ ———— عاطف کمپوزر۔ لاہور

قیمت ———— ۲۰۰ روپے

حمیدی

اسٹاکسٹ

علی بُک سٹال

نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور

لبادہ

ایک فلمی ہیروئن کی کہانی جو شادی شدہ ہوتے ہوئے بھی کنواری تھی۔

اس شوہر کا فسانۂ عبرت جسے اپنی بیوی پر کوئی اختیار نہ تھا۔

مجبوریوں کی ڈور سے بندھے، مصلحتوں کا لبادہ اوڑھے دو

فنکاروں کی داستان جو زندگی کے اسٹیج پر کامیابی سے

اداکاری کے جوہر دکھا رہے تھے۔

ہوس بھرے اور منافق معاشرے پر بھرپور تازیانہ۔

میں جہاں قید کیا گیا تھا' وہاں گہری تاریکی تھی۔ تاریکی اس لئے بھی تھی کہ کمرے کی دیواریں اندر سے گہرے رنگ کی تھیں۔ دروازوں اور کھڑکیوں کے پردے بھی گہرے نیلے تھے۔ اگر بلب روشن ہوتے تب بھی روشنی میں اندھیرے کا میلا پن ضرور ہوتا۔ دراصل اندر میل بھرا ہو تو اوپر کا اجلا پن بھی اسے دور نہیں کر پاتا۔

ویسے کمرہ جتنا تاریک تھا' میری قسمت اتنی ہی روشن تھی۔ لوگ میری خوش قسمتی پر رشک کرتے تھے کہ میں ایک مشہور' مہنگی اور ستارے کی طرح چمکتی ہوئی اداکارہ کے ساتھ رہتا تھا۔ کبھی ملازم کی حیثیت سے میک اپ بکس اور لباس اٹھائے پیچھے پیچھے چلتا تھا اور کبھی باڈی گارڈ بن کر آگے آگے رہتا تھا۔ اس پری پیکر کے شانہ بشانہ چلنے کا بھی فخر حاصل ہوتا رہتا تھا۔

وہ بے حد حسین تھی۔ جب میک اپ کر لیتی تو اس کے حسن کو چار چاند لگ جاتے تھے۔ دیکھنے والے اسے حسرت بھری اور للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے رہ جاتے تھے۔ ایسے وقت میرے اندر سے بھی آہیں نکلتی تھیں۔ میں بھی اسے دیکھ دیکھ کر ترستا رہتا تھا۔ دل ایک ضدی بچے کی طرح اس چاند کو چھونا چاہتا تھا لیکن وہ فل میک اپ کی سحر انگیزی کے بعد مجھے چھونے کی تو کیا' قریب آنے کی بھی اجازت نہیں دیتی تھی۔ جبکہ میں قربت حاصل کرنے کا شرعی حقدار تھا۔ یعنی اس کا شوہرِ نامدار تھا۔

درحقیقت میں اس کا آقا بھی تھا اور غلام بھی۔ باڈی گارڈ کا مفہوم ہے محافظ لیکن باڈی کے لغوی معنی ہیں' بدن اور گارڈ کے معنی ہیں حفاظت کرنے والا۔ گویا کہ میں مفہوم کے اعتبار سے ایک محافظ (ملازم) تھا اور معنویت کے لحاظ سے اس کے بدن کا رکھوالا تھا۔ یہ روشنی اور اندھیرے کا تماشا تھا۔ خواب گاہ کے باہر روشنی میں یہ شوہر وفات پاتا تھا اور خواب گاہ کے اندر تاریکی میں سوغات۔

ہمارے ہاں شو بزنس میں بہت سی روایات پائی جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک روایت سمجھوتے کی ہے۔ خاص طور پر فلم انڈسٹری میں سمجھوتے کے عمل کو بڑی اہمیت دی جاتی

ہے۔ بھائی سمجھوتے کی عینک لگا کر بڑی بے حسی سے بہن کو دوسرے کے ساتھ رومانی اور جذباتی سین کرتے دیکھتا ہے اور تالیاں بجا کر بہن کی پرفارمنس کی داد دیتا ہے۔ اسی طرح ایک شوہر اپنی بیوی کو بھانت بھانت کے ہیرو کی بانہوں میں جھولتے اور گلے سے لگتے دیکھتا ہے اور تماش بین حضرات سے اپنی بیوی کی تعریفیں سن کر بظاہر خوش ہوتا ہے مگر اندر ہی اندر حسد اور رقابت سے جلتا ہے۔

میں بھی رقابت کی آگ میں جلتا تھا مگر سمجھوتے کے پیالے سے خون کے گھونٹ پیتا رہتا تھا۔ آدمی خواہ کتنا ہی ضدی ہو' وہ رفتہ رفتہ ایسی بات کا بھی عادی بن جاتا ہے' جو اس کی فطرت کے خلاف ہوتی ہے۔ میں بھی رفتہ رفتہ بے غیرت بنتا گیا اور اپنے مزاج کے خلاف ہر بات برداشت کرنے کا عادی ہو گیا۔ بس ایک بات برداشت نہیں ہوتی تھی۔

جب وہ کیمرے کے سامنے آنے سے پہلے میک اپ کرتی۔ ہیئر اسٹائل بدلتی۔ زیورات اور ہوشربا ملبوسات سے اپنے حسن و شباب کا جادو جگانے میں مصروف رہتی تو وہ میرے لئے نئی اور اچھوتی بن جاتی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے آج تک میں نے اسے چھو کر نہیں دیکھا ہے۔ وہ بیوی نہیں ہے۔ وہی فلمی کنواری ہے' جسے اسکرین پر دیکھ کر لوگ تڑپتے ہیں' ترستے ہیں اور بازار سے اس کی تصویریں خرید کر ٹائلٹ کی دیواروں پر چسپاں کرتے ہیں۔ پھر پتا نہیں کیوں بیماروں کی طرح کراہتے ہیں۔ ایسے بیماروں کی عیادت کرنے کوئی حمام میں نہیں جاتا۔ عیادت کے لئے وہی تصویریں ہوتی ہیں' جو درد بھی ہوتی ہیں اور دوا بھی۔

فلم دیکھنے والے تمام لوگ اس کی تصویروں سے بہلتے ہوں گے مگر میں کیسے بہل جاؤں۔ میں تماش بین نہیں' شوہر ہوں۔ جب چاہوں اسے چھو سکتا ہوں مگر وہ اس وقت چھونے نہیں دیتی تھی۔ تنبیہہ کے انداز میں انگلی اٹھا کر کہتی۔ "اے' چلو اُدھر جا کر شرافت سے بیٹھو۔ ورنہ میک اپ روم سے نکال دوں گی۔"

اسٹوڈیو کے میک اپ روم میں اس سے میں جھگڑا نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ وہاں اس کا ملازم تھا۔ سب مجھے اس کا پرسنل سیکرٹری اور باڈی گارڈ کہتے تھے کہ میرے شانے سے کارتوس کی پیٹی لٹکی رہتی تھی اور ہولسٹر میں ریوالور نظر آتا تھا۔

جب وہ آؤٹ ڈور شوٹنگ پر جانے کے لئے اپنی خواب گاہ کے ڈریسنگ ٹیبل اور قدِ آدم سہ طرفہ آئینوں کے سامنے میک اپ کرتی تھی تو میں کہتا تھا۔ "میک اپ کے بعد تمہارے چہرے پر ایک نیا چہرہ آ جاتا ہے۔ تمہارے بدن کی سجاوٹ اور لباس کی تراش خراش تمہیں ایک نئی الھڑ دوشیزہ بنا دیتی ہے۔ تم کسی پہلو سے میری بیوی نہیں لگتی ہو۔ کیا

ذرا سا چھو لوں؟"

وہ آنکھیں دکھا کر کہتی۔ "تم نے پھر بکواس شروع کر دی۔ پتا نہیں تم کیوں اتنے حریص اور ندیدے ہو۔ کبھی تمہارا پیٹ ہی نہیں بھرتا۔"

"بیوی سے بھر جاتا ہے۔ تم سے نہیں بھرتا۔ تم کوئی اجنبی دوشیزہ لگتی ہو۔ سنا تھا زلیخا کو بڑھاپے میں جوانی واپس ملی تھی۔ تمہیں جوانی میں ایک اور جوانی اور تازگی مل جاتی ہے۔ یہ اسٹوڈیو کا میک اپ روم نہیں ہے۔ ہمارا بیڈ روم ہے میں تمہیں ہاتھ لگا سکتا ہوں۔ یہ میرا حق ہے۔"

"یہ میرا اور تمہارا بیڈ روم اس وقت تک ہے جب تک میں تمہیں شوہر مان کر تمہاری پرورش کر رہی ہوں۔ اپنی حد میں نہیں رہو گے تو دھکے دے کر کوٹھی سے نکال دوں گی۔"

ایک مظلوم بیوی رو دھو کر اپنے میکے چلی جاتی ہے' میں مرد ہوں۔ میرا کوئی میکا نہیں تھا۔ میں جہاں تھا وہی میرا میکا تھا' وہی میری سسرال تھی۔ شریف زادیوں کی ڈولیاں میکے سے اٹھتی ہیں اور جنازہ سسرال سے۔ یعنی وہ بُرے سے بُرے حالات میں بھی شوہر کی وفادار رہ کر سسرال میں ہی آخری سانسیں پوری کرتی ہیں۔ میں بھی اپنی سپر اسٹار بیوی کے پیچھے کھڑے رہ کر اسے آئینے میں بنتے سنورتے دیکھ کر اسے ہاتھ لگانے کی تمنا لئے ایک دن دم توڑنے والا تھا۔

میں نے ایک حد تک برداشت کیا۔ پھر ایک دن اسے نئے روپ میں دیکھ کر بے اختیار اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑا کر الگ ہوئی۔ پھر غصے سے بولی۔ "تم نے میری اجازت کے بغیر مجھے چھونے کی جرأت کیسے کی؟ میں ان لمحات میں لاکھوں روپے کمانے والی سپر اسٹار ہوں۔ تمہارے جیسے ادنیٰ ملازم کی بیوی نہیں ہوں۔ چلو جاؤ یہاں سے۔ دوسرے کمرے میں جاؤ۔ جلدی کرو۔ نکلو یہاں سے۔"

میں نے بے بسی سے احتجاج کیا۔ "تم میرے صبر کا امتحان لے رہی ہو۔ کیا تمہیں احساس ہے کہ میں تمہیں دیکھ دیکھ کر دور سے ترستا رہتا ہوں۔"

"میں کہتی ہوں بکواس مت کرو۔ آؤٹ ڈور شوٹنگ میں جانے کے لئے دیر ہو رہی ہے۔ دروازہ کھولو اور اُس کمرے میں جاؤ۔"

اس نے مجھے دونوں ہاتھوں سے دھکا دیا۔ میں سر جھکا کر دروازہ کھول کر دوسری طرف والے کمرے میں آ گیا۔ اس نے دروازے کو بند کر کے باہر سے چٹخنی چڑھا دی اور

آئینوں کے سامنے جا کر اطمینان سے بننے سنورنے لگی۔

پھر اس نے یہ معمول بنالیا۔ جب آؤٹ ڈور پر جانے کے لئے گھر میں میک اپ کرنا ہوتا تو اس سے پہلے مجھے پاس والے کمرے میں بند کر دیتی مگر کھڑکی کھلی رکھتی تھی۔ اس کھڑکی کی جالیوں سے لگ کر میں ایک قیدی کی طرح دور سے اس کے حُسن کا نظارہ کرتا تھا۔ وہ سہ طرفہ آئینوں میں تین مختلف زاویوں سے اپنا جلوہ دکھاتی تھی۔ مکالمے یاد کرتے وقت ان مکالموں کی مناسبت سے یوں مسکراتی جیسے پاس آنے کی دعوت دے رہی ہو۔ یا بھرپور انگڑائی لیتے ہوئے مکالمے کو ادھورا چھوڑ دیتی۔ اس ادھورے مکالمے کو انگڑائی کی اٹھان پورا کر دیتی تھی۔

حُسن کے ایسے کلائمکس پر مُردے بھی اٹھ کر بیٹھ جائیں' میں تو زندہ ہوں۔ ایک دن برداشت نہ ہو سکا۔ میں ایک کرسی اٹھا کر بند دروازے کے پاس آیا۔ دروازے کے پاس ایک روشن دان تھا۔ میں نے کرسی پر چڑھ کر روشندان کے پار ہاتھ لے جا کر باہر کی چٹخنی کو نیچے کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی دروازہ کھل گیا۔ میرے اندر بڑے طوفان تھے۔ پتا نہیں میں کیا کر بیٹھتا۔ مگر افسوس طوفان کا رخ بدل گیا۔ اسی وقت ایک ملازم نے آ کر کہا۔

"میڈم! فلمی یونٹ کے لوگ آ گئے ہیں۔"

وہ مجھے گھور کر دیکھ رہی تھی۔ میرے یوں دروازہ کھول کر آنے کے بعد کچھ تشویش میں مبتلا ہو گئی تھی۔ مگر اس نے غصہ نہیں دکھایا۔ سرد لہجے میں بولی۔ "میک اپ بکس اور لباس لے آؤ۔"

یہ کہہ کر وہ کمرے سے چلی گئی۔ اس روز لاہور سے کوئی تیس کلو میٹر دور ایک پرانی سی حویلی کے اطراف میں شوٹنگ تھی۔ وہاں ایک ایسا سین بھی پکچرائز کیا گیا جس میں انسپکٹر فلم کے ولن سے فائٹ کرتا ہے اور اسے ہتھکڑی پہناتا ہے۔ وہ بھی اس سین میں تھی۔ شوٹنگ جب پیک اپ ہو گئی تو اس نے فلمساز سے کہا۔ "مجھے وہ ہتھکڑی چاہئے' جو ولن کو پہنائی گئی تھی۔"

فلمساز نے پوچھا۔ "میڈم! آپ ہتھکڑی کا کیا کریں گی؟"

"مجھے ضرورت ہے اس لئے مانگ رہی ہوں۔ ایسی چیزیں لنڈے بازار میں بہت ملتی ہیں۔ آپ نہیں دیں گے تو وہاں سے منگوا لوں گی۔"

"سوری میڈم! آپ تو ناراض ہو گئیں۔ یہ ہتھکڑی کیا چیز ہے۔ آپ کے لئے جان بھی حاضر ہے۔"

وہ ہتھکڑی لے آئی۔ دوسرے دن میک اپ کرنے سے پہلے اس نے مجھ سے کہا۔

"کمرے میں چلو اور ہتھکڑی پہنو۔"

میں نے احتجاج کیا۔ "یہ کیا حرکت ہے۔ کیا میں کوئی مجرم ہوں۔ تم مجھ سے بہت بدتر سلوک کرنے لگی ہو۔ میں ہتھکڑی نہیں پہنوں گا۔"

"نہیں پہنو گے تو کوٹھی سے نکال دوں گی۔ کیا اس پٹھان ڈرائیور کو بلاؤں؟ وہ تمہیں اٹھا کر باہر پھینک دے گا۔"

آہ! کاش میرا کوئی میکا ہوتا' میں وہاں جا کر بیٹھ جاتا۔ پھر وہ مجھے منانے کے لئے وہاں جاتی اور اپنے ساتھ یہاں لے آتی۔ میں کسی تابعدار کی طرح سر جھکائے ساتھ والے کمرے میں آیا۔ اس نے کھڑکی کی جالی کے باہر سے ہتھکڑی لا کر میری دونوں کلائیوں میں پہنا دی۔ اس روز دروازہ کھلا چھوڑ دیا کیونکہ میں کھڑکی سے الگ نہیں ہو سکتا تھا۔

یہ تو ایک مرد کے لئے بڑے شرم کی بات ہے کہ ایک عورت اسے یوں قیدی بنا کر رکھے اور مرد بھی قیدی بننے پر راضی رہے۔ مجھے بھی شرم آتی تھی۔ غصہ بھی آتا تھا ایسے میں ہولسٹر سے ریوالور نکال کر اسے گولی مار سکتا تھا لیکن وہ جانتی تھی کہ میں ایسا نہیں کروں گا۔ کیونکہ ہم دونوں ایک دوسرے کی ضرورت تھے۔ ہماری کچھ مجبوریاں تھیں۔ کچھ سمجھوتے تھے جن کا ذکر میں آگے کروں گا۔ اب سے پہلے اس نے مجھے دو بار کوٹھی سے نکال دیا تھا۔ بعد میں خود ہی واپس آ گیا تھا۔ وہ بھی بظاہر مجھ سے نفرت کرتی تھی مگر میرے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔

ہمیشہ آؤٹ ڈور شوٹنگ نہیں ہوتی تھی۔ مگر جب بھی ہوتی تھی' وہ مجھے ہتھکڑی پہنا دیتی تھی۔ اس نے کہہ دیا تھا کہ مجھے اس کے ساتھ آؤٹ ڈور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ صبح جایا کرے گی پھر شام کو آ کر ہتھکڑی کھول دیا کرے گی۔

میں نے کہا۔ "کیا غضب کرتی ہو۔ تمہاری غیر موجودگی میں یہاں کوئی حادثہ پیش آ جائے یا کسی طرح آگ لگ جائے تو میں زندہ جل کر مر جاؤں گا۔"

اس نے کہا۔ "ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا' آئندہ بھی نہیں ہو گا۔"

"دیکھو' تم میری محبت کی قدر نہیں کر رہی ہو۔ میں محبت سے مجبور ہو کر تمہارے پاس آنے کی کوششیں کرتا رہتا ہوں۔"

"اگر تم محبت سے آتے تو مجھے خوشی ہوتی مگر تم ہوس سے مغلوب ہو کر آتے ہو' میں تمہیں آزاد نہیں چھوڑوں گی۔"

اس نے ایک دن میری بحث کو برداشت کیا۔ پھر دوسرے دن میرے منہ پر ٹیپ چپکا دیا۔ یوں میری آواز بھی بند کر دی۔ اس دن سے اس نے میری پشت کھڑکی طرف کی' پیچھے کمر کی طرف میرے دونوں ہاتھ لے جا کر جالی کے ساتھ ہتھکڑی لگائی۔ اس عمل کے نتیجے میں' میں اپنا منہ ہاتھوں کی طرف لے جا کر چپکا ہوا ٹیپ نہیں ہٹا سکتا تھا۔

جب بھی آؤٹ ڈور شوٹنگ ہوتی۔ میرے ساتھ یہی سلوک ہوتا۔ وہ صبح نو دس بجے جاتی تھی پھر شام کو آ کر آئینوں کے سامنے میک اپ اور وگ وغیرہ اتار کر لباس تبدیل کرتی تھی۔ پھر دوسرے کمرے کے باہر ہی سے ہتھکڑی کھول دیتی تھی۔

ایسے وقت میں اس کا طالب نہیں رہتا تھا۔ کیونکہ میک اپ اور گٹ اپ اترنے کے بعد وہ روپ بدل جاتا تھا۔ وہ پھر بیوی دکھائی دیتی تھی اور بیوی تو سیکنڈ ہینڈ ہوتی ہے۔ دیوار گیر گھڑی ہوتی ہے۔ دور سے دیکھی جاتی ہے۔ اسے کلائی پر نہیں باندھا جاتا۔

یہ سلسلہ کچھ روز تک چلتا رہا۔ ایک شام اسے واپسی میں دیر ہو گئی۔ رات کے آٹھ بجے آئی۔ کمرے کی لائٹس آن کر کے بولی۔ "مجھے افسوس ہے کہ دیر ہو گئی۔ کل شوٹ ہونے والے سین پر ڈسکس ہو رہی تھی۔ میں ابھی تمہیں کھولتی ہوں۔"

اس نے آئینوں کے سامنے آ کر زیورات اور وگ اتار دی۔ چہرے کا میک اپ صاف کیا۔ پھر قمیض کی زپ نیچے سرکا کر لباس اتارنے لگی۔ جب میں سر گھما کر دیکھتا تو وہ نظر آتی تھی۔ اس نے قمیض اتاری۔ اسی وقت بجلی چلی گئی۔ چند لمحوں کے لئے گھپ اندھیرا چھا گیا۔ پھر دور سے اسٹریٹ لیمپ کی روشنی بالکونی سے گزرتی ہوئی آئی۔ اس روشنی سے کمرہ روشن نہیں ہوا لیکن وہ ایک سائے کی طرح دکھائی دینے لگی۔

میں نے اور ذرا سا سر گھمایا تو چونک گیا۔ ایک سایہ باہر سے بالکونی میں آیا تھا۔ میں سپر اسٹار بیوی کو خطرے سے آگاہ کرنے کے لئے بند منہ اور کھلی ناک سے "اُوں اُوں" کی آوازیں نکالنے لگا۔ بندھے ہوئے ہاتھوں کو جھٹکے دینے لگا۔ ہتھکڑی کھڑکی کی جالیوں سے ٹکرا کر بجنے لگی۔ وہ بیزار ہو کر بولی۔ "ذرا صبر کرو۔ ابھی کھولتی ہوں۔ دیکھتے نہیں بجلی چلی گئی ہے۔"

بجلی نہیں گئی تھی۔ کسی نے مین سوئچ آف کیا تھا۔ شاید وہی سوئچ آف کرنے والا بالکونی میں آیا تھا اور اب دبے قدموں اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں پھر "اُوں اُوں" کی آوازیں نکالتا ہوا ہاتھوں کے جھٹکوں سے ہتھکڑی اور آہنی جالی کو بجانے لگا۔

وہ بولی۔ "توبہ ہے' تم نے تو پریشان کر دیا ہے۔ ٹھہرو چارجر لائٹ لے کر آتی ہوں۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی وہ اس کے پیچھے بالکل قریب پہنچ گیا تھا۔ پھر اس نے ایک ہاتھ سے اس کی زلفوں کو مٹھی میں جکڑ کر ایک جھٹکا دیا اور دوسرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کی نال اس کی کمر سے لگا دی۔ اس کے بعد وہ غراتی ہوئی آواز میں بولا۔

"خبردار! چیخنے یا کسی کو بلانے کی حماقت کرو گی تو گولی مار دوں گا.........."

میں نے اس سے کہا بھی تھا کہ مجھے یوں قید نہ کرو کوئی بھی حادثہ پیش آ سکتا ہے مگر وہ نہیں مانتی تھی۔ میری بات کو اس گڈریے کا جھوٹ سمجھتی تھی' جو خواہ مخواہ چلایا کرتا تھا کہ شیر آیا' شیر آیا' شیر آیا..........

گڈریے کا جھوٹ ایک دن سچ ہوا۔

میں بھی سچا نکلا۔ میری سپر اسٹار بیوی کی خواب گاہ میں شیر آ گیا تھا۔

☆======☆======☆

میں فلم اسٹوڈیو کا ایک لائٹ مین ہوں۔ میں جب تک لائٹ آن نہ کروں تب تک کیمرہ آن نہیں ہو سکتا۔ کسی ہیرو اور ہیروئن کا چہرہ روشن نہیں ہو سکتا۔ تاریکی میں چھپے ہوئے حسن کو جلوہ نمائی حاصل نہیں ہوتی۔ میں بے بی لائٹ کی مدھم روشنی سے لے کر سولر اور پنجہ لائٹ کی تیز روشنیوں سے پوری فلم انڈسٹری کے کاروبار کو چمکا دیتا ہوں۔

چراغ تلے اندھیرا ہوتا ہے۔ میں بھی بڑی بڑی لائٹس کے پیچھے اندھیرے میں رہ کر دوسروں کو روشن رکھتا ہوں۔ صرف کیمرہ مین اور ہدایت کار میری صلاحیتوں کو سراہتے ہیں ورنہ ساری دنیا روشنی میں رہ کر بھی لائٹ مین کی اہمیت کو نہیں سمجھ پاتی۔ ہم اندھیرے میں رہ کر دیکھتے ہیں کہ کیمرے کے سامنے کیسے کیسے بے حیا سین فلمائے جاتے ہیں۔ بعض اوقات ایسے شرمناک مناظر پکچرائز کئے جاتے ہیں' جو سنسر بورڈ کے سامنے پیش نہیں کئے جاتے۔ البتہ بڑی رازداری سے سینما ہال میں لے جا کر متعلقہ فلموں سے وہ مناظر جوڑ دیئے جاتے ہیں یا پھر ڈائریکٹر اور پروڈیوسر اپنی نجی محفلوں میں ایسے مناظر دیکھ دیکھ کر شراب پیتے ہیں اور خوب انجوائے کرتے ہیں۔

ان دنوں میں کنوارا تھا۔ انڈسٹری میں آنے والی لڑکیوں کو پھانسنے کی کوشش کرتا تھا مگر جو آتی تھیں' وہ پہلے ہدایت کار' فلمساز' کیمرہ مین اور دوسرے اسسٹنٹ وغیرہ کے سامنے' پاس یا فیل ہونے کے بعد میرے پاس پہنچتی تھیں۔ یہ سوچ کر بڑا غصہ آتا تھا کہ مجھے کچرا ہی ملا کرتا ہے۔ وہ حیا سوز مناظر میں کردار ادا کرنے والی حسینائیں میرے لئے خواب ہو جاتی تھیں۔ میں

صرف لائٹ کے پیچھے اندھیرے میں رہ کر انہیں دور سے دیکھ پاتا تھا۔ شاید میں اس پہلو سے ایب نارمل ہو گیا تھا کہ دور کا جلوہ مجھے تڑپاتا تھا۔ اس سلسلے میں ایک سپر اسٹار بیوی کا ذکر کر چکا ہوں کہ وہ کس طرح مجھے قیدی بنا کر دور ہی سے تڑپاتی تھی اور مجھے جنون میں مبتلا کرتی تھی۔

یہ جنون یا ذہنی مرض مجھے ان روشنیوں سے ملا تھا' جن کے پیچھے تاریکیوں میں میری پرورش ہوئی تھی۔ ایک رات میں شوٹنگ کے بعد گھر لوٹ رہا تھا۔ شاہ نور اسٹوڈیو سے میرا گھر زیادہ دور نہیں تھا۔ میں پیدل جاتا آتا تھا۔ ملتان روڈ پر رات گئے تک خاصی گاڑیاں چلتی رہتی ہیں۔ اس روز صبح ہی سے مری کی سرد ہوائیں چل رہی تھیں۔ سردی کے باعث لوگ گھروں سے نہیں نکل رہے تھے۔ اس لئے دور تک ویرانی اور سناٹا سا چھایا ہوا تھا۔ آسمان پر پورا چاند پوری آب و تاب سے روشن تھا۔ اس کی چاندنی اونچے درختوں کے پتوں سے چھن چھن کر سڑک پر دھبوں کی طرح پڑ رہی تھی۔

میں اسٹوڈیو سے دو سو گز تک چل کر آیا۔ پھر ٹھٹک گیا۔ کسی کے سسکنے کی آواز آ رہی تھی۔ کوئی رو رہی تھی۔ پہلا خیال یہی آیا کہ کوئی اس پر ظلم کر رہا ہے۔ میں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ ایک بوڑھے درخت کے موٹے تنے کے پیچھے کسی کی سفید چادر ہوا میں لہرا رہی تھی۔ میں نے ایک طرف ہو کر دیکھا۔ چھن کر آنے والی چاندنی میں اندازہ ہوا کہ وہ سمٹی اور سکڑی بیٹھی ہوئی ہے اور اس کے ساتھ کوئی نہیں ہے۔

ایک لڑکی اور رات کے سناٹے میں اکیلی؟ میں نے پوچھا۔ "تم کون ہو؟"

اس نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ میں ذرا سا سہم گیا۔ دادی اور نانی نے بچپن میں چڑیلوں کی جو کہانیاں سنائی تھیں' وہ یاد آنے لگیں۔ انہوں نے بتایا تھا کہ کسی چڑیل نے میرے ابا کو اور کسی چڑیل نے میرے چاچا یا ماموں کو کس طرح پریشان کیا تھا اور ان پر حاوی ہو کر ان کی نیندیں حرام کر دی تھیں۔

جب چڑیلوں کی کہانیاں یاد آئیں تو وہ کلمے' آیت الکرسی اور درود شریف بھی یاد آنے لگے جو کبھی بچپن میں ازبر کئے تھے۔ پھر بچپن کے گم ہوتے ہی ان قرآنی آیات کو بھی ماضی کا ایک حصہ سمجھ کر نظرانداز کر دیا تھا۔ اس وقت پتا نہیں آیت الکرسی پڑھ رہا تھا یا نہیں۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ خوف کے وقت خدا اور اس کا کلام کسی حد تک یاد آ جاتا ہے اور شکر ہے کہ ایسی نصف یادداشت نے ہمیں مسلمان بنائے رکھا ہے۔

میں نے حوصلہ کر کے پھر پوچھا۔ "کون ہو تم؟ وہاں کیوں بیٹھی ہو؟ کیا اکیلی ہو؟"

کسی صنف نازک کے اکیلی ہونے کے خیال سے دل جذباتی انداز میں دھڑکنے لگتا ہے۔

بشرطیکہ وہ چڑیل نہ ہو۔

دھیمی دھیمی سی سرسراہٹ ہوئی' جیسے سفید چادر اور بدن کا لباس درخت کے تنے سے لگ کر ایک ساتھ اٹھ رہے ہوں۔ پھر وہ درخت کے پیچھے سے روبرو آ گئی۔ ایسا کوئی فلمی سین ہو۔ ہیروئن پہلی بار اسکرین پر آنے والی ہو تو مجھ سے کہا جاتا ہے کہ ایسی لائٹنگ کرو کہ روشنی اور سائے کے درمیان آنے والی تجسس پیدا کرے۔ روشنی پیچھے ہو اور سایہ سامنے ہو تو "صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں" کے مصداق وہ جلوہ نما ہونے والی دل کی دھڑکنیں تیز کر دے۔

اس وقت بھی چاند کی قدرتی لائٹ اس کے پیچھے تھی اور سامنے سایہ سا تھا۔ اس لئے واضح طور پر نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ سہمے ہوئے انداز میں بولی۔ "مم' میں ناجی ہوں۔"

اس کے خوفزدہ ہونے سے مجھے حوصلہ ملا۔ یاد آ گیا کہ میں مرد ہوں اور ایسے حالات میں ایک لڑکی کے سامنے مردانگی دکھانے کا لطف ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ میں نے ذرا کڑک لہجے میں پوچھا۔ "کہاں سے آئی ہو؟ یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"وہ' وہ جی' میں دور ایک پنڈ سے آئی ہوں مگر پنڈ کا نام نہیں بتاؤں گی۔"

"کیوں نہیں بتاؤ گی؟"

"وہ جی میں فلموں میں کام کرنے آئی ہوں۔"

"اچھا تو گھر سے بھاگ کر آئی ہو۔ مگر یہاں کون سا اسٹوڈیو ہے؟"

"پتا نہیں جی' بس ادھر خراب ہو گئی تھی۔ کنڈکٹر نے ادھر ساری سواریاں اتار دیں۔ میں نے پوچھا تو اس نے بتایا کہ شاہ نور اسٹوڈیو یہاں سے قریب ہے۔"

میرے لئے وہ کوئی پہلی لڑکی نہیں تھی' ایسی کئی لڑکیاں گھروں سے بھاگ کر آتی ہیں یا کسی کے عشق میں دھوکا کھا کر عیاشوں کے ہتھے چڑھ جاتی ہیں۔ ایسی لڑکیوں کو "مال" کہتے ہیں اور مالِ مفت کو دلِ بے رحم کی طرح فوراً ہی بے رحمی سے استعمال کرنے کے منصوبے بنا لیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ واپسی کے قابل نہیں رہتیں۔ ان پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ آگے اور آگے بڑھنے اور ہیروئن بننے کے لئے عزت کو بالائے طاق رکھ کر اسٹوڈیو کے حقیر ملازم سے لے کر مالدار پروڈیوسر تک خوش کرنا پڑتا ہے۔

میں نے کہا۔ "بڑی خوش نصیب ہو کہ مجھ سے ملاقات ہو گئی۔ میں شاہ نور اسٹوڈیو کا ہیڈ لائٹ مین ہوں۔ یوں سمجھو کہ اسٹوڈیو کا آدھا مالک ہوں۔ یہ جو انجمن اور بابرا شریف وغیرہ ہیں' ان سب کو پہلی بار میں نے ہی فلموں میں چانس دلایا ہے۔"

انجمن اور بابرا شریف مجھے صرف اسی حد تک جانتی تھیں کہ کبھی کبھی میرے کام سے خوش ہو کر مجھ دو چار سو روپے انعام کے طور پر دے دیا کرتی تھیں۔ میں نے ناجی کے سامنے اتنے بڑے بڑے نام اور اتنے بڑے دعوے کئے تھے کہ وہ میرے ساتھ چلتے ہوئے التجائیں کرنے لگی کہ اسے بھی میں اسی لمحے لے جاکر سپر اسٹار بنا دوں۔ وہ ساری زندگی میرا احسان نہیں بھولے گی۔

میں نے کہا۔ ”میں احسان نہیں کرتا‘ نیکی کرتا ہوں اور دریا میں ڈال دیتا ہوں۔ تمہیں بھی ڈال آؤں گا لیکن اتنی رات کو اسٹوڈیو بند ہو چکا ہے۔ آج کی رات گزار لو‘ کل کام ہو جائے گا۔“

”میں رات کہاں گزاروں گی۔ یہاں میرا کوئی نہیں ہے۔“

”مجھے پتا ہے گھر سے بھاگ کر آئی ہو۔ یہاں تمہارا کوئی نہیں ہے۔ اوپر خدا ہے نیچے میں ہوں۔“

میں اسے اسٹوڈیو کے پیچھے لے آیا۔ وہاں اکثر خانہ بدوشوں کا ڈیرا لگا رہتا تھا۔ ان کی عورتیں اور مرد بھی اسٹوڈیو والوں کے ذریعے روزی روٹی حاصل کرتے تھے۔ خانہ بدوشوں کا ایک گروہ کبھی کچھ عرصہ ڈیرہ جمانے کے بعد وہاں سے چلا جاتا تھا اس کے بعد دوسرا گروہ آ جاتا تھا۔ ان کی عورتوں‘ مردوں اور بچوں کو ایکسٹرا کا رول ملتا رہتا تھا اس طرح ہم ان کے کام آتے تھے اور وہ ہمارے کام آتے رہتے تھے۔

میں نے ان کے خیموں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”وہ خانہ بدوش ہیں۔ ہمارے احسانات کے بوجھ تلے دبے رہتے ہیں۔ اس لئے ہماری عزت کرتے ہیں۔ ہماری کسی امانت میں خیانت نہیں کرتے۔ ہم جو چیز ان کے پاس رکھ کر جاتے ہیں‘ وہ ہمیں اگلے روز اسی طرح واپس مل جاتی ہے۔ تمہیں بھی رات ان کے پاس رہنا ہو گا۔“

اس نے اچانک میرا بازو سختی سے پکڑ لیا۔ پھر پوچھا۔ ”مجھے یہاں چھوڑ کر جاؤ گے؟“

اس نے میرا بازو پکڑا تھا‘ اس کے ہاتھوں میں حرارت تھی۔ پتا نہیں بدن کا درجہ حرارت کیا ہو گا۔ میں نے اسے ایک بازو کے حصار میں لے لیا۔ جب وہ خود کہہ رہی تھی کہ اسے چھوڑ کر نہ جاؤں تو اس کا مطلب یہی نکلتا تھا کہ وہ مجھے اپنا سہارا سمجھتی ہے لیکن وہ ذرا کسمسانے لگی۔ میں نے اسے تھپکتے ہوئے کہا۔ ”فلموں کے مناظر میں صرف ہیرو ہی نہیں‘ ولن بھی لوٹ مار کے لئے گلے لگاتا رہتا ہے۔ تم ایسے سین نہیں کرو گی اور انکار کرو گی تو کوئی تمہیں ہیروئن یا سائیڈ ہیروئن کا چانس نہیں دے گا۔“

وہ چپ رہی اور مجھ سے لگی رہی۔ پتا نہیں تنہائی کے خوف سے یا ہیروئن بننے کی آرزو میں خاموشی سے سمجھوتا کر رہی تھی۔ یہ سمجھوتا میرے شوق کو ہوا دے رہا تھا۔ پھر میں نے خود ہی اسے الگ کر دیا۔ کوئی لالٹین لئے قریب آ رہا تھا۔ آنے والے نے لالٹین والا ہاتھ اونچا کیا۔ میرا چہرہ روشن ہو گیا۔ ناجی کا چہرہ چادر میں چھپا ہوا تھا۔

وہ آنے والا ایک خانہ بدوش تھا۔ سڑکوں پر بندر اور ریچھ کے تماشے دکھایا کرتا تھا۔ میں نے ہدایت کار سے سفارش کر کے ایک پنجابی فلم میں اس کے بندر اور ریچھ کا تماشا کرایا تھا۔ اسے معاوضے کے طور پر دو ہزار روپے ملے تھے۔ تب سے وہ مجھے بہت ماننے لگا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ کر تعجب سے پوچھا۔ ”جمن باؤ! تم اس ویلے؟“

میرا نام جمال الدین ہے۔ ایک لائٹ مین کو کوئی پورے نام سے نہیں پکارتا۔ بڑے آدمی اپنے شجرے اور کیفیت کے مطابق پورے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ کوئی مجھے جمن اور کوئی مجھے ابے او جمو کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ میں نے کہا۔ ”ہاں فضلو! میں ہوں۔ تم بہت دنوں سے اپنے ہاں مہمان بننے کو کہہ رہے تھے۔ اس لئے آج چلا آیا ہوں۔“

وہ خوش ہو کر بولا۔ ”ست بسم اللہ! آپ اجازت دیں تو ڈگڈگی بجا کر ابھی سب کو اکٹھا کر لوں۔“

”ایسا نہ کرو۔ سب کو آرام سے سونے دو۔ ہمیں اپنے خیمے میں رہنے کی جگہ دے دو اور تم کسی اور خیمے میں چلے جاؤ۔“

وہ ناجی کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔ ”لو جی یہ بھی کوئی سمجھانے کی گل ہے۔ آپ ایک منٹی صبر کریں۔ میں اپنی گھر والی کے ساتھ اس کی بہن کے خیمے میں چلا جاؤں گا۔“

تھوڑی دیر میں وہ اپنی بیوی کے ساتھ دوسری جگہ چلا گیا۔ ہمارے لئے خیمہ خالی کر دیا گیا تھا۔ میں ناجی کے ساتھ اندر آیا۔ خیمہ چھوٹا سا تھا۔ اندر جگہ تنگ تھی۔ ویسے ناجی کو تنگ کرنے کے لئے تنگ نہیں تھی۔ ایک طرف زمین پر میلا سا بستر بچھا ہوا تھا۔ وہاں تنہائی ملتے ہی ناجی نے چہرے پر سے چادر ہٹالی۔ میرا دل ایک دم سے دھڑکنے لگا۔ کیا روپ تھا‘ کیا رنگ تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ پانی سے نہیں‘ دودھ سے نہاتی ہے۔ نگاہوں کے سامنے دودھیا چاندنی سی پھیل گئی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ”صبح اسٹوڈیو لے چلو گے نا؟“

”آں؟“ میں نے چونک کر کہا۔ ”ہاں مگر فلم انڈسٹری میں صبح دوپہر کو ہوتی ہے اور دن رات کو نکلتا ہے۔ فکر نہ کرو۔ تمہارا کام ہو جائے گا۔“

وہ اپنے بدن سے چادر اتار کر بستر سے ذرا دور بچھانے لگی۔ چادر کیا اتری پردہ ہٹ گیا۔

اسے زمین پر جھک جھک کر بچھانے کے دوران وہ جتنے زاویوں سے نظر آئی' میں اتنے ہی زاویوں سے اس پر ہوس کی لائننگ دل ہی دل میں کرتا رہا۔ ایسے وقت کوئی مجھے آدھی شہنشاہی بھی دیتا اور کہتا کہ میں اسے چھوڑ کر راہِ مستقیم پر چلا جاؤں تو کبھی نہ جاتا۔ اسے دیکھ دیکھ کر انکشاف ہوتا رہا کہ آدمی شرافت کی جنت سے کیوں نکل آتا ہے؟

وہ بچھی ہوئی چادر پر بیٹھ کر بولی۔ "تم بہت اچھے ہو۔ اپنا گھر چھوڑ کر یہاں میرے لئے تکلیف اٹھا رہے ہو۔"

میں اس کی چادر پر قریب آکر بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بولا۔ "گھر کیا چیز ہے۔ تمہارے لئے دنیا چھوڑ سکتا ہوں۔"

اس نے ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لیا۔ میں نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟ محبت کرنے والے آسمان سے ستارے توڑ کر لانے کا دعویٰ کرتے ہیں اور میں تمہیں فلمی آسمان کا چمکتا دمکتا ستارہ بنانے والا ہوں۔ ہم دونوں ایک دوسرے پر مہربانی کریں گے۔ تب ہی بات بنے گی۔"

وہ ذرا پرے ہٹ کر بولی۔ "میں گھر سے بھاگ کر ضرور آئی ہوں۔ ماں باپ کو بھی چھوڑ کر آئی ہوں مگر شرم و حیا چھوڑ کر نہیں آئی۔ میں نے چادر اس لئے اتاری ہے کہ بچھانے کے لئے اور بستر نہیں ہے۔"

میں نے مسکرا کر کہا۔ "شرم اچھی چیز ہے۔ یہ لڑکی کے پاس ہو تو کوئی مرد اجازت کے بغیر اسے ہاتھ نہیں لگاتا لیکن فلمی دنیا میں اپنی مرضی نہیں چلتی۔ فلمساز' ہدایتکار' کیمرہ مین اور مجھ جیسے لائٹ مین کو خوش کرنا پڑتا ہے۔ میں اس فیلڈ میں پندرہ برس سے ہوں۔ میں نے ایسے کئی ہیرو اور ہیروئنوں کو رومانی اور جذباتی سین پکچرائز کراتے دیکھا ہے' جو سیٹ کے باہر ایک دوسرے کی صورت دیکھنا گوارا نہیں کرتے۔ یہاں اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق نہیں بلکہ سین اور حالات کے تقاضوں کے مطابق خود کو ڈھالنا پڑتا ہے۔"

"ٹھیک ہے فلم میں جیسا کام ہوگا' کرلوں گی۔ ابھی اُس بستر پر جاؤ۔"

مجھے اس پر غصہ آنے لگا۔ کچھ دیر پہلے مجھ سے چپکی جا رہی تھی۔ اب نخرے دکھا رہی تھی۔ یہ گھر سے بھاگ کر آنے والیاں پہلے بڑی پارسائی دکھاتی ہیں۔ انہیں راضی کرنے کے لئے بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ میں نے اس کی چادر پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "تم سو جاؤ' میں ذرا باہر سگریٹ لینے جا رہا ہوں۔"

وہ رونے کا منہ بنا کر بولی۔ "تم ناراض ہو گئے ہو۔ مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے۔ یہاں مجھے ڈر لگے گا۔ مجھے معاف کر دو۔ مجھے اسٹوڈیو پہنچا دو۔"

"ابھی اسٹوڈیوز میں شراب اور کباب کا دور کتنے ہی دفاتر میں چل رہا ہوگا۔ ان کے پاس جو کمی ہوگی' اسے تم جا کر پوری کر دو گی۔ میں تمہیں درندوں سے بچا کر لایا ہوں مگر یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔"

"تم بہت غصے میں بول رہے ہو۔ ضرور مجھے تنہا چھوڑ کر چلے جاؤ گے۔ میں پنڈ میں کسی سے نہیں ڈرتی تھی مگر یہاں ڈر لگ رہا ہے۔"

"عورت کا خوف ایک مرد ساتھی ہی دور کرتا ہے۔ تم سوچو میں ابھی آتا ہوں۔"

میں خیمے کی چادر ہٹا کر باہر آگیا۔ میں نے فلم نگری میں گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ کسی کے انکار کو اقرار میں بدلنے کے گُر جانتا ہوں۔ فضلو دوسرے خیمے میں جاگ رہا تھا۔ میں نے اسے بلا کر کہا۔ "دو سگریٹ دے اور میرا ایک کام کر دے۔"

"حکم کرو باؤ جی!"

"اپنا وہ تماشا دکھانے والا ریچھ لا کر خیمے کے پاس باندھ دے۔"

"سمجھ گیا باؤ جی! آپ سگریٹ لے جائیں۔ ابھی آپ کا کام ہو جائے گا۔"

وہ خانہ بدوش چرس بھری سگریٹ اور دیسی شراب چوری چھپے بیچتے تھے۔ جہاں جا کر ڈیرا ڈالتے تھے' وہاں کے تھانے والے ان کی سرپرستی کرتے تھے۔ میں نے ایک سگریٹ سلگائی' دوسری جیب میں رکھی پھر کش لگاتا ہوا اپنے خیمے کے پاس آیا۔ وہ میرے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی۔ میں چادر ہٹا کر اندر آیا تو ہرنی جیسی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں سے دیکھنے لگی۔

میں اسے نظرانداز کر کے میلے سے بستر پر آکر لیٹ گیا۔ سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگانے لگا۔ چرس دماغ پر سوار ہو رہی تھی اور ناجی تو پہلے ہی میرے اعصاب پر سوار تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہی خیمے کے باہر ریچھ کے چلانے کی آواز آئی۔ ناجی کا چہرہ خوف سے زرد پڑ گیا۔ وہ باہر کی طرف یوں دیکھنے لگی جیسے کچھ نظر آ رہا ہو۔ جبکہ خیمہ چاروں طرف سے بند تھا۔ باہر دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ ریچھ کی دوسری آواز پر وہ چادر پر بیٹھے بیٹھے کھسکتی ہوئی میرے قریب آئی۔ پھر خوف سے لرزتی ہوئی بولی۔ "یہ .... یہ کیسی آواز ہے؟"

میں نے بے رخی سے کہا۔ "ہوگا کوئی جنگلی جانور۔ ادھر اسٹوڈیو کے پیچھے جنگل جیسی ویرانی ہے۔ کبھی کبھی جنگلی جانور گزرتے رہتے ہیں۔"

ریچھ نے پھر آواز نکالی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ فضلو اسے چھیڑ رہا ہے۔ وہ سہم کر بولی۔ "مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"تو میں کیا کروں؟ کیا تمہارے لئے مفت میں رات بھر جاگتا رہوں؟"

وہ بُری طرح سہم کر اُدھر دیکھ رہی تھی جہاں پردہ پڑا ہوا تھا اور جہاں سے ہم خیمے میں داخل ہوئے تھے۔ ایسے ہی وقت وہاں کا پردہ ذرا سا ہٹا تو لالٹین کی دھیمی روشنی میں ریچھ کا بالوں بھرا کالا سر اور دو چمکتی ہوئی آنکھیں دکھائی دیں۔ وہ ایک دم سے چیخ مار کر اچھلی اور مجھ سے آکر لپٹ گئی۔

میں نے کہا۔ "دور ہٹو' تم تو شرم والی ہو۔ مجھ سے کیوں لپٹ رہی ہو؟"

"وہ .... وہ وہاں مم .... میں نے ایک ریچھ دیکھا ہے۔"

"تو پھر جاؤ۔ ریچھ سے لپٹ جاؤ۔ میں تو تمہاری نظروں میں بُرا آدمی ہوں۔"

اب ریچھ نظر نہیں آرہا تھا مگر وہ بُری طرح سہمی ہوئی تھی۔ اس لئے مجھے بُرا نہیں سمجھ رہی تھی۔ مجھ سے الگ نہیں ہو رہی تھی۔ ادھر کہیں سے ریچھ کی آواز آتی تو وہ اور چپک جاتی۔ مجھے سہولتیں فراہم کرنے پر مجبور ہو جاتی۔ بعض اوقات اسی طرح دوسرے کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھا کر اپنا مطالبہ منوا لیا جاتا ہے۔

رات گزرنے لگی۔ میں فاتحانہ انداز میں دوسری سگریٹ سلگا کر کش لگانے لگا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رو رہی تھی۔ فضلو بڑا گھاگ تھا۔ اس نے کام دکھا کر ریچھ کو ذرا دور لے جا کر باندھ دیا تھا۔ کبھی کبھی دور سے بھی اس کی غراہٹ سنائی دیتی تھی۔ اس لئے ناجی احتجاجاً رونے کے دوران بھی مجھ سے لگی ہوئی تھی۔

میں نے پیار سے کہا۔ "عورت ایسے وقت روتی ہے تو اور پُرکشش لگتی ہے۔ ویسے یہاں آنے سے پہلے اپنے آنسوؤں کو ماں باپ کی چوکھٹ پر چھوڑ کر آنا چاہئے تھا۔ کیا تم اتنی نادان ہو کہ حسن و شباب کا خزانہ کسی باڈی گارڈ کے بغیر لے کر آئی ہو اور سمجھ رہی ہو کہ راستے میں لٹیرے نہیں ملیں گے؟"

وہ سسکتی ہوئی بولی۔ "میں نادان نہیں ہوں۔ پنڈ والے کہتے تھے کہ میں آدھی مرد ہوں۔ لڑنے میں تیز ہوں' کسی سے ڈرتی نہیں ہوں۔ صرف تم ہوتے تو کبھی نہ ڈرتی۔ مگر ریچھ کو دیکھ کر جان نکل جاتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "پنڈ کے رہنے والے غریب کسان اور زمینداروں کی بیگاری کرنے والے مجبور اور معصوم لوگ ہوتے ہیں۔ وہ شہر والوں کی طرح ہیرا پھیری کرنا نہیں جانتے جو بڑے بڑے ہتھکنڈوں سے شیرنی کو چوہیا بنا دیتے ہیں۔"

وہ پھر سسک کر بولی۔ "ہاں تالاب سے نکلنے کے بعد مچھلی کو معلوم ہوتا ہے کہ سمندر کیا ہوتا ہے؟ اس سمندر میں اپنی ہستی گم ہو جاتی ہے۔ عورت دو کوڑی کی نہیں رہتی۔ اب میرا کیا

ہو گا؟ میں اپنی نظروں میں گر گئی ہوں۔"

"پہلے تم فیصلہ کرو' ہیروئن بننا چاہتی ہو یا گھر گرہستی پسند ہے۔ آج تو میں تم پر مرمٹا ہوں۔ گھر گرہستی چاہو گی تو تم سے شادی کر لوں گا۔"

"میری شرم اور میرے اندر کی عورت کہتی ہے کہ جس نے مجھے چھو لیا' مجھے اسی کی ہو کر رہنا چاہئے۔ مجھے اپنا بنا لو۔ مجھ سے شادی کر لو۔ مگر' مگر........."

"ہاں' بولو' رک کیوں گئیں؟"

"میں جب چھوٹی سی تھی اور فلمیں دیکھا کرتی تھی تب سے خود کو آئینے میں دیکھ دیکھ کر سوچتی تھی کہ میں بھی ضرور ہیروئن بنوں گی۔ پھر رسالوں میں پڑھتی تھی اور سنتی تھی کہ فلم کی ہیروئنیں بڑی بڑی کوٹھیوں میں رہتی ہیں اور لاکھوں روپے کماتی ہیں۔ میں نے لاکھوں تو کیا پانچ ہزار روپے بھی ایک ساتھ کبھی نہیں دیکھے۔"

"تو پھر دیکھ سکتی ہو۔ ہیروئن بن سکتی ہو لیکن فلم دیکھنے والے ہیروئن کے متعلق یہی پڑھنا اور سننا چاہتے ہیں کہ وہ کنواری ہے۔ کنواری نہ بھی ہو تو پروڈیوسر اور ڈائریکٹر اپنی فلموں کو سپرہٹ بنانے کے لئے پریس والوں کو یہی بیان دیتے ہیں کہ ان کی ہیروئنیں کنواری ہیں۔"

وہ چپ ہو کر سوچنے لگی۔ میں سگریٹ بجھا کر سوچنے لگا۔ "مقدر سے ایک ہیرا ہاتھ لگا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بیوی بننے والی شرافت اس کے اندر کمزور پڑ جائے اور لکھ پتی بننے والی ہیروئن کی آرزو غالب آ جائے۔"

میں تھوڑی دیر سوچنے کے بعد بولا۔ "ایک شرم والی کو ایک ہی شوہر کی بیوی بن کر رہنا چاہئے۔ اگر تم میری بیوی بن کر رہو گی تو میں تمہیں ہیروئن بھی بنا دوں گا۔"

اس نے سر اٹھا کر مجھے پُرامید نظروں سے دیکھا۔ مگر بجھے ہوئے انداز میں کہا۔ "ابھی تم کہہ رہے تھے کہ ہیروئن کو کنواری رہنا چاہئے۔"

"ہاں دنیا کی نظروں میں کنواری رہنا چاہئے اور گھر کی چاردیواری میں بیوی بن کر۔ ہماری دنیا میں لوگ کہتے کچھ ہیں' کرتے کچھ ہیں۔ ہیروئنیں ہوتی کچھ ہیں' دکھاتی کچھ ہیں۔ سینما کے پردے کے پیچھے ان کے شوہر اور بچے دکھائی نہیں دیتے۔"

"یعنی تم مجھ سے شادی کرو گے مگر کسی پر ظاہر نہیں کرو گے؟"

"اگر ہیروئن بننا چاہو گی تو یہی طریقہ اختیار کرنا ہو گا۔"

وہ پھر سوچنے لگی۔ بچپن سے لے کر اب تک کے تمام خوابوں کی یلغار ہو رہی تھی۔ قیمتی کاریں' شاندار کوٹھیاں اور لاکھوں کا بینک بیلنس وغیرہ ایک لائٹ مین کی بیوی کو نہیں' صرف

ایک کنواری ہیروئن کو نصیب ہو سکتے تھے۔

کم سے کم وقت میں دولت مند بننے اور ملک گیر شہرت حاصل کرنے کا شارٹ کٹ راستہ یہی تھا کہ جھوٹ بولا جائے۔ جب لوگ ہیروئن کی پڑیا بیچ کر دولت مند بن سکتے ہیں تو وہ ہیروئن بننے کے لئے جھوٹ کی پڑیا کیوں نہیں بیچ سکتی؟ وہ راضی ہو گئی۔

اس نے پوچھا۔ "کل مجھے اسٹوڈیو لے چلو گے؟"

"کل نہیں' پرسوں' کل یہاں ہمارا نکاح پڑھایا جائے گا۔ پرسوں تمہیں ایک ڈائریکٹر کے پاس لے جاؤں گا۔"

"تمہارا گھر کہاں ہے؟"

"میرا گھر ہے نہ گرہستی اور نہ کوئی سگا رشتے دار ہے۔ ایک چھوٹے سے مکان میں دو دوستوں کے ساتھ رہتا ہوں اور ان کے ساتھ مل کر مکان کا کرایہ ادا کرتا ہوں۔ میرا کھانا فلموں کی شوٹنگ کے دوران مفت میں ہوتا ہے۔ کبھی کبھی ہوٹلوں میں کھاتا ہوں۔ اس طرح میں نے خوب رقم بچائی ہے۔ میرے پاس تقریباً تیس ہزار روپے ہیں۔ میں کل ہی تمہارے لئے ایک کرائے کا مکان تلاش کروں گا۔"

ہم بڑی دیر تک مستقبل کے منصوبے بناتے رہے پھر سو گئے۔ دوسری صبح میں نے فضلو اور دوسرے خانہ بدوشوں سے کہا۔ "ہم آج شام کو اسی خیمے میں نکاح پڑھوائیں گے اور تم سب ہماری شادی میں شریک رہو گے۔"

وہ سب خوشی کا اظہار کرنے لگے۔ میں نے فضلو کو ایک ہزار روپے دیئے۔ وہ خانہ بدوش تعداد میں کوئی پچیس تیس تھے اور ان کے بچے تھے۔ ایک ہزار میں سب مل کر مرغ بریانی کھا سکتے تھے۔ میں نے ایک مسجد میں جا کر ایک قاضی صاحب سے ملاقات کی۔ ان کے سامنے اپنا عندیہ بیان کیا۔ انہوں نے پوچھا۔ "نکاح پڑھانے کے لئے کہاں جانا ہو گا؟"

میں نے کہا۔ "فلم اسٹوڈیو کے پیچھے خانہ بدوشوں کے خیمے ہیں۔ اسی ایک خیمے میں شادی ہو گی۔"

"مجھے افسوس ہے' میں نکاح نہیں پڑھاؤں گا۔"

میں نے تعجب سے پوچھا۔ "آپ انکار کیوں کر رہے ہیں؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "یہ خانہ بدوش جرائم میں ملوث رہتے ہیں۔ تم خانہ بدوش نہیں لگتے۔ کیا لڑکی ان کے قبیلے سے ہے؟"

"جی نہیں۔ اس کا تعلق ایک شریف خاندان سے ہے۔"

"کیا اس کے شریف والدین اور بزرگ نکاح میں شریک ہوں گے؟"

میں ناجی کے والدین کے بارے میں جھوٹ کہہ سکتا تھا۔ خانہ بدوشوں میں سے کسی عورت کو اور مرد کو اس کے ماں باپ بنا کر پیش کر سکتا تھا لیکن وہ خانہ بدوش سانولے اور میلے میلے سے تھے اور ناجی گوری گوری گلابی گلابی سی تھی۔ اس کے چہرے کے دل فریب نقوش' گفتگو کا انداز اور ظاہری شخصیت ایسی تھی کہ کوئی اسے کسی خانہ بدوش کی بیٹی تسلیم نہ کرتا۔

میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "لڑکی کے والدین نہیں ہیں۔ مگر وہ بالغ ہے اور اپنی مرضی سے شادی کرنا چاہتی ہے۔"

"دیکھو برخوردار! میں کسی پولیس کیس میں پڑنا نہیں چاہتا۔ لہٰذا اپنا شبہ دور کرنے کے لئے علاقہ کے تھانہ انچارج کو ساتھ لے کر نکاح پڑھنے جاؤں گا۔"

میں گھبرا گیا۔ قاضی صاحب سے باتیں بنا کر' ان سے جان چھڑا کر وہاں سے چلا آیا۔ اس کے بعد دو اور قاضی صاحبان کے پاس گیا۔ وہاں بھی لڑکی کے والدین وغیرہ کے متعلق سوالات کئے گئے۔ جب پتا چلا کہ وہ لاوارث ہے تو یہی شبہ ہوا کہ اسے کہیں سے بھگا کر لایا گیا ہے۔ لہٰذا انہوں نے بھی نکاح پڑھانے سے انکار کر دیا۔

ناجی سے ہر حال میں نکاح پڑھوانا لازمی تھا۔ وہ سونے کی چڑیا بننے والی تھی۔ دولت اور شہرت کی بلندیوں پر پہنچ کر مجھے ٹھکرا سکتی تھی۔ اسے نکاح کے پنجرے میں بند رکھنا نہایت ضروری تھا تاکہ کبھی وہ بغاوت کرے تو اسے بلیک میل کرنے کے لئے نکاح نامہ دکھا کر دھمکی دی جا سکے کہ یہ بات پریس والوں تک پہنچے گی تو پھر وہ کنواری ہیروئن نہیں کہلائے گی۔ پھر اسے شادی شدہ ہیروئنوں کی طرح کم سے کم فلمیں ملیں گی اور معاوضہ بھی لاکھوں سے گر کر ہزاروں میں آ جائے گا۔

جب سیدھا راستہ نہیں ملتا تو چور راستہ ملتا ہے۔ جیب سے بڑے بڑے نوٹ نکالنے سے کیا نہیں ہو سکتا؟ ایک لالچی قاضی صاحب مل گئے۔ نکاح پڑھانے کی سرکاری فیس کوئی سو یا دو سو روپے ہو گی۔ انہوں نے دو ہزار روپے کا مطالبہ کیا۔ میں نے رقم کچھ کم کرنے کو کہا۔ وہ راضی نہیں ہوئے۔ مجھے ہی راضی ہونا پڑا۔

بہرحال شام کو ہمارا نکاح پڑھا دیا گیا۔ میں نے اس معاملے میں کسی دوست اور فلموں سے تعلق رکھنے والے کسی ساتھی کو رازدار نہیں بنایا۔ صرف وہ خانہ بدوش شادی میں شریک رہے۔ میں وہ دن بڑی مصروفیات میں گزارنے کے دوران کرائے کا مکان بھی تلاش کرتا رہا تھا۔ ایک مکان دوسرے دن ملنے والا تھا۔

ہم نے اسی خیمے میں سہاگ رات منائی۔ دوسری صبح میں دیر تک سوتا رہا۔ ناجی نے گیارہ بجے دن کو جھنجھوڑ کر اٹھایا پھر پوچھا۔ "کیا اسٹوڈیو نہیں لے چلو گے؟"

میں نے کہا۔ "پہلے ہم ایک مکان میں منتقل ہو جائیں گے پھر میں کسی ڈائریکٹر کے پاس تمہیں لے چلوں گا۔"

شام سے پہلے ہی مکان مل گیا۔ میں نے گھر گرہستی کا کچھ ضروری سامان خریدا پھر ناجی کو اس مکان میں لے آیا۔ اس سے بولا۔ "خوب اچھی طرح غسل کرو اور کچھ پکا کر رکھو۔ میں دو چار ہدایت کاروں اور فلم سازوں سے تمہاری بات کر کے آؤں گا۔ تمہارا یہ پنڈ والا لباس نہیں چلے گا۔ کل بازار سے ہم دو اچھے اور مہنگے ریڈی میڈ سوٹ خریدیں گے۔ کچھ میک اپ کا سامان بھی ضروری ہے۔ تقدیر مہربان ہوئی تو کل ہی ہمارا کام بن جائے گا۔"

میں اسے مکان میں چھوڑ کر لکشمی چوک آیا۔ پوری انڈسٹری کے ڈائریکٹر اور پروڈیوسر مجھے اچھی طرح پہچانتے تھے۔ ہدایت کار چن شاہ ایک نئی فلم شروع کر رہا تھا۔ میں نے اس کے دفتر میں پہنچ کر سلام کیا۔ اس نے کہا۔ "اوئے جمن! تُو کہاں مر گیا تھا۔ میں نے کیمرہ مین صمد بخاری سے کہہ دیا ہے کہ میری فلم میں تم ہی ہیڈ لائٹ مین رہو گے۔ رب دی سوں، تیری لائٹنگ بڑی لاجواب ہوتی ہے۔"

میں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر اسے خوش کرنے کے لئے کہا۔ "شاہ جی! لائٹنگ کا کمال آپ ہی سے سیکھا ہے اور آئندہ بھی سیکھتا رہوں گا۔ میں تو آپ کا خادم ہوں۔ ایک خدمت کے لئے حاضر ہوا ہوں۔"

"ہاں ہاں بولو، کیا بات ہے؟"

وہ صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اس کے سامنے فرش پر بیٹھ کر اس کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "ایک حسین اور لاجواب چہرہ ہے۔ بدن بھی ایسا ہے کہ میری لائٹنگ کے ہر زاویے سے دو دھاری تلوار لگے گی۔ اسکرین پر اسے دیکھنے والے ہائے ہائے کریں گے اور ہزار جان سے عاشق ہوتے رہیں گے۔"

"اوئے بس کر جمن! کیا تُو آسمان سے پری اتار کر لایا ہے؟ یہاں تو لڑکیاں صبح سے شام تک آتی رہتی ہیں مگر سب یونہی سی ہوتی ہیں۔ کیا تُو پرستان گیا تھا؟"

"بس یونہی سمجھ لیں شاہ جی! میں پرستان نہیں گیا۔ وہ خود پرستان سے میرے پاس آئی ہے۔ اسے دیکھ کر دماغ نے کہا، ہیرے کی قدر آپ جیسا جوہری ہی کرے گا۔ کہیں دوسری جگہ لے جاؤں گا تو بیچاری رلتی پھرے گی۔"

چن شاہ نے مسکرا کر کہا۔ "ارے جمن بادشاہ! میں نے کبھی تیری کوئی بات ٹالی ہے؟ کل شام کو اسے لے آ۔ کام کی ہوئی تو کوئی سائیڈ رول دے دوں گا۔"

فلم انڈسٹری میں کوئی کسی کے حُسن کو اور صلاحیتوں کو اس کے سامنے تسلیم نہیں کرتا۔ اس میں خامیاں نکال کر، اس کا بھاؤ گرا کر اسے فلم میں چانس دیا جاتا ہے لیکن چن شاہ نے دوسرے دن ناجی کو دیکھا تو سحرزدہ سا ہو کر بے اختیار تسلیم کیا۔ "رب دی سوں! شاندار پیس ہے۔ میرے اسکرپٹ میں ہیروئن کی جتنی خوبیاں لکھی جا رہی ہیں، وہ سب اس میں ہیں۔"

اس نے دوسرے ماتحتوں کو دفتر سے جانے کے لئے کہا۔ میں ایسے اشارے سمجھتا آیا ہوں۔ میں بھی جانے لگا۔ ناجی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں نے اسے سمجھایا۔ "ہمارے شاہ جی! تمہیں ہیروئن کا رول دینے والے ہیں۔ تم بہت خوش نصیب ہو۔ یہ میرے یا کسی کے بھی سامنے اسکرپٹ کی بات نہیں کرتے۔ اس لئے تنہائی میں تمہارا رول تمہیں سمجھائیں گے۔"

میں اسے سمجھا کر اسے تسلیاں دے کر باہر آ کر دوسرے کمرے میں بیٹھ گیا۔ شاہ جی کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند ہو گیا۔ اگرچہ یہ مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ میں نے اس سے نکاح پڑھایا تھا۔ وہ میری منکوحہ تھی۔ میرا دل کہتا تھا کوئی اسے ہاتھ نہ لگائے لیکن وہ ہیروئن بننا چاہتی تھی اور میں اس کے ساتھ لکھ پتی بننا چاہتا تھا۔

آدھے گھنٹے بعد دروازہ کھل گیا۔ چن شاہ نے مجھے اندر بلا کر کہا۔ "یہ فری نہیں ہو رہی ہے۔ میری فلم میں ہیرو کے ساتھ جذباتی سین نہیں کر سکے گی۔ پھر یہ کہ اسے ڈانس کرنا نہیں آتا ہے۔ کہتی ہے شادی بیاہ میں پنڈ کی عورتوں کے ساتھ ناچا کرتی تھی۔ وہ ناچ یہاں نہیں چلے گا۔ یہاں تو ہیروئنیں ایسا ناچتی ہیں کہ فلم دیکھنے والوں کو نچا کر رکھ دیتی ہیں۔"

میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "شاہ جی! آپ کی فلم دو ماہ بعد سیٹ پر جائے گی۔ میں اس کے لئے ڈانس ماسٹر رکھوں گا۔ یہ سیکھ لے گی۔"

وہ بولا۔ "ارے ڈانس تو ہم بھی سکھا سکتے ہیں مگر یہ سیکھنا نہیں چاہتی۔"

"آپ مجھے تھوڑا سا موقع دیں۔ میں اسے سمجھا لوں گا۔"

"ٹھیک ہے اسے لے جاؤ، اسے سمجھاؤ کہ یہ فلموں میں ایک نئی چیز ہو گی۔ اس کی سمجھ میں آ جائے تو رات کو میری کوٹھی پر لے آنا۔"

میں اسے گھر لے آیا۔ وہ غصے میں تھی۔ گھر کے اندر پہنچتے ہی مجھ پر برس پڑی۔ "تمہیں شرم نہیں آتی؟ اپنی بیوی کو اس کتے کے پاس لے گئے تھے؟"

"میں بیوی کو نہیں، ایک ایسی لڑکی کو لے گیا تھا، جو ہیروئن بننا چاہتی ہے۔"

“میں ہیروئن بننا چاہتی ہوں‘ بازاری عورت نہیں۔”

“یہ انڈسٹری وہ بازار ہے جہاں پہلی فلم میں عورت ڈائریکٹر اور پروڈیوسر کی بات مانتی ہے۔ پھر فلم سپرہٹ ہو جائے تو سپراسٹار بنتے ہی انڈسٹری کے تمام ہدایت کاروں اور فلم سازوں کو اپنے پیچھے دوڑاتی ہے۔”

“مجھے یہ سب اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ میرا دل نہیں مان رہا ہے۔”

“تو پھر ہیروئن بننے کا خیال دل سے نکال دو۔ میری شریکِ حیات بن کر اس چھوٹی سی چاردیواری میں رہو اور کوٹھی‘ کار اور لاکھوں کے بینک بیلنس کے خواب دیکھتی رہو۔”

وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اس نے ہیروئن بننے کے لئے ماں باپ کو چھوڑا تھا۔ رشتے داروں کی اور بدنامی کی پروا نہیں کی تھی جس پنڈ میں پیدا ہوئی تھی‘ اسے بھی چھوڑ کر چلی آئی تھی۔ یہاں کیمرے کے سامنے پہنچنے کے لئے مجھ جیسے لائٹ مین کو سیڑھی بنایا تھا اور یہ سمجھ رہی تھی کہ میرے بعد اسے کوئی ہاتھ نہیں لگائے گا۔

اسے اپنی غلط سوچ کا احساس ہوا۔ اس نے بے شمار فلموں میں ہیروئن کو ہیرو سے لپٹتے اور ولن کو بھی بدمعاشی سے بدن کے ہر حصے تک پہنچتے دیکھا تھا اور کم سے کم لباس میں ناچتے گاتے دیکھا تھا۔ اسے پہلے ہی سمجھ لینا چاہئے تھا کہ فلموں میں عورت کے بدن کی ایسی کی تیسی ہوتی ہے‘ تب اسے لاکھوں روپے ملتے ہیں اور یوں بے شمار مہنگے خواب پورے ہوتے ہیں۔

وہ ایک چھوٹے سے مکان میں بیوی بن کر کھانا پکانے‘ برتن مانجھنے اور جھاڑو دینے کے لئے اپنے گھر کو اور ماں باپ کو چھوڑ کر نہیں آئی تھی۔ اس لئے میرے سامنے خاموش رہی اور رات کو خاموشی سے میرے ساتھ چمن شاہ کی کوٹھی میں چلی گئی۔

دوسری صبح چمن شاہ بہت خوش تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ “میری طرف سے یہ ہیروئن ڈن ہے۔ میں ابھی میاں ہمدانی سے بات کروں گا۔ تم شام کو اسے میاں صاحب کی کوٹھی پر لے آؤ۔”

میاں ہمدانی فلم کے پروڈیوسر تھے۔ پروڈیوسر لاکھوں روپے خرچ کر کے کسی نئی لڑکی کو ہیروئن بنا کر پیش کرنے کا رسک نہیں لیتا لیکن میاں صاحب نے بھی ناجی کو دیکھا تو رال ٹپک گئی۔ دوسری صبح انہوں نے بھی کہا۔ “میں لاکھوں روپے کا رسک لوں گا۔ میری فلم کی ہیروئن ناجی ہو گی۔”

معاہدہ ہو گیا۔ دو ماہ کے عرصے میں ناجی سے خوب ریہرسل کرائی گئی۔ کسی حد تک رقص کرنا سکھایا گیا۔ چمن شاہ نے کہا۔ “اتنا ہی کافی ہے۔ رقص کے جتنے مشکل حصے ہوں گے‘ انہیں

کسی ڈمی رقاصہ پر اس طرح پکچرائز کیا جائے گا کہ اسکرین پر ناجی ہی مکمل رقص کرتی دکھائی دے گی۔”

پھر فلم شروع ہو گئی۔ چونکہ میں ناجی کو دن رات دیکھتا رہتا تھا اس لئے ذہن میں یہ بات پکتی رہتی تھی کہ اس کے چہرے پر کیسے نت نئے زاویوں سے لائٹنگ کروں گا کہ دیکھنے والے اس کے حُسن کو چاند اور جوانی کو کنول کہتے رہیں گے۔

میں نے اس پر بڑی محنت کی۔ میاں ہمدانی کروڑ پتی تھے۔ رقم کی کمی نہیں تھی۔ اس لئے شوٹنگ ایک ماہ میں مکمل ہو گئی۔ دوسرے ماہ ایڈیٹنگ‘ ڈبنگ اور بیک گراؤنڈ میوزک ہوئی۔ پھر تیسرے ماہ بڑی دھوم دھام سے فلم ریلیز ہو گئی۔

وہ اپنا مقدر سنوارنے آئی تھی۔ فلم کیا ریلیز ہوئی۔ گویا لاٹری نکل آئی۔ اس نے سینما اسکوپ اسکرین پر تہلکہ مچا دیا۔ ملک کے تمام اخباروں اور رسالوں میں اس کی تصویریں‘ فیچر اور انٹرویوز شائع ہونے لگے۔ چالیس لاکھ کی لاگت سے بنی ہوئی فلم ایسی سپرہٹ ہوئی کہ اس نے نوے لاکھ روپے کا بزنس کیا۔ میاں ہمدانی نے ناجی کو تحفے کے طور پر سمن آباد میں ایک کوٹھی خرید کر اس کے نام کر دی پھر آئندہ پانچ فلموں کے لئے اس سے معاہدہ کیا۔

صرف ایک برس کے بعد وہ ایک فلم میں کام کرنے کا معاوضہ تین لاکھ روپے لینے لگی اور سمن آباد کی کوٹھی فروخت کر کے گلبرگ کے مہنگے علاقے میں کوٹھی اور کار خرید لی۔ اسے جیسے پر لگ گئے تھے۔ میرے پر نہیں تھے صرف پیر تھے۔ وہ بلندی پر اڑتی تھی۔ میں زمین پر چلتا تھا۔ وہ آگے چلتی تھی میں اس کا لباس اور میک اپ بکس اٹھائے پیچھے چلتا تھا۔

میں نے شاہ نور کی ملازمت چھوڑ دی۔ اس کا سیکرٹری بن کر اس کی مختلف فلموں کی شوٹنگ کی تاریخیں ڈائری میں نوٹ کرنے لگا۔ بڑے بڑے پروڈیوسر جو مجھے جمن یا ابے او جمو کہتے تھے‘ اب جمی صاحب کہنے لگے۔ مجھے بھی عزت مل رہی تھی لیکن بیوی کی غلامی بھی مل رہی تھی۔ وہ ہیروئن کنواری تھی۔ میں اس کا شوہر تھا۔ مگر نہیں تھا۔

اس کی تیز رفتار ترقی دیکھ کر میرے اندر وسوسے جنم لینے لگے۔ وہ کوٹھی میں آنے والے ڈائریکٹروں‘ پروڈیوسروں اور ہیروز وغیرہ سے بڑی بے تکلفی سے گفتگو کرتی تھی اور میں ایک سیکرٹری کی طرح ان سب کے سامنے کھڑا رہتا تھا یا پھر وہ کہتی تھی۔ “جمی! تم دوسرے کمرے میں جاؤ۔ ضرورت ہو گی تو بلا لوں گی۔”

اور مجھے حکم کی تعمیل کرنا پڑتی تھی کیونکہ میں سب کے سامنے شوہر نہیں بن سکتا تھا۔ ان کے جانے کے بعد اس سے لڑتا تھا۔ “تم سب کے سامنے مجھ سے ملازموں جیسا سلوک کیوں

کرتی ہو؟"

وہ پوچھتی۔ "اور کیا کروں؟ سب کے سامنے تمہیں گود میں بٹھا لوں۔ ہم نے اس سوسائٹی میں اپنی اپنی جو پوزیشن بنائی ہے' ہمیں اسی کے مطابق اپنی اپنی اوقات پر رہنا ہو گا۔"

اس نے میری اوقات یاد دلائی تو دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس کے تیور شاید بدل رہے تھے۔ میں نے ایک دن اپنی پرانی اٹیچی کھولی۔ ارادہ تھا کہ اس نکاح نامے کی دو چار فوٹو اسٹیٹ کاپیاں بنواؤں گا اور اصل کو اپنے بینک کے لاکر میں رکھوں گا۔ میں نے اس کی لاعلمی میں اپنا ذاتی اکاؤنٹ کھول رکھا تھا۔ وہ اپنی تمام آمدنی اپنے اکاؤنٹ میں رکھتی تھی۔ مجھے صرف جیب خرچ دیتی تھی لیکن میں مختلف ہتھکنڈوں سے زیادہ رقم ہتھیا لیا کرتا تھا۔

اب وقت آ گیا تھا کہ میں نکاح نامے کی حفاظت کروں لیکن اٹیچی کھولی تو وہ کاغذات غائب تھے۔ میں نے اچھی طرح تلاش کیا پھر اس سے پوچھا۔ "ہمارا نکاح نامہ کہاں ہے؟"

اس نے پوچھا۔ "دو سال بعد تمہیں نکاح نامہ کیوں یاد آ رہا ہے؟"

"میں نے یونہی اٹیچی کھولی تو وہ نظر نہیں آیا۔ اس لئے پوچھ رہا ہوں۔"

"اُسے تو میں نے جلا دیا ہے۔"

میں نے چونک کر اسے دیکھا پھر غصے سے پوچھا۔ "کیا بکتی ہو؟"

وہ بھی غصے سے بولی۔ "لہجہ درست کرو۔ اپنے منہ میں شوہر کی نہیں' ایک ملازم کی زبان رکھو۔"

میں چند لمحوں تک اسے تکتا رہا پھر میں نے پوچھا۔ "کیا واقعی تم نے اسے جلا دیا ہے؟"

"تمہیں یقین کیوں نہیں آ رہا ہے۔ جس رات تم مجھے ہدایت کار چمن شاہ کی کوٹھی میں لے گئے تھے اس تمام رات میرے دماغ میں انگارے دہکتے رہے کہ تم اب شوہر نہیں رہے۔ دوسری صبح کوٹھی سے واپس آ کر تم سو گئے۔ میں سو نہ سکی۔ جب اس نکاح نامے کو نکال کر جلایا تب مجھے نیند آئی۔ تم نے پچھلی رات بیوی کو مار ڈالا تھا میں نے صبح شوہر کو جلا کر راکھ کر دیا۔ صرف ایک دلال کو زندہ رہنے دیا۔"

میں نے گرج کر کہا۔ "بکواس مت کرو۔ میں نے زبردستی نہیں کی تھی تم خود ہیروئن بننا چاہتی تھیں۔"

"اور کیا تم ایسا نہیں چاہتے تھے؟ میں کسی راہ چلتے شخص سے منہ کالا کرتی تو تمہاری مردانگی جوش میں آ جاتی۔ تم مجھے مار پیٹ کر گھر کی چاردیواری میں قید کر دیتے لیکن میں لاکھوں روپے کمانے کی پہلی دہلیز پر گئی تھی۔ اس لئے تمہاری مردانگی جوش میں نہیں آئی۔"

میں نے تلملا کر کہا۔ "تم بچپن کی آرزو دل میں لئے گھر سے بھاگ کر ہیروئن بننے آئیں اور آج مجھے بے غیرت کہہ رہی ہو؟"

"میں کب انکار کرتی ہوں؟ میں اقرار کرتی ہوں کہ میں نے ہیروئن بننے کے لئے ابتدا میں بے حیائی کو اپنایا وہ ہدایت کار اور فلم ساز جنہوں نے میری مجبوریوں کو ہیروئن بننے کی ضرورت سے فائدہ اٹھایا تھا۔ آج میری ایک انگلی چُھونے کو ترستے ہیں' پہلے مجھے ناجی کہتے تھے۔ اب میڈم کہہ کر گڑگڑاتے ہوئے شوٹنگ کی تاریخیں مانگتے ہیں۔ بے شک میں بُری تھی۔ اب نہیں ہوں۔ میں نے پہلی رات سے تمہیں پسند کیا ہے اور اپنی زندگی کی آخری سانس تک صرف تمہیں ہی اپنا مرد بنا کر رکھنا چاہتی ہوں۔ تم میرے یار ہو' دلدار ہو' مگر کبھی کسی کے سامنے شوہر ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکو گے۔"

میرا سر جھکا ہوا تھا۔ میں یہ تسلیم کر رہا تھا کہ نکاح نامہ جلانے اور اس قدر کامیابی کی بلندیوں پر پہنچنے کے بعد وہ مجھے دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک سکتی تھی لیکن اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ اس کی خواب گاہ میں صرف میں ہی جا سکتا تھا۔ میں نے کئی بار چھپ چھپ کر جاسوسی کرنے کے باوجود کسی اور کو اس کے بیڈ روم میں جاتے نہیں دیکھا تھا۔

اس پہلو سے وہ وفادار تھی۔ مگر میری ہر بات ماننے والی بیوی نہیں تھی۔ مجھے اس پر پیار آتا تو وہ پاس نہیں آنے دیتی تھی۔ اسے پیار آتا تو یوں پچکار کر بلاتی جیسے کتے کو بلا رہی ہو۔

پتا نہیں' یہ میرے احساسات تھے یا اس کا انداز ہی کچھ ایسا تھا۔ یہ بات مجھے احساسِ کمتری میں مبتلا کر رہی تھی کہ وہ مالکہ بن گئی تھی اور میں محکوم بن گیا تھا جبکہ مرد زبردست ہوتا ہے۔ مجھے عورت کے زیردست رہنا گوارا نہ تھا۔

میں دوسرے دن قاضی صاحب کے پاس گیا۔ انہوں نے مجھے نہیں پہچانا۔ میں نے یاد دلایا۔ "میرا نام جمال الدین ہے۔ آپ نے دو برس پہلے خانہ بدوشوں کے ایک خیمے میں میرا نکاح نذیراں عرف ناجی سے پڑھایا تھا۔"

وہ سر ہلا کر بولے۔ "ہاں خانہ بدوشوں کے حوالے سے یاد آیا۔ ٹھیک ہے۔ میں نے وہ نکاح پڑھایا تھا۔ اب بولو کیسے آنا ہوا؟"

میں نے ان کی طرف جھک کر رازداری سے کہا۔ "میں نے آپ کو دو ہزار روپے دیئے تھے۔ آج چار ہزار دے سکتا ہوں۔"

"اچھا سمجھ گیا۔ پھر کسی لاوارث لڑکی سے نکاح پڑھواؤ گے۔"

"جی نہیں۔ مجھ اس پہلے نکاح نامے کی دوسری کاپی چاہیئے۔ آپ نے جو نکاح نامہ دیا تھا'

وہ گم ہو گیا ہے۔"

"اس کی کوئی کاپی میرے پاس نہیں ہے اور نہ ہی میں نے نکاح کے رجسٹر میں اس کا اندراج کیا تھا۔"

"آپ نے رجسٹر میں اس کا ریکارڈ کیوں نہیں رکھا؟"

"اس لئے کہ وہ نکاح مذہبی اور سرکاری اصولوں کے خلاف تھا۔ لڑکی کہیں سے بھگا کر لائی گئی تھی۔ اس کا کوئی بزرگ یا کوئی رشتے دار گواہ اور وکیل کی حیثیت سے نہیں تھا۔ تم نے مجھے رشوت دی تھی اس لئے میں نے نکاح کے فارموں پر تمہارے اور لڑکی کے دستخط لے کر نکاح پڑھا دیا تھا۔ چور نکاح کے لئے میں نے ایک جعلی مہر بنوا کر رکھی ہے اور نکاح کے بہت سے خالی فارم میرے پاس پڑے رہتے ہیں۔ میں نے تمہارے نکاح نامے میں وہی جعلی مہر لگائی تھی اور فرضی قاضی کا نام لکھ کر فرضی نام کے دستخط کئے تھے۔"

"آپ نے مجھے پہلے یہ بات کیوں نہیں بتائی؟"

"اب پوچھ رہے ہو تو بتا رہا ہوں۔ ویسے کیا فرق پڑتا ہے؟ ابھی تم چار ہزار دینے کی بات کر رہے تھے۔ نکالو رقم میں دوسرا نکاح نامہ تیار کر دیتا ہوں۔"

"لیکن اس دوسرے نکاح نامے پر نذیراں عرف ناجی کے دستخط کہاں سے لاؤں گا؟"

"کیوں نہیں لا سکتے؟ کیا وہ مر گئی ہے؟"

"وہ زندہ ہے' میں مر رہا ہوں۔ اگر دوسرے نکاح نامے پر اس کے جعلی دستخط کروں گا تو وہ فراڈ نکاح نامے کو کورٹ میں چیلنج کرے گی۔ وہ بہت مالدار اور عزت دار ہو گئی ہے۔ مجھ پر ہتکِ عزت کا مقدمہ قائم کر دے گی۔"

میں اپنی ناکامی پر جھنجلا کر وہاں سے چلا آیا۔ جیسے غبارے سے ہوا نکلتی ہے اسی طرح میرے اندر سے ایک شوہر کے اختیارات خارج ہو گئے تھے۔ ایک نکاح نامہ نہ ہونے کے باعث میں اس کا محض سیکرٹری اور باڈی گارڈ رہ گیا تھا۔

☆======☆======☆

اب تو صبر سے کام لینا تھا۔ میں انتقاماً اسے شادی شدہ ثابت کر کے اس کے کنوارے پن کی کشش ختم کر کے اس کا بھاؤ نہیں گرا سکتا تھا۔ اسے بی کلاس اداکارہ نہیں بنا سکتا تھا۔ ویسے نکاح نامہ ہوتا' تب بھی میں اسے محض دھمکیاں دیتا۔ بلیک میل کرتا لیکن اس کا بھاؤ کبھی نہ گراتا۔ کیونکہ اس کے گرنے سے میری آمدنی کا گراف بھی نیچے گر جاتا۔

یوں دیکھا جائے تو میں عیش کر رہا تھا۔ کوٹھی کی چار دیواری میں جب کوئی نہ ہوتا تو

وہ صرف میری ہوتی تھی میری ضرورت کے مطابق مجھے دس بیس ہزار روپے دیتی رہتی تھی۔ جس طرح ایک محبت کرنے والا شوہر اپنی بیوی کے ناز نخرے برداشت کرتا اور اس کی ہر خواہش پوری کرتا ہے' اسی طرح وہ میری ہر ضرورت پوری کرتی تھی مگر بے وقت کی خواہش پوری نہیں کرتی تھی۔

اور وہ بے وقت کی خواہش اس وقت ہوتی تھی' جب وہ میک اپ اور گیٹ اپ کے بعد نئے روپ میں ایک نئی اور اجنبی دوشیزہ بن جاتی تھی۔ جب بیوی نظر نہ آئے تو کسی اجنبی حسینہ کو چھونے اور ڈش بدلنے کو جی چاہتا ہے۔ وہ ڈش انٹینا کی طرح اپنے وجود کے کئی چینل بدلتی تھی مگر مجھے ایک ہی چینل دیکھتے رہنے کا پابند بنائے رکھتی تھی۔

ایسے ہی وقت مجھے شدت سے احساس ہوتا تھا کہ میرے پاس ایک شوہر کے تمام اختیارات نہیں ہیں۔ اگر ہوتے تو میں حکم دیتا کہ آج کی شوٹنگ کینسل کرو اور اس فل میک اپ کے ساتھ ایک اجنبی حسینہ بن کر میری تنہائی کو روشن کرو۔

تین برس گزر گئے تو اس کی پارسائی کا یقین آیا کہ اس کی تنہائیوں کا شریک صرف میں ہوں۔ میرے ہی دم سے اس کے کنوارے پن کا بھرم قائم ہے۔ اخبار والے پوچھتے تھے۔ "آپ شادی کب کریں گی؟ آپ کا آئیڈیل کون ہے؟"

وہ جواباً ٹال دیتی تھی۔ "ابھی شادی کے لئے سوچا نہیں ہے اور نہ ہی کوئی میرا آئیڈیل ہے۔"

بات کا بتنگڑ بنانے والے چند اخبارات بھی یہ تسلیم کرتے تھے کہ ناجی ہماری انڈسٹری کی پہلی خوبصورت ہیروئن ہے' جس کے خلاف کسی نے یہ افواہ نہیں پھیلائی کہ کسی ہیرو یا ہدایت کار سے اس کا کوئی چکر چل رہا ہے۔ کسی نے چوری چھپے اس کی کوئی رومانی یا جذباتی غلطی نہیں پکڑی تھی۔

بھلا کیسے پکڑتے؟ وہ میرے سوا کسی کو جذباتی رشتے کا حق نہیں دیتی تھی اور کوئی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ اس کا ایک ملازم ہی اس کا شوہر ہے۔ ان حالات میں اس کنواری ہیروئن کا معاوضہ سب سے بڑھ کر تھا۔ کتنے ہی کروڑ پتی اور ارب پتی عیاش' کار کوٹھی اور زمینیں اس کے نام کرنا چاہتے تھے اور منہ مانگی رقمیں اس کے اکاؤنٹ میں جمع کرنے کو تیار تھے مگر وہ بڑی سے بڑی پیشکش کو ٹھکرا دیا کرتی تھی۔

یہ سب کچھ دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ وہ میرے بغیر نہیں رہ سکے گی۔ اگر میں ایک شوہر کے اختیارات استعمال کروں گا تو اسے میرے آگے جھکنا ہو گا۔ میرا ہر حکم ماننا پڑے

گا۔ یہ سوچ کر میں نے ایک روز اسے فل میک اپ کے وقت پکڑ لیا۔ وہ ناگواری سے بولی۔ "یہ کیا حرکت ہے؟"

میں نے کہا۔ "مجھے شوہر کے اختیارات دو گی تو میری ہر حرکت میں تمہارے لئے برکت ہو گی اور تم سدا کنواری کہلاتی رہو گی۔"

وہ خود کو مجھ سے چھڑا کر دور ہوئی پھر بولی۔ "کمرے سے جاؤ۔ مجھے شوٹنگ کے لئے دیر ہو رہی ہے۔"

"آج تم شوٹنگ میں نہیں جاؤ گی۔ میری آغوش میں رہو گی۔"

میں نے اسے آغوش میں لینا چاہا تو اس نے مجھے دھکا دیا۔ ایک بیوی اور شوہر کو دھکا دے؟ مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے پہلی بار اسے ایک تھپڑ مارا۔ مردانہ تھپڑ تھا۔ وہ گھوم کر بستر پر گر پڑی۔ میں نے اسے دوسرا ہاتھ مارا۔ وہ غصے سے چیخنے اور گالیاں دینے لگی۔ میرے حملہ کرنے والے ہاتھوں کو روکنے لگی۔ ٹانگیں چلا کر مجھے اپنے سے دور رکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ ایسے ہی وقت دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ میں فوراً ہی اس سے دور ہو گیا۔ وہ بھی بستر سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

کوٹھی کے آہنی گیٹ پر ڈیوٹی دینے والا پٹھان ناجی کی چیخیں سن کر دوڑتا ہوا آیا تھا۔ ناجی اسے دیکھتے ہی ہانپتے ہوئے بولی۔ "دلاور خان! ادھر آؤ۔ یہ سیکرٹری اپنی اوقات بھول رہا ہے۔ اس کی پٹائی کرو اور دھکے دے کر یہاں سے نکال دو"

میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ ایک چوکیدار کے سامنے میری بے عزتی کرے گی۔ دلاور خان نے مجھ سے پوچھا۔ "اے سیکٹ ری! تم کیا بدمعاشی کرتی ہے۔ چلو ادھر سے باہر چلو۔"

میں نے کہا۔ "خان! تم جاؤ۔ یہ ہمارا آپس کا معاملہ ہے۔"

وہ چیخ کر بولی۔ "تم سے کوئی آپس کا معاملہ نہیں ہے۔ مجھے بدنام کر دینے کی خوش فہمی میں نہ رہنا۔ اگر تم دلاور خان سے نہ گئے تو میں پولیس کو بلاؤں گی۔ حوالات میں تمہیں ڈنڈے مارے جائیں گے اور پوچھا جائے گا کہ ہمارے آپس کے کسی معاملے کا کیا ثبوت تمہارے پاس ہے۔"

دلاور خان نے پیچھے سے میری گردن دبوچ لی۔ پھر مجھے دروازے کی طرف دھکا دیا۔ میں اس سے مقابلہ کر سکتا تھا مگر ناجی نے پولیس والوں کو بلانے کی دھمکی دے کر مجھے خوفزدہ کر دیا تھا۔ وہ ملک گیر شہرت رکھنے والی سپر اسٹار تھی۔ دولت کی کمی نہیں تھی۔ وہ

پولیس والوں کی جیبیں گرم کر کے میرے خلاف کوئی بھی کیس بنا سکتی تھی۔ میں نے حوالات میں ڈنڈے کھانے کے بجائے دلاور خان کے دھکے کھائے۔ اس نے مجھے احاطے کے باہر پہنچا کر آہنی گیٹ بند کرتے ہوئے کہا۔ "اے سیکٹ ری! اب تم ادھر آئے گی تو ہم نسوار کھا کے تمہارے منہ پر تھوک دے گی۔ چلو دفع ہو جاؤ۔"

میں بڑا بے آبرو ہو کر اس کے کوچے سے نکلا۔ میری خوش فہمی ختم ہو گئی تھی کہ وہ اپنے کنوارپن کا بھرم رکھنے کے لئے مجھے ہر حال میں اپنے ساتھ رکھنا چاہے گی۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ مجھے اس طرح بے عزت کر کے گھر سے نکالے گی۔

جو لوگ اپنی طاقت اور اختیارات کا صحیح اندازہ نہیں کر پاتے' وہ میری طرح اختیارات سے خالی ہو کر رہی سہی عزت اور ذرائع آمدنی سے محروم ہو جاتے ہیں۔

میرے پاؤں کے نیچے فٹ پاتھ تھا اور سر پر چھت نہیں تھی۔ میں ایک شاندار کوٹھی سے محروم ہو گیا تھا۔ چپلیں پہنے ہوئے تھا۔ جبکہ ایک سیکرٹری کی حیثیت سے سوٹ بوٹ میں رہتا تھا۔ میری جیب میں صرف چھ سو روپے تھے۔ اس رقم سے کب تک گزارا ہوتا۔ میں دو دن تک کسی اسٹوڈیو کی طرف نہیں گیا۔ مجھے شرم آ رہی تھی۔ کوئی پوچھتا تو یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ بیوی نے گھر سے نکالا ہے۔ یہی کہنا پڑتا کہ میڈم نے ملازمت سے نکال دیا ہے۔ اب شاید کوئی دوسرا سیکرٹری رکھے گی۔

دوسرے سیکرٹری کے خیال سے یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر ناجی نے کسی خوبرو سیکرٹری کو چور دروازے سے شوہر بنا لیا تو یہ فخر بھی جاتا رہے گا کہ وہ میری اور صرف میری دیوانی اور وفادار ہے اور میری جگہ کوئی دوسرا نہیں لے گا۔

اب اپنی حماقت کا احساس ہو رہا تھا۔ میں نے شوہر کی جگہ چھوڑ کر ناجی کو کسی دوسرے کی طرف بھٹکنے اور گمراہ ہونے کا موقع دیا تھا۔ میں نے تیسرے دن کوٹھی میں فون کیا۔ رابطہ قائم ہونے پر ناجی کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو' کون ہے؟"

میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "میں' میں ہوں۔"

دوسری طرف سے خاموشی رہی۔ میں نے کہا۔ "مجھ سے بھول ہو گئی۔ بہت بڑی غلطی ہو گئی۔ مم .... مجھے معاف کر دو۔ مجھے ایک موقع دو۔ پھر ایسی غلطی نہیں کروں گا۔"

وہ سن رہی تھی۔ جواب نہیں دے رہی تھی۔ میں نے کہا۔ "میں شرم سے اسٹوڈیو نہیں جا رہا ہوں۔ سارے پروڈیوسر اور ڈائریکٹر تمہاری مہربانیوں سے مجھے جی صاحب کہتے

ہیں۔ اگر انہیں معلوم ہو گا کہ تم نے مجھے ملازمت سے نکال دیا ہے تو پھر کوئی مجھے صاحب نہیں کہے گا۔ سبھی مجھے پہلے کی طرح "ابے او جمو یا جمن" کہہ کر مخاطب کریں گے۔ ہیلو ہیلو ناجی! کیا مجھ سے نہیں بولو گی؟ مجھ سے ناراض رہو گی؟ میں اپنی غلطی کی معافی مانگ رہا ہوں۔ ایک بار' صرف ایک بار مجھے معاف کر دو۔"

بڑی دیر بعد اس کی آواز سنائی دی۔ "ابھی تم کہاں ہو؟"

"میں لبرٹی مارکیٹ میں پیٹرول پمپ کے سامنے ہوں۔"

"ٹھیک ہے' میں ڈرائیور کو بھیج رہی ہوں۔ گاڑی میں چلے آؤ۔"

اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ میں خوشی سے کھل گیا۔ مجھے کھوئی ہوئی جنت واپس مل گئی تھی۔ لبرٹی مارکیٹ سے ناجی کی کوٹھی زیادہ دور نہیں تھی۔ پھر بھی اس نے مجھے بے عزت کر کے نکالنے کے بعد واپس بلانے کے لئے گاڑی بھیجی تھی۔ یوں میری عزت بھی کی تھی۔

میں کوٹھی میں پہنچا تو وہ خواب گاہ میں تھی۔ اپنے چہرے سے ناراضگی ظاہر کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر ناگواری سے بولی۔ "کیا جانوروں جیسا حلیہ بنا رکھا ہے۔ جاؤ غسل کرو' شیو کرو اور آدمی بن کر آؤ۔"

اس کوٹھی میں ملازموں کو دکھانے کے لئے بظاہر میرا ایک الگ کمرہ تھا۔ جب وہ بلاتی تھی تو میں اس کے کمرے میں آتا تھا۔ ایسے وقت کوئی ملازم کوٹھی کے اندر نہیں ہوتا تھا۔ سب اپنے فرائض نمٹا کر جا چکے ہوتے تھے۔ کوٹھی کے تمام دروازے اندر سے بند رہتے تھے۔ میں صبح پانچ بجے اس کی خواب گاہ سے باہر آنے کے بعد کوٹھی کا بیرونی دروازہ کھولتا تھا۔

اس رات دس بجے کے بعد باورچی اور اس کی بیوی اپنے کام سے فارغ ہو کر چلے گئے تو ناجی نے مجھے بلایا۔ میں تمام دروازے بند کر کے خواب گاہ میں آیا۔ اس نے کہا۔ "میں سمجھتی ہوں' تمہارا دماغ درست ہو چکا ہے۔ اس لئے تم سے کچھ باتیں کر لوں۔ وہاں بیٹھ جاؤ۔"

میں ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس نے کہا۔ "فلمی اداکارہ بننے کے لئے کتنی ہی لڑکیاں یہاں بھٹکنے آتی ہیں۔ ان بھٹکنے والیوں میں نہ جانے کتنی ایسی ہیں' جن کے ساتھ تم نے راتیں کالی کی ہوں گی۔ تم نے ان سب کو چھوڑ دیا' مجھے کیوں نہیں چھوڑ رہے ہو؟"

میں نے کہا۔ "خدا جانتا ہے۔ میں تمہیں دل و جان سے چاہتا ہوں۔"

وہ بولی۔ "خدا جانتا ہے اور میں بھی جانتی ہوں کہ میری فلمیں بزنس نہ کرتیں اور میں سُپر اسٹار بن کر لاکھوں روپے نہ کماتی تو تم ان ناکام رہنے والی لڑکیوں کی طرح مجھے بھی چھوڑ دیتے۔"

"ناجی! تم میری جان ہو۔ میرے خلوص پر شبہ نہ کرو۔"

"تم بکواس نہ کرو۔ اب میں بھی اس انڈسٹری کے لوگوں کی رگ رگ سے واقف ہو گئی ہوں۔ آج شادی کے لئے راضی ہو جاؤں تو بڑے بڑے شریف گھرانے کے دولت مند مجھ سے شجرہ نہیں پوچھیں گے' مجھے گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی نہیں سمجھیں گے۔ یہ حساب نہیں کریں گے کہ میری کتنی راتوں میں کتنے مرد آ چکے ہیں۔ وہ بڑے فخر سے دلہا بن کر میرے ساتھ تصویریں اتار کر تمام اخباروں اور رسالوں میں یوں شائع کرائیں گے جیسے انہوں نے دنیا کی سب سے نیک نام شریف زادی کو اپنی شریکِ حیات بنایا ہے۔"

وہ درست کہہ رہی تھی۔ ہمارے ہاں نیک نامی اور شرافت کی پہچان یہی ہے کہ کس نے ریڈیو' ٹی وی' اخباروں اور رسالوں کے ذریعے کتنی شہرت حاصل کی ہے' اور کتنی زیادہ دولت کمائی ہے۔ یہ دولت کن ذرائع سے آئی ہے؟ اس کا محاسبہ کبھی نہیں ہوتا۔ کسی محاسبے اور چھان بین کے بغیر اس سوسائٹی میں معزز ہونے کی سند مل جاتی ہے۔

وہ اچانک ہی رونے لگی۔ پھر آنسو پونچھتے ہوئے کہنے لگی۔ "مگر میں اپنا محاسبہ کرتی ہوں۔ میں نے اتنی شہرت اور دولت حاصل کرنے کے لئے دو گناہ آلود راتیں گزاریں۔ ایک چن شاہ کے پاس اور ایک میاں ہمدانی کے پاس۔ پھر قسمت نے ایسا ساتھ دیا کہ میں نے دوبارہ اپنے بدن پر کسی کا سایہ بھی نہیں پڑنے دیا۔"

میں نے کہا۔ "میں اچھی طرح جانتا ہوں' تم بہت حساس ہو اور فطرتاً شریف ہو اس لئے اتنی شہرت اور دولت حاصل کرنے کے بعد بھی مجھ جیسے ایک معمولی آدمی سے وفا کر رہی ہو۔ میرے علاوہ کسی اور کی قربت کو گناہ سمجھتی ہو۔"

"ہاں' میں نے اسی لئے تمہیں واپس بلایا ہے۔ میرا ضمیر اور میرے اندر کی عورت تمہارے سوا کسی کی قربت برداشت نہیں کرے گی۔ مجھ سے جو گناہ ہو گیا' اس کی تلافی اسی طرح ہو سکتی ہے کہ میں راہِ راست پر رہوں اور تمہاری جگہ کسی کو نہ دوں۔"

"میں خوش نصیب ہوں کہ مجھے تمہارے جیسی شریف اور وفادار بیوی نصیب ہوئی ہے۔"

"میری تعریفیں نہ کرو اور میرے سامنے محبت کے مکالمے نہ بولو۔ تم سب کچھ ہو

سکتے ہو' وفادار محبوب نہیں ہو سکتے۔ محبت کرنے والی عورت تمام عمر اپنے وفادار ظالم شوہر کے ساتھ گزارا کر سکتی ہے۔ اسی طرح میں بھی تمہارے ساتھ گزارا کرتی رہوں گی۔ تم سے صرف اتنا چاہوں گی کہ آئندہ میرے میک اپ کے دوران مداخلت نہ کرنا اور مجھے تنہا چھوڑ کر نہ جانا' ورنہ............"

وہ کہتے کہتے رک گئی پھر بولی۔ "ورنہ تمہارے جانے کے بعد کوئی محبت سے یا جبر سے میری تنہائی میں آنا چاہے گا' مجھے گناہوں کی دلدل میں لے جانے کی کوشش کرے گا تو میرے اندر کی عورت یہ برداشت نہیں کر پائے گی۔ مجھ سے اب کوئی گناہ سرزد نہیں ہو گا۔ اس سے پہلے کہ تمہاری جگہ کوئی لے' میں شرم سے مرجاؤں گی۔ سچ کہتی ہوں' شرم سے زیادہ قاتل ہتھیار اور کوئی نہیں ہوتا۔"

اس کی آنکھوں میں پھر آنسو آ رہے تھے۔ میں نے قریب آکر اس کے آنسو پونچھے پھر اسے سینے سے لگالیا۔ اس رات مجھے اس سے بڑی محبتیں ملیں۔ اس کے بعد وہ میرا زیادہ خیال رکھنے لگی اور اس کے بعد یہ اچھی طرح تصدیق ہو گئی کہ میں اس کے لئے ہر حال میں لازم ہوں۔ وہ میرے بغیر نہیں رہ سکے گی۔ اگر میں اسے چھوڑ کر جاؤں گا تو وہ میری جگہ کبھی کسی کو نہیں دے گی۔

ان حقائق کے پیشِ نظر میں زیادہ سے زیادہ شوہر کے حقوق حاصل کر سکتا تھا۔ اسے میری کم عقلی سمجھا جائے یا میری مردانگی کہ میں عورت کی حاکیت برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ کسی فلم ساز کے سامنے مجھے بلا کر کہتی تھی۔ "مسٹر جمی! ان کی شوٹنگ کے لئے اگلے ماہ کے دس دن کسی طرح ایڈجسٹ کرو اور ایڈجسٹ کرنے کے لئے کسی دوسرے پروڈیوسر کی تاریخیں کینسل کر دو اور نئے ڈریس کے لئے ٹیلر ماسٹر کو بلا کر لاؤ۔"

ایسے وقت احساس ہوتا تھا کہ وہ گھر کی لونڈی ہو کر مجھے حکم دے رہی ہے۔ میں ایک ملازم سیکرٹری کی حیثیت سے سب کے سامنے خاموش رہتا تھا مگر خواب گاہ کی تنہائی میں اس سے جھگڑا کرتا تھا یا پھر ضد کرتا تھا کہ وہ میک اپ کرنے کے بعد مجھے چھونے کیوں نہیں دیتی ہے؟ کیا میرے چھونے سے تم میلی ہو جاؤ گی؟ کیا میک اپ ذرا سا پھیل جائے گا تو اسے درست نہیں کر سکو گی؟

وہ کہتی تھی۔ "بات محض میک اپ کی نہیں ہے۔ میں پوری انڈسٹری میں وقت کی پابندی کرنے کے سلسلے میں مشہور ہوں۔ تم میک اپ خراب کرو گے تو میں سیٹ پر دیر سے پہنچوں گی۔ ہمیں گھر اور باہر کے معاملات میں اصولوں کا پابند ہونا چاہئے۔"

میں نے کہا۔ "مجھے نہ سمجھاؤ۔ جذبات' اصولوں کے پابند نہیں ہوتے۔ کیا تم میرے جذبات کا خیال کرتے ہوئے ایک دن کی شوٹنگ کینسل نہیں کر سکتیں؟"

"میں تمہارے لئے بہت کچھ کرتی رہتی ہوں لیکن انصاف سے سوچو کہ میرے جیسی سُپر اسٹار ہیروئن ایک دن شوٹنگ پر نہ جائے تو فلم ساز کو لاکھوں روپے کا نقصان پہنچتا ہے۔ کیا ایک فلم ساز ہمیں ایک فلم کا معاوضہ تین لاکھ یا چار لاکھ اس لئے دیتا ہے کہ اسے ہماری ذات سے نقصان پہنچتا رہے؟"

"تم فلم سازوں سے ہمدردی کر رہی ہو؟ کیا بھول گئیں کہ یہ فلم ساز کسی نئی لڑکی کو چانس دینے کے لئے پہلے اس کی عزت سے کھیلتے ہیں۔"

"پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ تمام فلم ساز عیاش اور گنہگار نہیں ہوتے۔ پھر وہ جو سرمایہ لگاتے ہیں وہ ہمارا قومی سرمایہ ہوتا ہے۔ ہمارے ملک کی کرنسی ہوتی ہے۔ اس کرنسی نے مجھے اور تمہیں اس قابل بنایا ہے کہ آج ہم ایک شاندار کوٹھی میں رہتے ہیں۔ سیدھی سی بات ہے کہ جتنے فلم ساز مجھے یہ کرنسی دیتے ہیں' میں ان کی عزت کرتی ہوں۔ اس لئے شوٹنگ کا ناغہ کر کے انہیں نقصان نہیں پہنچاؤں گی۔"

اس روز ہمارے درمیان پھر اسی بات پر جھگڑا بڑھ گیا۔ بیوی بات نہ مانے تو توہین کا احساس ہوتا ہے۔ اگر وہ ایک دن شوٹنگ پر نہ جاتی تو کوئی قیامت نہیں آ جاتی۔ بلکہ شوہر کا مان بڑھ جاتا۔ باہر ملازم سمجھنے والی کو گھر میں تو بیوی کی طرح تابعدار رہنا چاہئے۔

میں نے اس روز پھر ایک شوہر کے اختیارات آزمائے۔ اپنے حقوق کا مطالبہ کیا۔ اس سے زبردستی کی تو اس نے انٹرکام کے ذریعے دلاور خان سے کہا۔ "میرے کمرے میں آؤ۔"

میں ٹھنڈا پڑ گیا۔ اگرچہ میں خان سے مقابلہ کر سکتا تھا لیکن اسے گھر کی مالکن کی حمایت حاصل تھی اور یہ حمایت مجھے شوہر نہیں ملازم بنا دیتی تھی۔ میں نے پوچھا۔ "یہ .... یہ تم نے خان کو یہاں کیوں بلایا ہے؟"

"اس لئے کہ تم سیدھی طرح کوٹھی سے باہر نہیں جاؤ گے۔"

"کیا تم مجھے پھر یہاں سے نکالنا چاہتی ہو؟ کیا تم میرے بغیر تنہا زندگی گزار سکو گی؟ تم نے کہا تھا کہ میں چھوڑ کر جاؤں گا تو میری جگہ کسی کو نہیں دو گی۔"

"ہاں' تمہارے جانے کے بعد میں اپنی بات پر قائم رہوں گی۔ مگر تم بھی بے گھر اور بے روزگار ہونے کے بعد اپنی اوقات معلوم کرتے رہنا کہ مجھے چھوڑنے کے بعد پھر وہی

لائٹ مین بن جاؤ گے اور جمی صاحب نہیں' ابے او جمن کہلاؤ گے۔"

دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ دروازے کی طرف گئی پھر اسے کھول کر دلاور خان سے کہا۔ "جمی صاحب کو عزت کے ساتھ گیٹ کے باہر پہنچا دو۔ جب یہ دو دن کے بعد آنا چاہیں تو آنے دینا۔ میں انہیں دو دن کے لئے ملازمت سے نکال رہی ہوں۔"

میں غصے سے باہر آ گیا۔ اس بار اپنی چیک بک ساتھ لایا تاکہ کھانے پینے اور کسی ہوٹل میں قیام کرنے کے سلسلے میں کسی کی محتاجی نہ رہے۔ کسی سے قرض نہ مانگنا پڑے۔ میں نے جس ہوٹل میں قیام کیا اس کے کمرے کا کرایہ آٹھ سو روپے یومیہ تھا۔ میں ہمیشہ بہترین' مہنگے لباس میں رہتا تھا اور ناجی کی بدولت شوٹنگ کے دوران مہنگے ہوٹلوں کے معیاری کھانے کھاتا تھا۔ اب ناجی سے الگ ہونے کے بعد اپنی وہی پوزیشن بنائے رکھنا لازمی تھا۔

یوں اپنا سابقہ معیار قائم رکھنے سے ہو سکتا تھا کہ کوئی دوسری سپر اسٹار ہیروئن مجھے اپنا پرسنل سیکرٹری بننے کے لئے آفر دیتی۔ ویسے میں خود کسی سے جا کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ ناجی نے مجھے ملازمت سے نکال دیا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ یہ خبر خود ہی انڈسٹری میں پھیل جائے۔

میں غلطی پر تھا۔ کوئی ملازمت پیش کرنے ہمارے دروازے پر نہیں آتا۔ ملازمت ایسی چیز ہے' جسے مانگنے کے لئے دوسروں کے پاس جانا پڑتا ہے۔ ہوٹل میں دس دن گزر گئے اور میرے تیس ہزار روپے خرچ ہو گئے۔ ہوٹل کا کرایہ' کھانے کا بل' پھر شام کو انڈسٹری سے تعلق رکھنے والے رمی کھیلنے آ جاتے تھے۔ اس کھیل میں جیت کم ہوتی تھی اور نقدی زیادہ ہارتا تھا۔ پھر پینے کا معیار بھی قائم رکھنے کے لئے اسکاچ وہسکی پینا لازمی ہوتا تھا۔ بینک میں اسی ہزار تھے۔ تیس ہزار نکل گئے اور پندرہ دن ہوٹل میں قیام کرنے کا مطلب یہ ہوتا کہ بینک کی ساری رقم نکل جاتی۔ اس کے بعد میں فٹ پاتھ پر آ جاتا۔

میں نے فون کیا۔ پتا چلا وہ کہیں شوٹنگ پر گئی ہے۔ صبح آئے گی۔ میں نے صبح فون کیا تو اس کی آواز سنائی دی۔ میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "میں .... میں ہوں۔ تمہارا جمی.........."

وہ سخت لہجے میں بولی۔ "آگے کوئی فلمی ڈائیلاگ نہ بولنا۔ آنا چاہو تو دلاور خان نہیں روکے گا۔ نہ آنا چاہو تو کوئی اور بات نہ کرو۔ جہنم میں چلے جاؤ۔"

اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ میں نے اطمینان کی گہری سانس لی۔ اس نے میرے لئے

دروازہ کھلا رکھا تھا۔ میں تیس ہزار کا نقصان اٹھا کر پھر کوٹھی میں آ گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر ناگواری سے بولی۔ "میں تھکی ہوئی ہوں۔ زیادہ باتیں نہیں کروں گی۔ آخری بات یہ ہے کہ اب جاؤ گے تو کبھی واپس نہیں آ سکو گے۔ فلمی حلقوں میں باتیں بنائی جائیں گی کہ میں بار بار تمہیں ملازمت سے نکال کر پھر کیوں بلا لیتی ہوں۔ میں کسی کو کسی طرح کا شبہ کرنے کا موقع نہیں دوں گی۔ لہٰذا آئندہ کے لئے آدمی بن جاؤ۔ اب یہاں سے جاؤ اور مجھے آرام کرنے دو۔"

میں نے الگ کمرے میں آ کر رات گزاری۔ دوسرے دن اس نے کہا۔ "تم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آؤ گے پھر مجھے پریشان کرو گے' میں نے سوچا ہے کہ آئندہ تمہیں گھر سے نہیں نکالوں گی۔ اسی کوٹھی کے کسی کمرے میں قیدی بنا کر سزا دوں گی۔ اس طرح باہر والوں تک ہمارے آپس کے جھگڑے کی کوئی خبر نہیں پہنچے گی۔"

میں خاموش رہا۔ بھلا جواب کیا دیتا۔ زندگی کی بساط پر ایک عورت سے مات کھا رہا تھا لیکن دیکھا جائے تو میں نے ابھی پوری طرح مات نہیں کھائی تھی۔ اگرچہ اس نے دس دنوں تک میری خبر نہیں لی تھی۔ خود مجھے نہیں بلایا تھا۔ اس کے باوجود میں اس کے لئے لازمی تھا۔ وہ بڑی چالاک تھی۔ یہ اچھی طرح سمجھتی تھی کہ میں اپنی جیب خالی ہونے سے پہلے اس کے پاس لوٹ آؤں گا۔

پھر اس کی دوسری چالاکی یہ تھی کہ وہ بار بار مجھے کوٹھی سے نکالنا نہیں چاہتی تھی۔ لوگوں کو یہ سوچنے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی کہ مجھ جیسے سیکرٹری میں ایسی کیا خوبی یا کشش ہے کہ وہ ملازمت سے نکالتی بھی ہے پھر اسے ملازمت پر بحال بھی کر دیتی ہے۔

یوں اس نے بڑی احتیاط سے کام لیا۔ میں جب بھی آپے سے باہر ہوتا وہ مجھے خواب گاہ کے ساتھ والے کمرے میں قید کر دیتی تھی۔ میں قیدی بننے پر راضی نہ ہوتا تو دھمکی دیتی تھی کہ دلاور خان مجھے دھکے دینے آئے گا۔ اگر میں پھر بھی باز نہ آیا تو ایک ہیروئن کے گھر سے قیمتی زیورات اور نقدی چرانے کا الزام لگا کر پولیس والوں سے میری پٹائی کرائے گی۔

میں اپنی اس روداد کی ابتدا میں بیان کر چکا ہوں کہ کس طرح بے چون و چرا اس کی بات مان کر قیدی بن جاتا تھا اور کھڑکی کی جالیوں کے پیچھے رہ کر دور سے اس کے حسن و شباب کا نظارہ کرتا تھا۔

پھر ایک بار میں بند دروازے کے باہر لگی ہوئی چٹخنی کھول کر جذبات کے جنون میں

اس کا میک اپ بگاڑنے چلا آیا تو وہ دوسرے دن سے مجھے ہتھکڑیاں پہنانے لگی۔ میں نے اسے کئی بار سمجھایا' ایسی حماقت نہ کرو۔ تم مجھے صبح ہتھکڑیاں پہنا کر جاتی ہو اور شام کو آ کر کھولتی ہو۔ تمہاری عدم موجودگی میں کوئی حادثہ پیش آ سکتا ہے۔ گھر میں کسی طرح آگ لگ سکتی ہے پھر تمہیں خبر ہوتے تک میں جل کر راکھ ہو جاؤں گا۔

لیکن وہ بڑے یقین سے کہتی تھی کہ ہماری کوٹھی میں کبھی کوئی حادثہ ہوا نہ کوئی واردات ہوئی۔ اس لئے میں آہنی جالیوں والی کھڑکی سے ہتھکڑیوں کے ذریعے بندھا رہوں گا اور خیریت سے رہا کروں گا۔

یہ سلسلہ کچھ روز تک چلتا رہا۔ شام اسے واپسی میں دیر ہو گئی۔ رات کے آٹھ بجے آئی۔ کمرے کی لائٹس آن کر کے بولی۔ "مجھے افسوس ہے کہ دیر ہو گئی۔ کل شوٹ ہونے والے سین پر ڈسکس ہو رہی تھی۔ میں ابھی تمہیں کھولتی ہوں۔"

اس نے آئینوں کے سامنے آ کر زیورات اور وگ اتاری۔ چہرے کا میک اپ صاف کیا۔ پھر قمیض کی زپ نیچے سرکا کر لباس اتارنے لگی۔ جب میں سر گھما کر دیکھتا تھا تو وہ نظر آتی تھی۔ اس نے قمیض اتاری۔ اسی وقت بجلی چلی گئی۔ چند لمحوں کے لئے گھپ اندھیرا چھا گیا۔ پھر دور سے اسٹریٹ لائٹ کی روشنی بالکونی سے گزرتی ہوئی آئی۔ اس روشنی سے کمرہ روشن نہیں ہوا لیکن وہ ایک سائے کی طرح دکھائی دینے لگی۔

میں نے اور ذرا سا سر گھمایا تو چونک گیا۔ ایک سایہ باہر سے بالکونی میں آ رہا تھا۔ میں سُپر اسٹار بیوی کو خطرے سے آگاہ کرنے کے لئے بند منہ اور کھلی ناک سے "اوں' اوں" کی آوازیں نکالنے لگا۔ بندھے ہوئے ہاتھوں کو جھٹکے دینے لگا۔ ہتھکڑیاں کھڑکی کی جالیوں سے ٹکرا کر بجنے لگیں۔ وہ بیزار ہو کر بولی۔ "ذرا صبر کرو۔ ابھی کھولتی ہوں۔ دیکھتے نہیں بجلی چلی گئی ہے۔"

بجلی نہیں گئی تھی' کسی نے مین سوئچ آف کیا تھا۔ شاید وہی سوئچ آف کرنے والا بالکونی میں آیا تھا اور اب دبے قدموں سے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں پھر "اوں' اوں" کی آوازیں نکالتا ہوا' ہاتھوں کے جھٹکوں سے ہتھکڑیوں اور جالیوں کو بجانے لگا۔

وہ بولی۔ "توبہ ہے' تم نے پریشان کر دیا ہے۔ ٹھہرو' چارجر لائٹ لے کر آتی ہوں۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی وہ اس کے پیچھے بالکل قریب پہنچ گیا۔ پھر اس نے ایک ہاتھ سے اس کی زلفوں کو مٹھی میں جکڑ کر ایک جھٹکا دیا اور دوسرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے

پستول کی نال اس کی کمر سے لگا دی۔ اس کے بعد وہ غراتی ہوئی آواز میں بولا۔ "خبردار! چیخنے یا کسی کو بلانے کی حماقت کرو گی تو گولی مار دوں گا۔"

میں نے اس سے کہا تھا کہ مجھے یوں قید نہ کرو۔ کوئی بھی حادثہ پیش آ سکتا ہے مگر وہ نہیں مانتی تھی۔ میری بات کو اس گڈریے کا جھوٹ سمجھتی تھی جو خواہ مخواہ چلایا کرتا تھا کہ شیر آیا' شیر آیا' شیر آیا.........

گڈریے کا جھوٹ ایک دن سچ ہوا۔

میں بھی سچا نکلا۔ میری سُپر اسٹار بیوی کی خواب گاہ میں بھی شیر آ گیا تھا۔

☆======☆======☆

وہ خوف سے لرز رہی ہو گی۔ میں سر گھما کر دیکھنے کے باوجود صاف طور سے اندھیرے میں اس کے خوف اور اس کی کپکپاہٹ کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ پستول والے کے ساتھ سائے کی طرح نظر آ رہی تھی۔ پستول والے نے سوال کیا۔ "ابھی تم کسی سے بول رہی تھیں۔ میں نے لوہے سے لوہا ٹکرانے کی آواز سنی ہے؟"

میں پریشان ہو گیا۔ اب وہ میرے متعلق بتانے والی تھی۔ میں بھی پستول کے نشانے پر آنے والا تھا۔ مگر وہ چالاک تھی۔ اس نے دوبارہ قمیض پہنتے ہوئے کہا۔ "میں صبح یہاں سے جاتے وقت اپنے کتے کو زنجیر سے باندھ کر گئی تھی۔ اب وہ مجھے دیکھتے ہی مچل رہا ہے۔ میں اس سے کہہ رہی تھی کہ صبر کرے' ابھی اسے کھولتی ہوں۔"

اجنبی نے کہا۔ "یہ اچھا ہے کہ وہ زنجیر سے بندھا ہوا ہے۔ ورنہ ہم پر حملہ کرتا۔"

وہ "ہم" کہہ رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ تنہا نہیں آیا تھا۔ کوئی اور بھی اس کے ساتھ تھا۔ میں نے پھر سر گھما کر بالکونی کی سمت دیکھا۔ اب وہاں ایک اور شخص کا سایہ نظر آیا۔ وہ بھی آہستہ آہستہ ناجی کے قریب آ رہا تھا۔ ناجی نے پوچھا۔ "تم لوگ کون ہو اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟ میں گھر میں نقدی کم رکھتی ہوں۔ زیورات کے صرف دو سیٹ ہیں۔ باقی سب کچھ بینک کے لاکر میں ہے۔"

پستول والے نے کہا۔ "جو بھی ہے' وہ لے جائیں گے لیکن ہماری آمد کا مقصد کچھ اور ہے۔ تم کنوارے پن کا ریکارڈ توڑ رہی ہو۔ لاکھوں کروڑوں کی زمین' جائیداد کی پیشکش ٹھکرا دیتی ہو مگر کسی سے شادی کے لئے راضی نہیں ہوتی ہو۔"

وہ بولی۔ "یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ مجھے شادی اور جذباتی رشتوں سے ایک ذرا دلچسپی نہیں ہے۔ میں دنیا کی پہلی کنواری نہیں ہوں۔ کتنی ہی عورتیں شادی اور مرد کے بغیر

زندگی گزار دیتی ہیں۔"

"مگر تم ان عورتوں سے مختلف ہو۔ تم نے اپنی فلموں میں ایسی جذباتی اداکاری کی ہے جو ایک کنواری لڑکی نہیں کر سکتی۔ تم نے ایک فلم میں اپنے محبوب کے ساتھ رات گزارنے کی بھرپور اداکاری کی ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ تمہارا کوئی شوہر ہے یا کوئی یار ہے جسے تم برسوں سے چھپا رہی ہو۔ ہم کئی راتوں سے چھپ کر دیکھ رہے ہیں مگر رات کی تاریکی میں کوئی تمہارے پاس چھپ کر نہیں آتا ہے۔"

ناجی نے کہا۔ "پھر تو یقین کر لینا چاہئے کہ میں یہاں تنہا رہتی ہوں۔"

"تنہا نہیں' ایک کتے کے ساتھ رہتی ہو۔ تعجب ہے کہ وہ کتا ہم اجنبیوں کو دیکھ کر نہیں بھونک رہا ہے۔ پہلے زنجیر ہلاتا رہا پھر خاموش اور پُرسکون ہو گیا۔ اب زنجیر بھی نہیں ہل رہی ہے۔ میرا باس فلیش لائٹ کے ساتھ کیمرہ لے کر آیا ہے۔ وہ اس کوٹھی میں پائے جانے والے انسانوں اور کتوں کی تصویریں اتارے گا۔"

ناجی نے کہا۔ "مجھے یہ بتا دو' تمہیں تصویریں اتار کر اور میری ذاتی زندگی میں جھانک کر کیا مل جائے گا؟"

"کیا یہ کم ہو گا کہ ہم ایک سپر اسٹار ہیروئن کی ذاتی زندگی کے رازدار بن جائیں گے۔ ابھی تم اپنے کتے سے باتیں کرتے ہوئے کہہ رہی تھیں کہ چارجر لائٹ آن کر کے اسے کھولو گی۔ چلو چارجر لائٹ لے کر آؤ اور اسے آن کرو۔"

وہ ایک پستول کے آگے بے بس تھی اور ان کے احکامات کی تعمیل پر مجبور تھی۔ وہ نیم تاریکی میں چلتی ہوئی ایک جگہ پہنچی' جہاں چارجر رکھا ہوا تھا۔ وہ اسے آن کرنا چاہتی تھی۔ اجنبی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "نہیں' اس کی روشنی ہم پر نہیں پڑے گی' ہم اندھیرے میں رہیں گے۔ تمہارے اور کتے کے لئے روشنی ضروری ہے۔"

اس نے چارجر لائٹ کو اپنے قبضے میں لے کر اسے آن کیا۔ کمرہ بڑی حد تک روشن ہو گیا۔ ناجی صاف طور سے اس کی روشنی میں نظر آنے لگی۔ پھر وہ لائٹ ایک طرف سے دوسری طرف گھومنے لگی۔ اب میں چھپ نہیں سکتا تھا۔ وہ لوگ کمرے کی ایک ایک چیز پر روشنی پھینک رہے تھے پھر اس کا دودھیا اجالا اس کھڑکی پر آ کر تھم گیا' جہاں میں بندھا ہوا تھا۔

اب میں سر گھما کر نہیں دیکھ رہا تھا۔ اپنا رُخ تاریک کمرے کی طرف کیا تھا تاکہ ان سے منہ چھپا سکوں۔ پہلے تو انہوں نے حیرانی سے ایک بندھے ہوئے مرد کو دیکھا۔ پھر وہ

قہقہے لگانے لگے۔ پستول والے نے کہا۔ "ارے باس' یہ تو انسانی نسل کا کتا ہے۔ آخر ہم نے یہ بھید پا لیا کہ یہ کتا میڈم ناجی کو دنیا کی نظروں میں کنوارا بنائے رکھتا ہے۔"

وہ ناجی کو دھکے دیتے ہوئے اس کمرے میں لائے جہاں میں قید تھا۔ وہ کمرہ چھوٹے اسٹور روم جیسا تھا اس لئے روشنی پورے کمرے میں پھیل رہی تھی۔ وہ دونوں چارجر لائٹ کے پیچھے تھے اس کے باوجود ان کی ذرا ذرا سی جھلک مل رہی تھی۔

پستول والے نے جسے باس کہا تھا' وہ ایک ایسے رومن راہب کے لبادے میں تھا' جو رومن تاریخ میں مجرم کو سزائے موت دینے کے لئے سر سے لبادہ اوڑھ کر چہروں کو لبادوں سے اس طرح ڈھانپ لیتے تھے کہ سانس لینے کے لئے صرف ناک اور ہونٹ لبادے کے سائے میں جھلکتے تھے۔ اس طرح چار چھ راہب پُراسرار اور ہیبت ناک بن کر مجرم کو اپنے درمیان لے کر مقتل کی طرف جاتے تھے۔

میرے کمرے میں آنے والا وہ باس اسی زمانہ قدیم کا رومن راہب لگ رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک کیمرہ تھا جس سے فلیش لائٹ منسلک تھی۔ پستول والے نے ناجی سے کہا۔ "تم نے یہاں کتنی زبردست فلمی سچویشن بنائی ہے۔ ایک مرد کو ہتھکڑیاں پہنا کر قیدی بنایا ہے تاکہ وہ بھاگ نہ سکے۔ اس کے منہ پر ٹیپ چپکا دیا ہے تاکہ وہ چیخنے پکارنے سے محروم رہے۔ اب تم اس کے پاس جاؤ۔ اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر جذباتی پوز بناتی رہو۔ ہمارا باس ہر پوز کی تصویر اتارتا رہے گا۔"

ناجی نے کہا۔ "میں ایسا نہیں کروں گی۔ یہ میرا ملازم ہے' میرا سیکرٹری ہے۔"

"یہی تو مزے کی بات ہے۔ دنیا دیکھے گی کہ تم کس طرح اپنے ملازم کو بے بس قیدی بنا کر اپنے جذبات کی آگ بجھاتی ہو اور دنیا کے سامنے کنواری بن کر رہتی ہو۔"

وہ بولی۔ "مجھے اتنا بتا دو کہ تمہارا باس خاموش کیوں ہے؟ اور یہ مجھے بدنام کیوں کرنا چاہتا ہے؟"

"ہم تمہیں بدنام نہیں کریں گے۔ تم ہمارے مطالبات پورے کرتی رہو گی تو تصویریں دنیا والوں کے سامنے نہیں آئیں گی۔"

"تمہارے مطالبات کیا ہیں؟ میں ہر مطالبہ مان لوں گی لیکن کسی مطالبے میں بے حیائی ہو گی تو اسے تسلیم نہیں کروں گی۔"

"باس تم سے شادی کا مطالبہ نہیں کرے گا اور نہ ہی شادی کے بغیر اپنی خوابگاہ میں تمہیں بلائے گا۔ یہ ایک فلم بنانا چاہتا تھا۔ وہ فلم تقریباً پچاس لاکھ روپے میں مکمل ہو گی۔"

تم نے انڈسٹری میں بڑا مال کمایا ہے۔ اس لئے تم پچاس لاکھ لگاؤ گی۔ فلم ساز کی حیثیت سے ہمارے باس کا نام ہو گا۔ اگر فلم ہٹ ہو گی تو تمہارے پچاس لاکھ تمہیں واپس مل جائیں گے۔ ورنہ رقم ڈوب جائے گی۔"

ناجی نے کہا۔ "رقم ڈوب جائے یا واپس مل جائے مجھے یہ مطالبہ منظور ہے۔ اس کے لئے مجھے بلیک میل کرنا ضروری نہیں ہے۔ تمہارے باس سے پکے کاغذ پر کاروباری معاہدہ ہو سکتا ہے۔"

"معاہدے کی بات نہ کرو۔ وہ کسی وجہ سے کھٹائی میں پڑ سکتا ہے۔ جب ہم یہاں سے پکا کام کر کے جا سکتے ہیں تو پھر کچا کام کیوں کریں۔ اتنی بڑی سپر اسٹار ہو۔ تمہاری کمزوری ہمارے ہاتھوں میں رہے گی تو تم کسی معاہدے کے بغیر تابعدار رہو گی اور ہم ایسے کم ظرف نہیں ہیں کہ تم اپنی شہرت اور دولت سے ہمیں فائدے پہنچاتی رہو گی تو ہم خواہ مخواہ تمہاری جذباتی تصاویر شائع کرائیں گے۔ ایسا کرنے سے ہمارا بھی نقصان ہو گا۔"

ناجی نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ "تمہاری یہ بات دل کو لگتی ہے کہ مجھ سے فائدے پہنچتے رہیں گے تو تمہارا باس مجھے کبھی نقصان پہنچانے کی نادانی نہیں کرے گا۔"

"تو پھر شروع ہو جاؤ۔ اپنے ملازم سے جذباتی وابستگی دکھاؤ۔ ہم تصویریں اتاریں گے۔ یاد رکھو تمہاری اداکاری سچی اور جذباتی ہو۔"

ناجی نے میرے پاس آ کر میری گردن میں بانہیں ڈال دیں۔ میرے ہاتھ پیچھے کھڑکی کی جالی سے ہتھکڑیوں کے ذریعے بندھے ہوئے تھے اور منہ پر ٹیپ لگا ہوا تھا۔ میں بڑی بے بسی سے دیکھ رہا تھا اور وہ گلے لگ کر بڑے جذباتی انداز میں مسکرا رہی تھی۔ ایسے ہی وقت فلیش لائٹ بجلی کی طرح چمک کر بجھ گئی۔

ناجی نے میرے سر کے بالوں کو دونوں مٹھیوں میں جکڑ کر میرے چہرے کو اپنے چہرے پر جھکایا۔ پھر میرے ہونٹوں پر لگے ہوئے ٹیپ کو چومنے کا انداز اختیار کیا۔ پھر فلیش لائٹ چمک کر بجھ گئی۔ وہ اسی طرح کئی جذباتی پوز بناتی رہی اور تصویریں اترتی رہیں۔

وہ تمام تصویریں آئندہ یہی ظاہر کرتیں کہ ایک سُپر اسٹار مالکن اپنے ملازم کے ساتھ گناہ کی مرتکب ہو رہی ہے۔ ان تصویروں کے پیشِ نظر حدود آرڈیننس کے مطابق ہم دونوں کو سنگسار کیئے جانے کی سزا ملتی۔

لیکن شاید مجھے سزا نہ ملتی۔ کیونکہ میں بندھا ہوا تھا۔ ایک سُپر اسٹار مالکن مجھے بے بس کر کے ایسی شرمناک حرکتیں کر رہی تھی لہٰذا سزا کی مستحق صرف وہی ہوتی۔

میری مجبوری اور مظلومیت مجھے بچا لیتی۔ وہ دشمن جو تصویریں اتار رہے تھے' انہوں نے شاید اس پہلو پر توجہ نہیں دی تھی کہ وہ مجھ سے نہیں صرف ناجی سے دشمنی کر رہے تھے۔

کوئی تیس پینتیس تصویریں کیمرے میں محفوظ ہو گئیں۔ پھر پستول والے نے کہا۔

"ہم ابھی جا رہے ہیں۔ پہلے ان تصویروں کو پرنٹ کر کے دیکھیں گے کہ یہ ہمارے حسبِ منشا ہیں یا نہیں؟ اگر یہ ہمارے کام کی ہوئیں تو کل صبح دس بجے تک فون کریں گے۔ اپنا پتا بتائیں گے۔ تم اپنے کتے کو یہیں چھوڑ کر تنہا آؤ گی۔ پھر ہم دوستانہ ماحول میں کاروباری باتیں کریں گے۔"

وہ دونوں چارجر لائٹ لے کر بالکونی تک گئے پھر لائٹ کو بجھا کر بالکونی سے کود کر تاریکی میں گم ہو گئے۔ پھر دو منٹ کے بعد ہی بجلی آ گئی۔ وہ مین سوئچ آن کر کے گئے تھے۔ ناجی نے میری ہتھکڑیاں کھول دیں۔ ہاتھوں کے آزاد ہوتے ہی میں نے اپنے ہونٹوں پر سے ٹیپ ہٹایا پھر کہا۔ "میں ایسے ہی بُرے وقت کے لئے سمجھاتا تھا کہ مجھے قیدی بنا کر نہ جاؤ۔ اگر میں آزاد رہتا تو ان دونوں کی اچھی طرح پٹائی کر کے انہیں پولیس کے حوالے کر دیتا۔"

"مجھے پتا ہے تم کتنے دلیر ہو۔ جاؤ دلاور خان کی خبر لو۔ وہ دلیر ہے لیکن اس کے ساتھ ضرور کوئی گڑبڑ کی گئی ہے۔"

میں نے مین گیٹ کے پاس آ کر دیکھا۔ ناجی کا خیال درست تھا۔ وہ آہنی گیٹ کے ساتھ والے کیبن میں بے ہوش پڑا تھا۔ باورچی اور اس کی بیوی بھی پیچھے والے کوارٹر میں غافل پڑے ہوئے تھے۔ ان سب کو ہوش میں لایا گیا۔ ناجی نے انہیں بلا کر کہا۔

"یہاں کچھ بدمعاش آئے تھے انہوں نے تمہارے ساتھ ایسا سلوک کیا ہے۔ بہرحال یہ بات یہیں تک رکھو۔ کسی سے ذکر نہ کرو ورنہ ہمارے لئے مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ جاؤ گیٹ پر تالا لگا کر بے فکری سے سو جاؤ۔ اب کوئی واردات نہیں ہو گی۔"

وہ تینوں چلے گئے۔ ناجی نے مجھ سے کہا۔ تم بھی جاؤ۔"

"اتنی بڑی واردات ہو گئی اور مجھے جانے کے لئے کہہ رہی ہو۔ وہ لوگ تم سے پچاس لاکھ روپے فلم سازی کے بہانے وصول کریں گے۔"

"یہ میں بھی جانتی ہوں۔ کوئی ایسی تدبیر بتاؤ کہ اتنی بڑی رقم میرے اکاؤنٹ سے نہ نکلے اور اگر کوئی تدبیر نہیں بتا سکتے تو پھر جا کر سو جاؤ۔ جو ہو چکا ہے' صرف اس کا ذکر کرو

گے تو سر کا درد بڑھے گا۔ پلیز دردِ سر نہ بنو جاؤ یہاں سے۔"

رسی جل گئی مگر بل نہیں گئے۔ وہ اب بھی مالکن کے لہجے میں بول رہی تھی۔ میں اسے دل ہی دل میں گالیاں دیتا ہوا اپنے کمرے میں آ گیا۔ مجھے اس پہلو سے اطمینان تھا کہ ان تصاویر سے میرا کچھ نہیں بگڑے گا لیکن یہ سوچ کر کلیجے پر چھریاں چل رہی تھیں کہ بلیک میلر پچاس لاکھ روپے لے جائیں گے۔ اتنی بڑی رقم کسی طرح میرے ہاتھ لگ جاتی تو میں غلامی سے نجات حاصل کر کے خود ایک فلم پروڈیوس کرتا اور ناجی کو ہیروئن لیتا تو خوابگاہ کے باہر آئندہ کوئی مجھے ناجی کا ملازم نہیں ناجی کا فلم پروڈیوسر کہتا۔

میں ایسا سوچ سکتا تھا اور دل کو بہلا سکتا تھا۔ پچاس لاکھ روپے کوئی چھوٹی سی رقم نہیں ہوتی۔ یہ صرف خیالوں اور خوابوں میں ملتی ہے۔ میں جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھتے دیکھتے سو گیا۔

☆======☆======☆

دوسرے دن انہوں نے وعدے کے مطابق دس بجے فون کیا۔ ناجی کو اپنا نام اور پتا بتایا اور یقین دلایا کہ اب وہ دوست ہیں اور اس سے دوستانہ ماحول میں گفتگو کریں گے۔ ناجی نے کہا کہ وہ آدھے گھنٹے میں مذکورہ پتے پر پہنچ جائے گی۔

وہ ریسیور رکھ کر جانے لگی۔ میں نے کہا۔ "تم تنہا جا رہی ہو' مجھے کم از کم ان کا نام اور پتا بتا دو۔ اب وہ اندھیرے میں اور راہب والے لبادے میں نہیں چھپیں گے۔"

وہ بولی۔ "ہاں وہ جیسی تصویریں چاہتے تھے' ویسی حاصل ہو گئی ہیں۔ اب وہ دوست بن گئے ہیں۔ تمہیں یاد ہے' چار ماہ پہلے فلم ساز طارق مجید کی فلم فلاپ ہوئی تھی اور وہ دیوالیہ ہو گیا تھا۔ اب وہ نقصان پورا کرنے اور آئندہ سپرہٹ فلم بنانے کے لئے مجھ سے پچاس لاکھ روپے وصول کرنا چاہتا ہے۔ میں اتنی بڑی رقم دینے کے بعد اس کی فلم میں مفت ہیروئن کا رول ادا کرنے پر بھی مجبور ہو جاؤں گی۔ بہرحال میں اس سے ملنے جا رہی ہوں۔"

وہ کار میں بیٹھ گئی۔ میں تیزی سے چلتا ہوا اپنے کمرے میں آیا۔ ریوالور نکال کر میں نے اسے لوڈ کیا۔ پھر اسے لباس میں چھپایا اور سائیلنسر کو جیب میں رکھا۔ پھر کوٹھی کے باہر آ کر ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر طارق مجید کی کوٹھی کی طرف چل پڑا۔ کل تک پچاس لاکھ روپے محض خواب تھے۔ اب یہ حقیقتاً حاصل ہو سکتے تھے۔ میں کئی بار طارق مجید کی کوٹھی میں جا چکا تھا۔ اس کی تین فلمیں فلاپ ہو چکی تھیں۔ یکے بعد دیگرے دو بیویوں کو طلاق

دے چکا تھا۔ اس کوٹھی میں دن کو ویرانی رہتی تھی۔ شام کو شراب و کباب کی محفلیں جمتی تھیں۔ وہ بندہ خوب پینے اور جوا کھیلنے اور کھلانے کا شوقین تھا۔

چونکہ یہ سب رات کو جاگنے کے دھندے ہیں اس لئے کوٹھی کا اکلوتا ملازم بھی رات کو ان کی خدمت کے لئے جاگتا تھا اور دن کو اپنے کوارٹر میں سونے کے لئے چلا جاتا تھا۔ میں اس کے کوارٹر میں آیا۔ گرمی کی وجہ سے وہ دروازہ کھول کر سو رہا تھا۔ میں نے کھونٹی پر لٹکے ہوئے لباس میں چابیاں تلاش کیں۔ پھر تکیے کے نیچے دیکھا۔ چابیوں کا ایک گچھا مل گیا۔ وہ بے خبر سو رہا تھا میں نے کمرے کے دروازے کو باہر سے بند کر دیا۔ اب وہ آنکھ کھلنے پر اچانک کوٹھی میں نہیں آ سکتا تھا۔

میں نے کچن کا پچھلا دروازہ کھولنے کے لئے کئی چابیاں آزمائیں۔ ایک چابی سے دروازہ کھل گیا۔ میں نے اندر آ کر دروازے کو بند کر دیا۔ پھر دبے قدموں چلتا ہوا ایک بیڈ روم میں آیا۔ قریب ہی ڈرائنگ روم سے ناجی اور طارق مجید کی دھیمی دھیمی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ گفتگو میں مصروف تھے۔ میں نے اس شخص کی بھی آواز پہچان لی جو پچھلی رات پستول لے کر ناجی کی خوابگاہ میں آیا تھا۔

میں نے لباس کے اندر سے ریوالور نکالا۔ جیب سے سائیلنسر نکال کر ریوالور میں لگایا۔ پھر دروازے کے پردے کے پیچھے چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ پتا نہیں' وہ کیا باتیں کر رہے تھے۔ مجھے معلوم کرنا چاہئے تھا کہ ان کے درمیان کیا معاملات طے پا رہے ہیں؟ میں پردے کے پیچھے سے نکل کر خواب گاہ کے باہر آیا۔ ایک کاریڈور کے دوسری طرف ڈرائنگ روم کا دروازہ تھا۔ میں نے کھلے ہوئے دروازے سے لگ کر سنا۔ ناجی کہہ رہی تھی۔ "میں رقم لگانے کو تیار ہوں مگر آپ میری دو باتیں مان لیں۔ ایک تو معاہدہ کریں کہ ہم دونوں پارٹنر ہیں۔ میں رقم دینے والی پارٹنر ہوں اور آپ ورکنگ پارٹنر ہیں۔ اگر فلم فلاپ ہو گی تو رقم میری ڈوبے گی۔ نقصان میں برداشت کروں گی۔ فلم سپرہٹ ہو گی تو منافع میں تم برابر کے شریک رہو گے۔"

طارق مجید کی آواز آئی۔ "میڈم! تم اپنا اطمینان کرنا چاہتی ہو۔ کوئی بات نہیں یہ تحریری معاہدہ کل ہو جائے گا اور کل ہی تم بینک سے رقم نکال کر لاؤ گی۔ ہم چیک نہیں' پورے پچاس لاکھ نقد لیں گے۔"

دوسرے کی آواز آئی۔ "ہمارے مجید صاحب آپ کی ہر طرح سے تسلی کریں گے۔ آپ دوسری کون سی بات منوانا چاہتی ہیں؟"

وہ بولی۔ "تم پچھلی رات اپنے باس کے ساتھ آئے تھے۔ اس نے لبادے میں خود کو چھپا رکھا تھا لیکن اب تو ہم سب دوست اور بزنس پارٹنر بن رہے ہیں۔ اس لئے باس کو مجھ سے چھپنا نہیں چاہئے۔ اس لئے کل معاہدہ کرتے وقت اصل باس کی موجودگی ضروری ہے۔"

دوسرے کی آواز آئی۔ "میڈم! کل آپ نے دیکھا تھا کہ وہ تمام وقت خاموش تھا۔ دراصل وہ گونگا ہے۔ معاہدے کے وقت اس کی موجودگی اور عدم موجودگی برابر ہوگی۔"

"وہ بول نہیں سکے گا لیکن معاہدے پر دستخط کر سکے گا یا انگوٹھا لگا سکے گا۔"

طارق مجید نے کہا۔ "اوئے گامے! میڈم سے بحث نہ کر۔ ٹھیک ہے میڈم! کل ہم اپنے گونگے باس کو بھی لے آئیں گے اور حکم کریں۔"

"میں اپنی اور سیکرٹری کی تصویریں دیکھنا چاہوں گی۔"

"ضرور ضرور میں ابھی لا کر دکھاتا ہوں۔"

میں دبے قدموں تیزی سے چلتا ہوا پھر اسی خوابگاہ میں آیا اور دروازے کے پردے کے پیچھے چھپ گیا۔ چند لمحوں کے بعد کوئی دروازہ کھول کر آیا۔ میں نے ایک ذرا سا جھانک کر دیکھا۔ وہ طارق مجید تھا۔ ایک الماری کھول رہا تھا۔ پھر اس نے الماری کے اندرونی دراز کو کھول کر ایک لفافہ نکالا پھر اسے لے کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

وہ الماری پہلے بھی مقفل نہیں تھی۔ صرف اس کے پٹ لگے ہوئے تھے۔ طارق مجید کو اطمینان تھا کہ دن کے وقت کوئی چور نہیں آئے گا۔ پھر یہ کہ کوٹھی کے پچھلے دروازے بھی مقفل تھے۔ میں نے خواب گاہ کے دروازے کو اندر سے بند کیا۔ تیزی سے آ کر الماری اور دروازے کو کھول کر دیکھا۔ وہاں میری اور ناجی کی کئی تصویریں بکھری پڑی تھیں۔ ایک لفافہ بھی تھا۔ اسے کھول کر دیکھا' وہ نیگیٹو تھے۔ میں نے ایک آدھ نیگیٹو کو دیکھا وہ ہماری ہی تصویروں کے تھے۔

میں نے لفافے کو جیب میں رکھا دراز کے اندر بکھری ہوئی تمام تصویروں کو سمیٹ کر انہیں ایک لفافے میں رکھا۔ اس لفافے کو قمیض اور بنیان کے اندر ٹھونس لیا۔ وہاں ہمارے خلاف اور کوئی ثبوت نہیں تھا۔ میں دراز اور الماری کو بند کر کے پھر پردے کے پیچھے آ گیا۔ ایک اندازہ تھا کہ ناجی ان تصویروں کو دیکھنے کے بعد یقین کر لے گی کہ بلیک میلر طارق مجید کے دام میں پوری طرح آ گئی ہے۔ پھر وہ کل بینک سے رقم نکالنے کا وعدہ کر کے چلی جائے گی۔

میں بڑی دیر تک کھڑا رہا اور سوچتا رہا۔ میں بچپن سے فلم انڈسٹری میں رہا ہوں۔ تصویروں اور لائٹ اینڈ شیڈ کے ایک ایک نکتے اور زاویے کو سمجھتا ہوں اور یہ بھی جان لیتا ہوں کہ کون سا فوٹوگرافر اسٹل کیمرے سے کس معیار کی تصویریں اتارتا ہے۔ اپنی اور ناجی کی تصویریں دیکھ کر اچانک مجھے انڈسٹری کا ایک گونگا فوٹوگرافر انصاری یاد آ گیا۔ وہ اپنے فن میں بڑا ماہر تھا۔ فلموں کے بہترین فوٹو سیٹ تیار کرتا تھا۔ اب یہ بات سمجھ میں آ رہی تھی کہ پچھلی رات اس گونگے کو راہب کے لبادے میں چھپا کر لایا گیا تھا۔ تاکہ وہ ہر زاویے سے عمدہ تصویریں اتار سکے۔ اس کے ساتھ آنے والا گامے ہاتھ میں پستول لئے ہوئے تھا اور ہمارے سامنے اس گونگے فوٹوگرافر کو باس کہہ رہا تھا۔

کوٹھی کے باہر کار اسٹارٹ ہونے پھر وہاں سے جانے کی دھیمی سی آوازیں سنائی دیں۔

تھوڑی دیر بعد طارق مجید اور گامے کی باتیں کرنے کی آوازیں قریب آنے لگیں۔ طارق مجید دروازہ کھول کر خواب گاہ میں داخل ہوتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "گامے! تیرا جواب نہیں ہے۔ کل تُو نے گونگے سے اچھا کام لیا ہے۔ یہ بھی اچھا ہی کیا کہ اسے ہمیشہ کے لئے راستے سے ہٹا دیا ہے۔ اگر اسے قتل نہ کیا جاتا تو وہ کسی کے بھی سامنے ہمارا راز اگل سکتا تھا۔"

طارق مجید پلنگ کے سرے پر بیٹھ گیا۔ گامے نے تصویروں والا لفافہ اسے دیتے ہوئے کہا۔ "یہ تصویریں دیکھ کر ناجی کو یقین ہو گیا ہے کہ ہم نے پکا کام کیا ہے لیکن مجید صاحب' وہ معاہدہ کرنے کے وقت گونگے باس کی موجودگی چاہتی ہے۔"

طارق مجید نے کہا۔ "میں تو نہیں چاہتا تھا کہ کوئی تیسرا ہمارا رازدار بنے لیکن پچاس لاکھ روپے حاصل کرنے کے لئے کچھ تو کرنا ہی ہو گا۔ یہ کام بھی تم ہی کرو۔ اپنے کسی خاص بندے کو گونگا باس بنا کر لے چلو۔ پھر ناجی سے رقم وصول کرنے کے بعد گونگے فوٹوگرافر کی طرح اس بندے کو بھی ٹھکانے لگا دو۔"

میں نے پردے کے پیچھے سے نکل کر کہا۔ "بڑی اچھی پلاننگ ہے۔"

وہ دونوں ایسے اچھل کر کھڑے ہو گئے جیسے بجلی کا جھٹکا پہنچا ہو۔ وہ سہمی ہوئی نظروں سے سائیلنسر لگے ہوئے ریوالور کو دیکھ رہے تھے۔ میں نے کہا۔ "پچاس لاکھ روپے.........."

یہ کہتے ہی میں نے گامے کو گولی مار دی۔ طارق مجید پیچھے جا کر الماری سے لگ گیا۔

خوف سے لرزتے ہوئے بولا۔ "آ .... آپ جمی صاحب! مم .... میری ایک بات سن لیں۔ یہ پچاس پیسوں کا نہیں' پچاس لاکھ روپے کا معاملہ ہے۔ آ .... آپ چاہیں تو ہم دونوں پارٹنر بن سکتے ہیں۔ اگر آپ میڈم کو بلیک میلنگ سے بچانے آئے ہیں تو غلطی کر رہے ہیں۔ اتنی بڑی رقم پھر کبھی ہاتھ نہیں آئے گی۔ ہم دونوں بھائی مل کر..........."

میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ "دونوں نہیں' ایک صرف ایک۔ جب میں اتنی بڑی رقم کا تنہا مالک بن سکتا ہوں تو تمہارے جیسے کچرے کو ساتھ کیوں رکھوں؟ تم بھی جہنم میں جاؤ۔"

میں نے اسے بھی گولی مار دی۔ بلیک میل کرنے والوں کی ایک پوری ٹیم نابود ہو گئی تھی۔ اب بازی میرے ہاتھوں میں تھی۔ میں نے طارق مجید کی لاش کے پاس پڑے ہوئے لفافے کو اٹھا کر دیکھا اس کے اندر بھی میری اور ناجی کی تصویریں تھیں۔ میں انہیں جیب میں رکھ کر وہاں سے چلا آیا۔

اب ارادہ تھا کہ تصویروں کو اور نیگیٹو کو حفاظت سے لاکر میں رکھ دیا جائے۔ ناجی کو معلوم نہ ہو کہ بلیک میلنگ کی تمام چیزیں میرے قبضے میں ہیں۔ معلوم ہو گا تو وہ مجھ سے ان کا مطالبہ کرے گی۔ میں نہیں دوں گا تو وہ مجھے پھر کوٹھی سے نکال دے گی۔ پچاس لاکھ دینے سے انکار کرے گی۔ یہ بیان بھی دے سکتی ہے کہ میرے کرائے کے بدمعاشوں نے مجھے ہتھکڑیوں سے باندھا تھا اور ناجی کو گن پوائنٹ پر رکھ کر ایسی تصویریں اتاری تھیں۔

اس سے وصولی کا یہ طریقہ مناسب ہوتا کہ میں ایک نامعلوم بلیک میلر بن کر اس سے رقم وصول کرتا اور دوسری طرف ایک تابعدار شوہر اور وفادار ملازم بن کر یہی ظاہر کرتا کہ ان تصویروں میں' میں بھی ہوں اور میں بھی اس کے ساتھ دنیا والوں کے سامنے بدنام ہو سکتا ہوں۔

اور یہ کہ اس سے پچاس لاکھ روپے وصول کرتے وقت کوئی گڑبڑ بھی ہو سکتی تھی۔ ناجائز طریقے سے جتنی بڑی کامیابی حاصل ہونے والی ہوتی ہے اتنے ہی زیادہ خطرات کے اندیشے بھی ہوتے ہیں اس لئے میں نے ہر پہلو پر نظر رکھی کہ کہیں سے کوئی دھوکا نہ ہو۔ طارق مجید اور گامے نے پچاس لاکھ حاصل کرنے کا زبردست منصوبہ بنایا تھا۔ اس منصوبے میں وہ تقریباً کامیاب ہو چکے تھے لیکن مجھے محض ایک ملازم سمجھ کر انہوں نے ناجی کو اپنی کوٹھی میں بلایا تھا۔ مجھے بھی اس کے ساتھ آنے کے لئے کہتے تو میں چھپ کر نہ آتا اور وہ ابھی زندہ اور کامیاب رہتے۔

بہرحال میں نے شام تک اپنے ایک منصوبے ۔۔، ہر پہلو پر اچھی طرح غور کیا پھر فون پر ناجی سے رابطہ کیا۔ وہ بولی۔ "ہیلو کون ہے؟"

میں نے آواز اور لہجے میں ذرا سی تبدیلی کی پھر کہا۔ "پچھلی رات آنے والا باس گونگا نہیں تھا۔ ابھی تم سے بول رہا ہے۔"

وہ بولی۔ "تعجب ہے پھر تم گونگے کیوں بنے رہے؟"

"تمہارے اس سوال کا جواب پھر کبھی دوں گا۔ ابھی تمہارے لئے ایک اہم اطلاع ہے کہ میں نے طارق مجید اور اس کے چمچے کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ لہٰذا اب پچاس لاکھ روپے کا تنہا حق دار ہوں۔"

وہ بولی۔ "رقم اسی کو ملے گی' جس کے پاس میری تصویریں ہوں گی۔"

میں نے کہا۔ "پولیس والوں کو اس کوٹھی میں طارق مجید اور گامے کی لاشیں ملیں گی لیکن تمہاری اور سیکرٹری کی تصویریں اور نیگیٹو نہیں ملیں گے۔ وہ تمام اہم چیزیں میرے پاس ہیں۔"

"کیا واقعی تم نے طارق مجید کو قتل کر دیا ہے۔"

"ہاں اسے بھی اور اس کے دستِ راست گامے کو بھی۔ تم ابھی کسی فلم ساز یا ہدایت کار سے فون پر بات کرو۔ شاید تمام اسٹوڈیوز میں اس واردات کی خبر پھیل گئی ہو گی۔"

"میں وہ رقم تمہیں کہاں پہنچاؤں گی؟"

"میں خود تمہاری خواب گاہ میں آؤں گا۔ کل رات نو بجے سے پہلے اپنے تمام ملازموں اور پٹھان چوکیدار کو چھٹی دے دو اور تمہارے اس سیکرٹری کو بھی وہاں نہیں ہونا چاہئے۔ پہلے میں یقین کروں گا کہ تم کوٹھی میں اکیلی ہو پھر دس بجے آ جاؤں گا۔"

"میں یہاں تنہا پوری رقم کے ساتھ رہوں گی لیکن جو تصویریں اتاری گئی ہیں ان میں سے کوئی ایک تصویر اور ایک نیگیٹو ثبوت کے طور پر لاؤ گے۔ اس طرح مجھے یقین ہو گا کہ تمہارے سوا کوئی اور مجھے بلیک میل نہیں کرے گا۔"

"ٹھیک ہے' ایک تصویر اور ایک نیگیٹو ساتھ لاؤں گا۔ کل رات دس بجے تمہیں اپنی کوٹھی میں بالکل تنہا رہنا چاہئے۔"

یہ کہہ کر میں نے رابطہ ختم کر دیا۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ یہ دھڑکن کسی گھبراہٹ سے نہیں' پچاس لاکھ روپے حاصل کرنے کی خوشی کے باعث تھی۔

اس رات میں نے کوٹھی میں آ کر ناجی سے کہا۔ "لائٹ مین چمن بھائی کی شادی گوجرانوالہ میں ہو رہی ہے۔ کتنے ہی دوست ضد کر رہے ہیں کہ میں بھی کل صبح ان کے ساتھ چلوں۔"

"تو پھر چلے جاؤ۔ مگر رات کو واپس نہ آنا۔ وہ بلیک میلر یہاں آئے گا۔ اس نے کہہ دیا ہے کہ کوٹھی میں تمہیں یا کسی بھی ملازم کو نہیں رہنا چاہئے۔"

میں نے حیرانی ظاہر کرتے ہوئے پوچھا۔ "تم یہاں تنہا رہو گی' اگر انہوں نے تمہیں جانی نقصان پہنچایا تو؟"

"جب میں مطالبہ پورا کروں گی تو وہ مجھے نقصان نہیں پہنچائے گا' تم فکر نہ کرو۔"

میں نے دوسری صبح ایک بڑے سے بیگ میں ایک جوڑا لباس اور ضرورت کا کچھ سامان رکھ کر ناجی سے ملاقات کی۔ وہ بھی باہر جانے کے لئے تیار ہو رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ بینک جا کر پچاس لاکھ لانے والی ہے۔ میں نے پوچھا۔ "اگر تم کہو تو میں رک جاؤں۔"

"کیا تمہارے یہاں رہنے سے مصیبت ٹل جائے گی؟"

میں نے سر جھکا کر کہا۔ "ہماری کمزوریاں بلیک میلر کے ہاتھوں میں ہیں۔ کوئی اور بات ہوتی تو میں اس کمینے کو زندہ نہ چھوڑتا۔"

"اچھا جاؤ۔ زیادہ ڈینگیں نہ مارو۔ میں بہت اپ سیٹ ہوں۔"

میں وہاں سے چلا آیا۔ وہ بیوی نہیں ہٹلر تھی۔ ایسے بولتی تھی جیسے جھڑک رہی ہو۔ میں مجبوراً اسے اپنی ان داتا سمجھ کر برداشت کرتا تھا۔ ویسے آج رات مقدر بدلنے والا تھا۔ آئندہ میں فلم ساز بن جاؤں گا اور وہ میری فلم کی ہیروئن بنے گی۔ پھر فلم میک اپ میں روپ بدل کر ایک نئی دوشیزہ دکھائی دے گی تو میں حکم دوں گا کہ آج کی شوٹنگ کینسل کرتا ہوں۔ اسی روپ بہروپ کے ساتھ میری خوابگاہ میں آؤ۔

شیخ چلی بھی ایسے ہی خواب دیکھتا تھا لیکن میں نے خواب کو حقیقت میں بدلنے کے انتظامات کر لئے تھے۔ سب سے پہلے تصویروں اور ان کے نیگیٹو کو بینک کے لاکر میں حفاظت سے رکھنا تھا لیکن وہاں پہنچا تو بہت سے پولیس والے نظر آئے۔ وہ بھیڑ لگانے والوں کو دور بھگا رہے تھے۔ پتا چلا کہ بینک میں ڈاکہ پڑا ہے۔ اندر کسی کو جانے کی اجازت نہیں دی جا رہی تھی۔

میں نے ایک ہوٹل میں آ کر ایک کمرہ حاصل کیا۔ اب وہ تصاویر اور نیگیٹو لاکر میں نہیں رکھے جا سکتے تھے۔ میں نے انہیں اپنے لباس کے اندر چھپا کر رکھا۔ پھر وہاں سے

لنڈے بازار آیا۔ وہاں سے موٹے کھدر کے کپڑے خریدے۔ سوئی اور دھاگے وغیرہ خریدے پھر ہوٹل کے کمرے میں آ کر دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ دروازے کے باہر ایک ٹیگ لگا دیا جس پر لکھا تھا۔ "پلیز ڈونٹ ڈسٹرب" (برائے مہربانی مداخلت نہ کریں)۔

پھر میں اطمینان سے پلنگ پر بیٹھ کر کپڑے' قینچی اور سوئی دھاگے نکال کر زمانہ قدیم کے رومن راہب کا ایک لبادہ تیار کرنے لگا۔

وہ گونگا فوٹوگرافر پچھلی رات ایسے ہی ایک لبادے میں لایا گیا تھا۔ وہ بیچارہ باس کہلانے والا قتل کر دیا گیا اور اسے قتل کرنے والوں کو میں نے قتل کر دیا تھا لیکن ناجی کو یہی معلوم تھا کہ وہ لبادے میں منہ چھپانے والا باس زندہ ہے۔

میں درزی نہیں تھا مگر کسی حد تک سلائی کا کام آتا تھا۔ میں نے ویسا ہی ایک لبادہ تیار کر لیا۔ اسے قدِ آدم آئینے کے سامنے پہن کر دیکھا اور خوش ہوا کہ بالکل وہی چیز تیار ہو گئی۔ اسے پہننے کے بعد صرف جسم ہی نہیں' سر اور نصف سے زیادہ چہرہ بھی چھپ جاتا تھا۔ میں آئینے میں خود کو نہیں دیکھ پا رہا تھا صرف میری ناک کا کچھ حصہ' میرے ہونٹ اور ان کے درمیان مونچھیں نظر آ رہی تھیں۔

وہ مونچھیں مجھے کھٹکنے لگیں۔ ناجی انہیں اچھی طرح پہچانتی تھی۔ ابتدا میں ان مونچھوں کے باعث ناجی کو چھینکیں آ جایا کرتی تھیں۔ ایک بار میں نے کہا تھا۔ "میں انہیں مونڈ کر تمہارا نزلہ زکام دور کر دوں گا۔"

وہ بولی۔ "ہرگز نہیں۔ یہ مرد کی شان ہیں۔ تمہارے چہرے پر اچھی لگتی ہیں۔"

میں آئینے میں لبادے کے پیچھے کامیابی سے چھپ گیا تھا لیکن ناجی کو یہ مونچھیں بہت پسند تھیں اور وہ انہیں اچھی طرح پہچانتی تھی۔ وہ لاکھ روپوشی کے باوجود مجھے صرف ان مونچھوں سے پہچان سکتی تھی۔

میں لبادہ اتار کر آئینہ دیکھتے ہوئے اپنی مونچھوں کو دو انگلیوں سے سہلانے لگا۔ اگرچہ یہ مردانگی کی علامت تھیں لیکن پچاس لاکھ روپے کے لئے اس مردانگی کو مونڈا جا سکتا تھا۔

جب میں رات کو نو بجے ناجی کی کوٹھی کے پیچھے پہنچا تو میرے چہرے سے مونچھیں صاف ہو چکی تھیں۔ مجھے دس بجے اس کوٹھی میں داخل ہونا تھا۔ میں ایک گھنٹہ پہلے آ گیا تھا اور دور سے چھپ کر دیکھ رہا تھا۔ احاطے کے آہنی گیٹ کے پاس دلاور خان نہیں تھا۔ پیچھے کوارٹر میں باورچی اور اس کی بیوی کی موجودگی بتا رہی تھی کہ ناجی نے انہیں چھٹی دے کر کوٹھی سے باہر بھیج دیا ہے۔ وہ واقعی اتنی بڑی کوٹھی میں تنہا تھی۔

میں ٹھیک دس بجے احاطے کی دیوار پر چڑھ کر اندر آیا۔ ایک درخت کے سائے میں پہنچ کر میں نے بیگ کی زپ کھولی۔ اس میں سے راہب جیسا لباس نکالا اور اسے پہن لیا۔ ریوالور میں سائیلنسر لگا لیا۔ تمام تصاویر اور نیگیٹو میرے لباس کے اندر محفوظ تھے۔ صرف ایک تصویر اور ایک نیگیٹو کو لبادے کے اندر قمیض کی اوپری جیب میں رکھا تاکہ ناجی کو دکھاؤں تو وہ انہیں دیکھ کر مطمئن ہو جائے۔

اپنے بیگ کو ایک جھاڑی میں چھپا کر میں چھپتا ہوا کوٹھی کے اندر آیا۔ سب سے پہلے مین سوئچ کو آف کیا تو پوری کوٹھی تاریکی میں ڈوب گئی۔ ایسی تاریکی سے میرے لئے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ کیونکہ میں لائٹ مین ہوں۔ ہمیشہ روشنی کے پیچھے اندھیرے میں رہتا آیا ہوں۔ پھر ناجی کی کوٹھی کے ایک ایک کمرے کو، ایک ایک گزرنے کے راستے کو آنکھیں بند کر کے بھی سمجھ سکتا تھا کہ کدھر سے مڑنا ہے اور کہاں جا کر پہنچنا ہے۔

میں اس کی خواب گاہ کے دروازے پر پہنچ کر رک گیا۔ اندر چارجر لائٹ کی روشنی تھی۔ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "روشنی کا رخ دوسری طرف پھیر دو۔"

ناجی نے صوفہ سے اٹھ کر لائٹ کے پاس آ کر ایک دیوار کی طرف اس کا رخ پھیر دیا۔ پھر دروازے کی طرف دیکھ کر بولی۔ "آ جاؤ۔"

میں اس خواب گاہ میں آیا، جہاں اس کے ساتھ میں نے بے شمار پیار بھری راتیں گزاری تھیں۔ اس کی ہر پیار بھری ادا کے ساتھ قسمیں کھائی تھیں کہ میں اس کے اعتماد کو کبھی ٹھیس نہیں پہنچاؤں گا۔ کبھی اسے دھوکا نہیں دوں گا۔

"ناجی نے کہا۔ "صبح طارق مجید سے یہ طے پایا تھا کہ ہمارے درمیان ایک تحریری معاہدہ ہو گا، اور معاہدے پر دستخط کرتے وقت گونگے باس کی موجودگی ضروری ہے۔"

"میں گونگا نہیں ہوں مگر موجود ہوں۔ ویسے تم نے فون پر مجھ سے معاہدے کی بات نہیں کی تھی۔"

"اس لئے کہ بلیک میلروں میں سے ایک تم ہی زندہ رہ گئے تھے۔ میں یہ معلوم کر چکی ہوں کہ طارق مجید اور گاما قتل کر دیئے گئے ہیں۔ اس سے پہلے ہماری انڈسٹری کے ایک گونگے فوٹوگرافر کو بھی پُراسرار طور پر ہلاک کیا گیا ہے۔ کیا اسے بھی تم نے ہی..........."

میں نے کہا۔ "نہیں، میں نے صرف طارق مجید اور گامے کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ اس گونگے کو گامے نے قتل کیا تھا۔"

ناجی نے پوچھا۔ "جانتے ہو، میں طارق مجید وغیرہ کو معاہدے کے لئے کیوں بلا رہی تھی؟"

"ہاں، تم تحریری معاہدے کے ذریعے اطمینان کرنا چاہتی تھیں کہ طارق مجید تمہیں اپنی فلم کے بزنس میں پارٹنر بنائے گا۔"

"نہیں اے پردہ نشین! میں چاہتی تھی کہ معاہدے کے وقت تمام بلیک میلر ایک جگہ میرے سامنے آ جائیں تاکہ میں انہیں پولیس کے حوالے کر سکوں لیکن ان میں سے دو کو تم نے ہلاک کر دیا۔ اب یہاں تنہا آ کر یہ ثابت کر رہے ہو کہ بلیک میلنگ کے ذریعے صرف تم ہی پچاس لاکھ روپے حاصل کرنے کے لئے زندہ رہ گئے ہو۔"

میں نے قمیض کی اوپری جیب سے ایک تصویر اور نیگیٹو اس کی طرف بڑھا کر کہا۔ "اسے دیکھو۔ بلیک میلنگ کا باقی آئٹم میں نے ایک جگہ حفاظت سے چھپا کر رکھا ہے۔"

اس نے تصویر کو چارجر لائٹ کے سامنے لے جا کر دیکھا۔ پھر کہا۔ "یہ تو میری اور میرے شوہر کی تصویر ہے۔ تم تو دھمکیاں دے رہے تھے کہ کسی ملازم کے ساتھ میری شرمناک تصویریں تمہارے پاس ہیں۔"

میں نے بھرائی اور بدلی ہوئی آواز میں کہا۔ "یہ تمہارا شوہر نہیں، ملازم ہے۔ تمہارا سیکرٹری ہے۔ ساری انڈسٹری یہ جانتی ہے۔"

"انڈسٹری وہی جانتی ہے جو میں ظاہر کرتی ہوں۔ میں نے فلمی دنیا میں قدم رکھنے سے پہلے ہی جمال الدین عرف جمی سے شادی کی تھی لیکن فلم بین حضرات کی نظروں میں کنواری کہلانے کے لئے میں نے اس شادی کو چھپا کر رکھا۔"

میں نے کہا۔ "تمہیں یہ اندیشہ ہے کہ ایسی تصویروں کے مشتہر ہونے سے تم پر حدود آرڈیننس لاگو ہو گا پھر تمہیں سزا سنائی جائے گی اور تمہیں سنگسار کیا جائے گا۔"

"سانچ کو کیا آنچ؟ جو سچ ہے، وہی کہہ رہی ہوں۔ جس وقت تم لوگوں نے مجھے گن پوائنٹ پر مجبور کیا کہ میں اپنے ملازم کے ساتھ جذباتی اور قابلِ اعتراض تصویریں اتر واؤں تو اسی وقت میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب اپنی شادی کی بات نہیں چھپاؤں گی۔ میں پچھلی رات اپنے مجازی خدا سے محبت کرتی رہی اور تم لوگ اسے ایک ملازم کے ساتھ میرا گناہ سمجھتے رہے۔"

وہ ایک ذرا توقف سے بولی۔ "میں نے پچھلی رات فیصلہ کر لیا تھا کہ کنواری ہیروئن کہلا کر میں نے بڑی دولت اور شہرت کمائی ہے، اب میں کسی بلیک میلر کو پچاس لاکھ دینے

کے لئے مزید کنواری بن کر نہیں رہوں گی۔ یہاں پچاس لاکھ کا چارا ڈال کر تم سب کو بلاؤں گی اور یہ انکشاف کروں گی کہ میں سیکرٹری جمی کی شریکِ حیات ہوں۔ تم لوگوں کی اتاری ہوئی تصویروں سے میں بے حیا نہیں کہلاؤں گی اور نہ ہی بلیک میل کی جا سکوں گی۔"

میں نے قہقہہ لگایا پھر کہا۔ "بڑی بڑی باتیں کر رہی ہو۔ صرف یہ کہہ دینے سے دنیا نہیں مانے گی کہ جمی سے تمہارا باقاعدہ نکاح ہو چکا ہے۔ ثبوت کے طور پر تمہیں نکاح نامہ پیش کرنا ہو گا۔"

"تم کیا سمجھتے ہو؟ میرے پاس نکاح نامہ ہے اسی بنیاد پر اپنے پچاس لاکھ روپے بچا رہی ہوں۔ کیا تم وہ نکاح نامہ دیکھنا چاہو گے؟"

وہ بستر کے سرہانے گئی۔ پھر تکیے کے نیچے ہاتھ لے جانا چاہتی تھی۔ میں نے پھرتی سے ریوالور نکال کر کہا۔ "خبردار! کوئی چالاکی نہ دکھانا۔ تکیے کے نیچے کسی اسلحے کی جھلک ملے گی تو میں تمہیں گولی مار دوں گا۔"

اس نے تکیے کو اٹھایا۔ وہاں ایک تہہ کیا ہوا نکاح نامہ چارجر لائٹ کے باعث نظر آ رہا تھا۔ دور سے اس کی تحریر نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے اس سے وہ کاغذ لیا۔ پھر چارجر لائٹ کے پاس اس طرح آیا کہ خود تاریکی میں رہا اور نکاح نامے کو روشنی میں رکھ کر پڑھا۔ واقعی وہ وہی نکاح نامہ تھا' جس کے متعلق ناجی نے کہا تھا کہ وہ اسے جلا کر راکھ کر چکی ہے۔

اس نے اسے چھپا کر رکھا تھا اور یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ جعلی نکاح نامہ ہے۔ اس پر جعلی مہر لگی ہے اور قاضی صاحب کے سرکاری رجسٹر پر اس کا اندراج نہیں ہوا ہے۔

میں نے پوچھا۔ "کیا ثبوت ہے کہ یہ اصلی ہے۔ یہ جعلی بھی ہو سکتا ہے۔"

"آج دوپہر کو میری درخواست پر آئی جی صاحب نے علاقے کے تھانہ انچارج کو تحقیقات کا حکم دیا تھا اور سختی سے کہا تھا کہ آج رات مجھے ایک بلیک میلر اور قاتل سے بچایا جائے۔"

اتنا کہتے ہی کہیں سے ٹھائیں کی آواز کے ساتھ گولی چلی۔ میرے ہاتھ میں جیسے انگارے بھر گئے۔ گولی لگتے ہی ہاتھ سے ریوالور چھوٹ کر گر پڑا۔ پھر چارجر لائٹ کا رخ میری طرف ہو گیا۔ اس کے باوجود میں ابھی پہچانا نہیں گیا۔ لبادہ ایک نقاب کی طرح میرے چہرے پر پڑا ہوا تھا اور میں ایک ہاتھ سے دوسرے زخمی ہاتھ کو تھامے تکلیف

برداشت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ناجی نے فرش پر سے میرا ریوالور اٹھا لیا تھا اور سائیلنسر کو اس سے الگ کر رہی تھی۔ کمرے کے باتھ روم سے' پلنگ کے نیچے سے اور کمرے کے تاریک حصوں سے پولیس والے نکل کر روشنی میں آ رہے تھے۔ انسپکٹر نے کہا۔ "پردہ نشین بلیک میلر! تم نے مین سوئچ آف کر کے کوٹھی میں تاریکی پھیلا کر ہمارے لئے چھپنے کی آسانی پیدا کر دی۔ اب ذرا رُخِ روشن سے نقاب اٹھا دو۔"

دوسرے انسپکٹر نے کہا۔ "اور ہاں' میں نے قاضی صاحب کے پاس جا کر تصدیق کی تھی۔ یہ نکاح نامہ اصلی ہے۔ قاضی صاحب نے بتایا کہ انہوں نے ایک بار میڈم ناجی کے کہنے پر ان کے شوہر جمی صاحب سے جھوٹ کہا تھا کہ یہ نکاح نامہ جعلی ہے۔ کیونکہ جمی صاحب اس نکاح نامے کے ذریعے میڈم کو پریشان کرنا چاہتا تھا۔"

پہلے انسپکٹر نے غصے سے کہا۔ "کیا تم نے سنا نہیں' میں نے نقاب اٹھانے کے لئے کہا ہے۔"

یہ کہتے ہی انسپکٹر نے ایک الٹا ہاتھ میرے منہ پر مارا۔ آہ! اس وقت ایک ہی دعا مانگ سکتا تھا کہ تمام عمر مجھے ایسی مار اور لات جوتے پڑتے رہیں لیکن چہرہ یونہی چھپا رہے۔ کوئی مجھے ناجی کے سامنے بے نقاب نہ کرے۔

لیکن پیچھے کھڑے ہوئے سپاہی نے میرے لبادے کو پکڑ کر ایک جھٹکے سے کھینچا۔ میرا چہرہ اور سر ننگا ہو گیا۔ مجھے دیکھتے ہی ناجی کے حلق سے چیخ نکلی۔ وہ انکار میں سر ہلا کر رونے لگی۔ "نہیں' یہ تم نہیں ہو۔ میں خواب دیکھ رہی ہوں۔ مجھے تو بلیک میلر لوٹ رہے تھے۔ ان کے لبادے میں تم نہیں ہو سکتے۔ بول دو کہ تم یہ سب ایک ناٹک کر رہے تھے۔ مذاق کر رہے تھے۔ لوگو! مجھے یقین دلاؤ کہ میں خواب دیکھ رہی ہوں۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ "ہائے تم نے میری ازدواجی زندگی کی پہلی رات سے لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔

"میں تمہارا لبادہ اتار کر تمہیں قیمتی سوٹ پہناتی تھی۔ تمہیں اچھا کھانے کے لئے' رمی کھیلنے اور غیر ملکی شراب پینے کے لئے بڑی بڑی رقمیں دیتی تھی۔

"میری جیسی اداکارہ کا بستر صرف تمہارے لئے تھا۔ اپنی وفاؤں سے یقین دلاتی تھی کہ فلمی دنیا میں لڑکیاں صرف ہیرا منڈی سے نہیں آتیں۔ ایسے شریف گھرانوں سے بھی آتی ہیں' جو صرف ایک ہی مجازی خدا کی ہو کر رہتی ہیں۔ تم ہر رات میری وفاؤں پر نثار

ہوتے تھے اور ہر صبح زمانۂ قدیم کے ان راہبوں کا لبادہ اوڑھ لیا کرتے تھے‘ جو کسی کو سزائے موت دینے کے لئے اسے اپنے درمیان لے کر مقتل کی طرف جاتے ہیں۔ آج بھی تم مجھے مقتل کی طرف لے جانے کے لئے یہ لبادہ اوڑھ کر آئے ہو۔ تمہاری تمام گفتگو یہاں ریکارڈ ہو چکی ہے۔ تم نے طارق مجید اور گامے کو قتل کرنے کا اعتراف کیا ہے۔ تم سزائے موت سے نہیں بچ پاؤ گے۔ سنا تم نے؟ تم سزائے موت پاؤ گے۔ مجھے چھوڑ کر اس دنیا سے چلے جاؤ گے۔

”میں نے کہا تھا کہ مجھے چھوڑ کر جاؤ گے تو میں تمہاری جگہ کسی کو نہیں دوں گی۔ اب تم نہیں رہو گے تو پھر کچھ بلیک میلر آئیں گے یا اغوا کرنے والے اور ایک خوبصورت ہیروئن کو جبراً لوٹنے کھسوٹنے والے آئیں گے اور میں تمہاری جگہ کسی کو نہیں دوں گی۔ خدا کی قسم میری زندگی میں کوئی اور کبھی نہیں آسکے گا۔“

یہ کہتے ہی اس نے میرے ریوالور کو اپنی کنپٹی سے لگا لیا پھر اس سے پہلے کہ کوئی اسے روکتا‘ گولی چل گئی۔

وہ لبادہ اسی زمانۂ قدیم سے آیا تھا۔ میں اسے اوڑھ کر اس محبت کرنے والی کو مقتل تک پہنچا چکا تھا۔

☆======☆======☆

میں جہاں قید کیا گیا ہوں‘ وہاں گہری تاریکی ہے۔

کبھی ناجی مجھے محبت سے قید کیا کرتی تھی۔ میں ذرا صبر کر لیتا تو وہ شادی کا راز ظاہر کرنے ہی والی تھی۔ پھر پچاس لاکھ روپے تو کیا میری اس منکوحہ سے پیارے اور معصوم بچے بھی ملتے اور کروڑوں روپے سے زیادہ کی زمین جائیداد اور بینک بیلنس بھی ملتا۔ مگر عورت کی کمائی کھانے والا مرد صبر نہیں کرتا‘ لوٹ مار کرتا ہے۔

ابھی مجھ پر مقدمہ چل رہا ہے۔ جیل کی ایک کوٹھری میں مجھے جو سب سے بڑا خزانہ ملا ہے‘ وہ یہ قلم اور کاغذات ہیں۔

بس وہ وقت جلد ہی آنے والا ہے‘ جب قلم کی سیاہی اور میری زندگی کی سانسیں تمام ہو جائیں گی اور آخری سانس تک یہ شرمندگی رہے گی کہ وہ حیا سے مری اور میں............؟

☆======☆======☆

اندھیرے کے مسافر

اندھیرے میں چلنے والے ان مسافروں کی کہانی
جن کی منزل روشنی میں کھوگئی تھی۔

ایک کافرادا حسینہ کا فسانۂ عبرت۔ وہ اپنے حسین بدن کو
ایک خطرناک ہتھیار کی طرح استعمال کرتی تھی۔

سٹے بازی کے کھیل میں لوگوں کو کنگال کرنے والے شاطر کی کہانی۔
وہ شاطر ایک حسین لڑکی کے سامنے بے بس ہوگیا تھا۔

اُس کا جسم بڑی سی میز کے پیچھے ریوالونگ چیئر میں دھنسا ہوا تھا لیکن شخصیت کے اعتبار سے اتنا ابھرا ہوا تھا کہ انسپکٹر کمال وارثی چند لمحوں تک اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ میز پر سر جھکائے ایک انگریزی رسالے کے مطالعہ میں غرق تھا۔ انسپکٹر نے محسوس کیا کہ اُس کا مطالعہ اور مصروفیت محض ڈھونگ ہے۔ وہ ایک پولیس والے کی موجودگی سے باخبر ہے اور دکھاوے کے لئے انجان بن رہا ہے۔ انسپکٹر کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ آ گئی۔ جب کوئی مجرم بہت زیادہ چالاک بننے کی کوشش کرے تو ایسی ہی احمقانہ حرکتیں کرتا ہے۔

"مسٹر شہریار! کیا آپ کو میری آمد کی اطلاع نہیں دی گئی تھی؟"

شہریار نے چونک کر انگریزی رسالے سے نظریں اٹھائیں۔ چونکنے کے انداز میں بھی بناوٹ تھی۔ اس نے جلدی سے اٹھ کر اور میز پر جھک کر مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اوہ سوری' مجھے اطلاع مل گئی تھی مگر کیا کیا جائے؟ کام کچھ ایسا ہے کہ مصروفیت میں ایک منٹ پہلے کی باتیں بھی یاد نہیں رہتیں۔ فرمایئے' میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

انسپکٹر کمال وارثی نے بے دلی کے ساتھ مصافحہ کیا' پھر کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "میں یہ معلوم کرنے آیا ہوں کہ آپ کا بزنس کیا ہے؟"

شہریار نے اپنی کرسی میں دھنستے ہوئے دونوں ہاتھ پھیلا کر کہا۔ "دیکھ لیجئے' سب کچھ آپ کے سامنے ہے۔ یہ دیواروں پر حسین لڑکیوں کی تصویریں ہیں' صرف تصویریں ہی نہیں' یہ اکثر بنفسِ نفیس یہاں آتی ہیں۔ یہ سب ماڈل گرلز ہیں۔ میں بڑی بڑی کمپنیوں کے اشتہارات کے لئے انہیں استعمال کرتا ہوں۔"

انسپکٹر نے تصویروں پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "یہ ہاتھی کے دانت ہیں' دکھانے کے اور کھانے کے اور .... اصل بزنس کیا ہے؟"

"جو اصل ہے وہ میں نے بتا دیا۔ اگر اس کے پسِ پردہ آپ کو کچھ اور نظر آتا ہے تو

آپ بتائیں' وہ میرے لئے ایک نئی اطلاع ہو گی۔"

اسی وقت فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ شہریار نے فون کی جانب ہاتھ بڑھایا۔ کمال وارثی نے فوراً ہی ریسیور پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"ٹھہریئے' یہ میرے لئے ہے۔" اس نے ریسیور اٹھا کر کہا۔ "ہیلو .... جی ہاں' یہ شہریار ماڈل سینٹر ہے۔ مسٹر شہریار باہر گئے ہیں۔ آپ سات بجے کے بعد فون کریں۔"

اس نے ریسیور رکھ دیا۔ شہریار اسے غصے اور بے بسی سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے غصہ پر کسی قدر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "آپ میرے کاروبار کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔"

"صرف ایک گھنٹے کی بات ہے۔" انسپکٹر نے جواب دیا۔ "میں یہاں ایک گھنٹے تک بیٹھا رہوں گا۔ اس دوران نہ آپ کسی کو کال کریں گے' نہ کسی کی کال سنیں گے اور نہ ہی دوسرے کمرے سے اپنی سیکرٹری کو بلا کر اس سے باتیں کریں گے۔"

"آخر کیوں' مجھ پر یہ پابندیاں کیوں ہیں؟"

"اس لئے کہ ایک گھنٹے کے درمیان ٹھیک چھ بجے سٹے کا نمبر بولا جائے گا اور وہ اسی دفتر سے بولا جائے گا۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ آج وہ نمبر کس طرح آؤٹ ہوتا ہے۔"

شہریار نے اچانک قہقہہ لگایا۔ "سٹے کا نمبر .... اور یہاں سے ہاہاہاہا .... کسی مسخرے نے آپ کو میرے گھر کا راستہ بتا دیا ہے۔ میرے باپ نے بھی کبھی سٹے بازی نہیں کی۔ ہاہاہا .... اب آپ جتنی دیر چاہیں بیٹھ سکتے ہیں لیکن یہاں سے مایوس ہو کر جائیں گے ...."

وہ قہقہے لگا رہا تھا اور کمال وارثی اسے گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ سچے قہقہے تھے' ان میں بناوٹ نہیں تھی۔ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا' اس میں ذرا سی لغزش اور ہلکی سی لکنت بھی نہیں تھی۔ پھر اس کے قہقہے رک گئے۔ اس نے میز پر سے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"سانچ کو کیا آنچ .... آپ خود ہی دیکھ لیں گے لیکن میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ مجھے میرا کام کرنے دیں' ورنہ میرا بہت نقصان ہو گا۔ ابھی مجھے ایک پارٹی کو سات سو روپے کا چیک بھیجنا ہے۔ اگر وہ چیک نہ گیا تو دس ہزار کی پارٹی ہاتھ سے نکل جائے گی۔"

"آپ جس پارٹی کو سات سو روپے کا چیک بھیجیں گے کیا یہی سات سٹے کا نمبر نہیں ہو سکتا؟"

اس نے جھلا کر کہا۔ "ہونے کو تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم دونوں یہاں بیٹھے ہیں اور ہمارا عدد سٹے بازی کے اشارے میں دو ہو سکتا ہے۔ یہاں چار کرسیاں ہیں' نمبر چار بھی ہو سکتا ہے۔ دیکھئے کمال صاحب! میں آپ کو آپ کے فرائض سے نہیں روک رہا ہوں' آپ بھی خدا کے لئے مجھے نقصان نہ پہنچائیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں چیک نہ لکھوں تو پھر فون پر مجھے اس پارٹی سے معذرت کرنے دیجئے۔ میں اس سے کہہ دوں گا کہ آج رات آٹھ بجے تک یا نو بجے تک میں اسے چیک .... مگر مشکل یہ ہے کہ میں آٹھ یا نو بجے کا وقت بھی نہیں دے سکتا۔ آپ اسے سٹے کا نمبر کہیں گے۔"

کمال وارثی ہنسنے لگا۔ پھر اس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ پیکٹ خالی تھا۔ وہ خالی پیکٹ کو ہلاتے ہوئے کہنے لگا۔ "آپ نے ابھی کہا تھا کہ مصروفیات کے دوران ایک منٹ پہلے کی باتیں یاد نہیں رہتیں۔ میں کہتا ہوں کہ ایک سیکنڈ پہلے کی باتیں بھی یاد نہیں رہتی ہیں۔ یہ دیکھئے کہ سگریٹ سلگانے میں جو کم سے کم وقت صرف ہو سکتا ہے' اس مختصر سے لمحے میں' میں یہ بھول گیا کہ یہ پیکٹ خالی ہو چکا ہے۔ میں نے اسے جیب میں رکھ لیا تھا۔"

شہریار نے اپنا پیکٹ اور لائٹر بڑھاتے ہوئے کہا۔ "جب انسان خود بھول کرتا ہے' تب ہی وہ دوسروں کی بھول کو سمجھتا ہے اور تسلیم کرتا ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس وقت بھی آپ مجھ پر پابندیاں عائد کر کے بھول کر رہے ہیں۔"

کمال وارثی نے سر جھکا کر میز کے نیچے دیکھا۔ وہاں ردی کی ٹوکری رکھی ہوئی تھی۔ اس نے خالی پیکٹ کو اس میں پھینک دیا اور شہریار کے پیکٹ سے ایک سگریٹ لے کر سلگانے لگا۔ شہریار نے بھی ایک سگریٹ نکالا' پیکٹ کو ردی کی ٹوکری میں ڈالا اور اپنا سگریٹ سلگانے لگا۔

ہاں بعض اوقات آدمی ایک سیکنڈ پہلے کی باتیں بھول جاتا ہے۔ کمال وارثی نے دل ہی دل میں کہا۔ "بیٹے! تم میری نفسیات سے کھیل رہے ہو۔ میں چند سیکنڈ پہلے کی یہ بات نہیں بھولا کہ تمہارے پیکٹ میں چار سگریٹ باقی بچے ہیں اور تم نے انہیں ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آج چار نمبر آؤٹ ہو گا۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ یہ سگریٹ کا پیکٹ کس طرح اس کمرے سے باہر جاتا ہے۔"

اس نے دل میں سوچا پھر سگریٹ کا ایک لمبا کش لینے کے بعد کہنے لگا۔ "ٹھیک ہے' میں آپ پر بے جا پابندیاں نہیں لگاؤں گا۔ آپ یہ بتائیں کہ اس وقت آپ کا کون کون سا

ضروری کام ہے؟"

"ایک تو یہی کہ سات سو کا چیک بھیجنا چاہتا ہوں۔"

"مجھے اعتراض نہیں ہے آپ چیک لکھئے۔"

شہریار دراز کھول کر چیک بک نکالنے لگا۔ کمال وارثی کو اچانک یاد آیا کہ آج چار تاریخ ہے اور شہریار تاریخ کی جگہ چار کا ہندسہ لکھے گا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ "ٹھہرئیے' چیک پر جو تاریخ لکھی جائے گی' وہ میری مرضی کے مطابق ہو گی۔ آپ اس پر پانچ تاریخ لکھیں۔"

شہریار کا منہ لٹک گیا۔ پیشانی پر شکنیں پھیل گئیں۔ کمال وارثی نے مسکرا کر کہا۔

"اب تو بینک بند ہو چکا ہے۔ یہ چیک کل ہی پانچ تاریخ کو کیش ہو سکے گا۔ آپ پانچ تاریخ لکھنے سے کیوں ہچکچا رہے ہیں؟"

"آپ .... وہ .... بات دراصل یہ ہے کہ میں جس روز چیک لکھتا ہوں اسی دن کی تاریخ ڈالتا ہوں۔ بہرحال آپ کہتے ہیں تو پانچ تاریخ لکھ دیتا ہوں۔"

وہ سر جھکا کر لکھنے لگا۔ اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ جبراً انسپکٹر کے حکم کی تعمیل کر رہا ہے۔ انسپکٹر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر کہنے لگا۔

"ہم بہت عرصے سے اس گمنام شخص کی تلاش میں ہیں' جو شہر میں سٹے بازی کی لعنت پھیلا رہا ہے۔ بڑی دوڑ بھاگ کے بعد پتہ چلا کہ مختلف علاقوں میں کچھ ایسی پان کی دکانیں ہیں اور کچھ ہوٹل ہیں' جہاں سٹہ کھیلنے والے جاتے ہیں۔ اپنی مرضی کے مطابق نمبر بولتے ہیں۔ اس نمبر پر پیسے لگاتے ہیں اور اس نمبر کا ٹکٹ حاصل کرتے ہیں۔ جو غریب ہوتے ہیں' وہ دو چار یا دس روپے لگاتے ہیں۔ بڑے لوگ ہزاروں کا جوا کھیلتے ہیں۔ وہ گمنام شخص کہیں بیٹھا رہتا ہے۔ روزانہ اس کے پاس اطلاع پہنچتی رہتی ہے کہ سٹہ کھیلنے والے کس نمبر پر کتنی رقم لگا چکے ہیں۔ ہر ماہ کی چار تاریخ کو ٹھیک چھ بجے وہ گمنام شخص ایسا نمبر بولتا ہے جس پر سب سے کم رقم لگائی گئی ہے۔"

شہریار نے چیک اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اسے اچھی طرح دیکھ لیجئے' کوئی شبہ ہو تو مجھ سے کہئے' میں اسے دور کر دوں گا۔"

کمال وارثی اس چیک کو بغور پڑھنے لگا۔ کوئی قابلِ اعتراض ہندسہ اس میں نہیں تھا۔ شہریار نے کہا۔

"آپ نے سٹہ بازوں کے متعلق دلچسپ معلومات فراہم کی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ

آپ پان کی دکانوں اور ہوٹلوں کے ذریعے آسانی سے اس گمنام شخص تک پہنچ سکتے ہیں۔"

"ہاں' چھ ماہ کے عرصے میں کئی دکان والے پکڑے گئے' انہیں کڑی سے کڑی سزائیں دی گئیں لیکن وہ یہی کہتے رہے کہ وہ اس گمنام شخص کو نہیں جانتے۔"

"پھر آپ مجھ تک کیسے پہنچ گئے ہیں؟ میرا مطلب ہے کہ میں تو مجرم نہیں ہوں پھر آپ کو مجھ پر کیسے شبہ ہو رہا ہے؟"

"یہ ہمارا اپنا طریقۂ کار ہے کہ ہم نے آپ کو کس طرح پہچانا ہے۔ آپ کے لئے یہی بہتر ہے کہ آپ اپنے جرم کا اقرار کرلیں۔ آپ کے پاس شہر کے تمام علاقوں کا حساب پہنچ چکا ہے۔ کس علاقے میں کتنی رقم جمع ہو چکی ہے اور کون سے نمبر پر سب سے کم رقم لگائی گئی ہے۔ یعنی تمام علاقوں کا مجموعی ریکارڈ صرف آپ کے پاس ہے۔ صرف آپ ہی نمبر بول سکتے ہیں۔ اگر آج وہ نمبر آؤٹ نہ ہوا تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ آپ اور صرف آپ ہی مجرم ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ آگے کو جھکا اور ایش ٹرے میں سگریٹ کو رگڑ کر بجھانے لگا۔ پھر اس نے چیک کو پیپر ویٹ کے نیچے دباتے ہوئے پوچھا۔ "آپ کا دوسرا ضروری کام کون سا ہے' بتایئے۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ کو میری وجہ سے نقصان پہنچے۔"

شہریار نے سامنے میز پر پڑی ہوئی تصویریں اٹھائیں اور اس کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔ "یہ تصویریں میں اپنی سیکرٹری مس روزی کے پاس بھیجنا چاہتا ہوں' وہ ابھی ان کے فلم پوزیٹو بننے کے لئے بھیج دے گی۔"

کمال وارثی نے اپنے ہاتھوں میں لے کر ان تصویروں کی گنتی کی۔ وہ چار تھیں۔ ان میں سے دو کسی حسین لڑکی کی تصویریں تھیں' تیسری تصویر میں پہاڑ اور جھرنے کا منظر تھا' چوتھی تصویر میں ایک جھیل کا منظر تھا۔ اس جھیل میں ایک بطخ تیر رہی تھی۔

کمال وارثی کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ چار تصویروں کا مطلب یہی تھا کہ وہ اپنی سیکرٹری تک چار کا عدد پہنچانا چاہتا تھا۔ اس نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔

"سوری مسٹر شہریار! یہ چاروں بیک وقت نہیں جائیں گی۔ یہ حسین لڑکی مجھے اچھی لگ رہی ہے' میں جب تک یہاں رہوں گا' اس تصویر کو دیکھتا رہوں گا۔ باقی یہ تین تصویریں آپ بھیج سکتے ہیں۔"

شہریار نڈھال سا ہو کر میز پر جھک گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کمال وارثی اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ وہ اپنی پریشانیوں کو چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس نے اپنی ریسٹ واچ کو

دیکھا۔ چھ بجنے میں پانچ منٹ رہ گئے تھے۔ اسی وقت ایک ملازم کمرے کی صفائی کے لئے اندر آیا۔ شہریار نے کہا۔

"کمرے کی صفائی بعد میں کرنا پہلے یہ ردی کی ٹوکری اٹھاؤ اور یہ کچرا باہر پھینک آؤ۔"

"نہیں مسٹر شہریار' یہ ردی کی ٹوکری باہر نہیں جائے گی۔ آپ بھی کیا یاد کریں گے کہ کسی پولیس انسپکٹر سے پالا پڑا تھا۔"

شہریار جھلا کر کھڑا ہو گیا اور میز پر مکا مارتے ہوئے بولا۔ "آخر آپ مجھے مجرم کیوں سمجھ رہے ہیں؟"

"صرف مجرم نہیں سمجھ رہا ہوں' اسے ثابت کرنا بھی چاہتا ہوں۔ آپ سٹے کا نمبر جس ایجنٹ کے پاس پہنچاتے ہیں وہ ہماری نظروں میں آچکا ہے۔ اس کے آفس میں پولیس کا پہرہ ہے۔ آپ یہاں سے نمبر بولنا بھی چاہیں گے تو وہاں انسپکٹر خیری وہ نمبر سنیں گے اور اگر نمبر آؤٹ نہ ہوا تو آدھے گھنٹے بعد آپ کو ہتھکڑیاں پہنا دی جائیں گی۔"

"یہ تو کوئی انصاف نہیں ہے۔ اگر وہ گمنام شخص کہیں بیمار پڑا ہو یا کسی حادثے کا شکار ہو گیا ہو تو وہ کیسے نمبر بولے گا؟ اگر نہیں بولے گا تو آپ اس کی سزا مجھے کیوں دیں گے؟"

"آپ میرے سامنے باتیں نہ بنائیں۔ آپ کا جو ایجنٹ ہماری حراست میں ہے وہ آپ کو صورت شکل سے نہیں پہچانتا لیکن یقین سے کہتا ہے کہ آپ آگ کے شعلوں میں بھی گھر کر نمبر بول جاتے ہیں۔ میں یہی دیکھنا چاہتا ہوں کہ آپ کتنے بڑے تیس مار خان ہیں۔"

شہریار شکست خوردہ انداز میں پھر ایک بار کرسی میں دھنس گیا۔ وہ انسپکٹر کو غصہ دکھانے کی بجائے ملازم کو جھڑک کر بولا۔ "تم یہاں منہ کیا تک رہے ہو۔ جاؤ یہاں سے' یہ تصویریں لے جاؤ۔ مس روزی کو دے دینا۔ یہ سب گرافک آرٹ میں پوزیٹو کے لئے جائیں گی اور یہ چیک بھی لے جاؤ۔"

کمال وارثی نے مسکراتے ہوئے وہ چیزیں ملازم کو دے دیں۔ جب وہ کمرے سے باہر چلا گیا تو اس نے کہا۔ "مسٹر شہریار! چھ بجنے میں صرف دو منٹ رہ گئے ہیں۔ اب میں آپ کو بتا دوں کہ میں مجرموں کی گردن پکڑنے کے لئے علمِ نفسیات سے کام لیتا ہوں۔ میں نے کہا تھا کہ بعض اوقات ایک سیکنڈ پہلے کی باتیں مجھے یاد نہیں رہتیں۔ آپ نے یقین کر لیا اور یہ سمجھ لیا کہ آپ کے پیکٹ میں کتنے سگریٹ ہیں' یہ میں بھول چکا ہوں ....

نہیں، مجھے اب بھی یاد ہیں۔ اس میں چار سگریٹ ہیں۔ یہ ردی کی ٹوکری باہر جاتی اور چار کا عدد آؤٹ ہو جاتا۔ آپ اس عدد کو کمرے سے باہر بھیجنے کے لئے کتنے ہی جتن کر چکے ہیں۔ چیک پر چار تاریخ مخصوص انداز میں لکھ دی جاتی۔ یا پھر چار تصویریں باہر چلی جاتیں لیکن میں نے آپ کی تمام کوششیں ناکام بنا دیں۔ ابھی ایک منٹ باقی ہے، چلئے ایک بار اور کوشش کر لیجئے۔ آپ اسی صورت میں بچ سکتے ہیں کہ کسی طرح بول دیں اور میں بولنے نہیں دوں گا۔"

شہریار خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ پھر اس نے جھک کر ردی کی ٹوکری سے سگریٹ کا پیکٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "آپ یقیناً ماہر نفسیات ہو سکتے ہیں مگر میں نے بے خیالی میں یہ پیکٹ پھینک دیا تھا۔ یہ لیجئے، ایک سگریٹ میں لیتا ہوں، ایک آپ لیں، اس کے بعد بتائیں کہ کتنے سگریٹ رہ جاتے ہیں؟"

وہ دونوں ایک ایک سگریٹ سلگانے لگے۔ میز پر پیکٹ پڑا ہوا تھا۔ اس میں دو سگریٹ رہ گئے تھے۔

چالیس برس کی بوڑھی خرانٹ مس روزی کا دعویٰ تھا کہ وہ ابھی تک کنواری ہے، اسی لئے مس کہلاتی ہے۔ اس نے بوڑھی تجربہ کار نظروں سے تینوں تصویروں کو دیکھا۔ پھر بطخ والی تصویر اٹھالی۔ ملازم نے کہا تھا کہ تصویریں گرافک آرٹ میں جائیں گی۔ یعنی جگہ بدل گئی تھی، یعنی ایجنٹ بدل گیا تھا۔

اس نے ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف سے آواز سنتے ہی اس نے بطخ کی تصویر کو دیکھتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔

"وَن لٹل ڈک نمبر ٹو۔" پھر اس نے ریسور رکھ دیا۔

ایک ننھی بطخ نمبر دو۔ ساری دنیا کے قماربازوں کی زبان میں بطخ کو انگریزی کا دو کہا جاتا ہے۔ یہ بات انسپکٹر کمال وارثی کی سمجھ میں بھی آ سکتی تھی لیکن شہریار نے اس ماہرِ نفسیات انسپکٹر کو چار کے ہندسے میں الجھا رکھا تھا۔

☆======☆======☆

ایک چھوٹے سے ائرکنڈیشنڈ ڈرائنگ روم میں دو ادھیڑ عمر کے آدمی وھسکی سے شغل کر رہے تھے۔ ان کے سامنے ٹی وی پر ایک انگریزی فلم چل رہی تھی۔ وہ کبھی کبھی ٹی وی کی طرف یونہی دیکھ لیتے تھے ورنہ ان کی دلچسپی صرف شراب کے بھرے ہوئے گلاسوں سے تھی۔ وہ گلاس ان کے لئے جامِ جمشید تھے جن میں وہ پیش آنے والے

حالات کا عکس دیکھ رہے تھے۔

ایک نے اپنا گلاس اٹھا کر ایک چسکی لی اور کہا۔ "ناصر صاحب! میں یقین سے کہتا ہوں کہ وہ گمنام شخص شہریار ہے۔ پولیس اسے بے نقاب کرنے میں ناکام ہو گئی لیکن میں مایوس نہیں ہوں۔ ایک نہ ایک دن وہ میرے ہتھے چڑھے گا۔"

"میں بھی اس خوش فہمی میں مبتلا تھا۔" ناصر نے اپنے گلاس کو نشیلی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں نہیں جانتا کہ وہ گمنام شخص کون ہے؟ شہریار ہے یا کوئی اور؟ میں نے وہاں تک پہنچنے کی کوشش کی تھی۔ دو ماہ پہلے کی بات ہے۔ میرے علاقے میں سٹے پر جو رقمیں لگائی گئی تھیں، وہ دو لاکھ روپے تک پہنچ گئی تھیں۔ میں نے حساب لگایا کہ اور دوسرے علاقوں سے نہ جانے کتنے لاکھ روپے اس گمنام شخص کے پاس پہنچتے ہوں گے۔ وہ ہر علاقے کے ایجنٹ کو اپنی آمدنی کا دس فیصد دیتا ہے۔ اس حساب سے مجھے بھی ہر ماہ تیس ہزار روپے سے پچاس ہزار روپے تک مل جاتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو بھی اس سے زیادہ کمیشن نہیں ملتا ہو گا۔"

"جی ہاں مجھے بھی تقریباً اتنا ہی ملتا ہے اور وہ کمبخت لاکھوں روپے خود ہضم کر لیتا ہے۔"

"مسٹر جمشید!" ناصر نے کہا۔ "میں نے یہ سوچا کہ اگر ایک بار اس گمنام شخص تک پہنچ جاؤں تو اسے قانون کے سامنے بے نقاب کرنے کی دھمکیاں دے سکتا ہوں، اسے بلیک میل کر کے اس کا بزنس پارٹنر بن سکتا ہوں۔ یہ سوچ کر میں نے ایک پلاننگ کی۔ تین تاریخ کی رات کو حسبِ معمول اس گمنام شخص کا آدمی میرے علاقے کی رقم وصول کرنے آیا۔ اس نے اپنا خالی بریف کیس میرے سامنے رکھ دیا اور نوٹوں سے بھرا ہوا بریف کیس اٹھا کر چل دیا۔ وہ کمبخت گونگا ہے یا پھر مجھ سے بات کرنا نہیں چاہتا۔ میں نے کئی بار مختلف بہانوں سے اسے بولنے پر مجبور کیا مگر وہ پتھر کی مورت کی طرح خاموش رہتا ہے۔"

"ہاں۔" جمشید نے کہا۔ "میرے پاس بھی خاموشی سے آتا ہے۔ میرے علاقے میں جمع ہونے والی رقم اٹھاتا ہے اور خاموشی سے چلا جاتا ہے۔"

"لیکن!" ناصر نے کہا۔ "اس بار میرے خاص آدمی میری کوٹھی سے سو گز کے فاصلے پر ایک کار میں بیٹھے ہوئے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ جیسے ہی بریف کیس لے کر میری کوٹھی سے نکلا اور ہمیشہ کی طرح ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر روانہ ہوا، میرے آدمی بڑی

ہوشیاری سے اس کا پیچھا کرنے لگے۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ رقم کہاں جاتی ہے؟ جہاں بھی جاتی وہاں وہ گمنام شخص موجود ہوتا لیکن وہ ٹیکسی رابسن روڈ پر پہنچ کر رک گئی۔ وہ آدمی بریف کیس لے کر اتر گیا اور راستے کے دوسری طرف آکر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے دوسری ٹیکسی لی اور واپس میری کوٹھی کی طرف آنے لگا۔ میرے آدمیوں نے سمجھا کہ شاید راستہ بدل کر جا رہا ہے۔ وہ بدستور اس کا پیچھا کرتے رہے لیکن اس طرح کہ انہوں نے بھی دوسری کار بدل لی تھی تاکہ اسے تعاقب کا شبہ نہ ہو لیکن وہ سیدھا میری کوٹھی میں میرے کمرے میں چلا آیا۔ میرے سامنے بریف کیس رکھا۔ پھر میں نے پہلی بار اس کی آواز سنی۔

"مسٹر ناصر! یہ بریف کیس خالی ہو چکا ہے۔ آپ کی رقم باس کے پاس پہنچ چکی ہے۔ باس نے آپ کو پہلی اور آخری وارننگ دی ہے۔ اگر آئندہ میرا پیچھا کیا گیا تو آپ سے آپ کا یہ علاقہ چھین لیا جائے گا۔ ایک بطخ ہر ماہ آپ کے لئے سونے کا ایک انڈہ دیتی ہے۔ اگر آپ اس کا پیٹ چاک کر کے ایک ہی وقت میں تمام انڈے نکالنا چاہیں گے تو آپ کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔"

اس نے مجھے کہنے کا موقعہ نہیں دیا۔ باس کا حکم سنایا اور چلا گیا۔ اس کے بعد میری جرأت نہ ہوئی کہ میں اس کا پیچھا کرتا۔ یہاں بیٹھے بٹھائے ہر ماہ پچاس ہزار تک مل جاتے ہیں۔ اب میں ایسی کوئی حماقت نہیں کرنا چاہتا کہ جس کی وجہ سے مجھے اپنی اس موجودہ آمدنی سے ہاتھ دھونا پڑیں۔ ہاں' آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں' مجھے اس سے دلچسپی ہے۔ اگر یہ ثابت ہو گیا کہ واقعی شہریار ہمارا باس ہے تو پھر سب سے پہلے میں اس کی گردن پکڑوں گا۔"

جمشید نے خالی گلاس کو میز پر پٹختے ہوئے کہا۔ "میں ثابت کر دوں گا کہ وہی باس ہے۔ میں پچھلے ماہ سے ایک گیم کھیل رہا ہوں' یعنی شہریار کی ایک کمزوری سے کھیل رہا ہوں۔ ہر شخص کے اندر کوئی نہ کوئی کمزوری ہوتی ہے۔ ہر شخص کے اندر ایک ایسی بھوک ہوتی ہے جو کبھی نہیں مٹتی۔ دولت کی بھوک' اقتدار کی بھوک اور عورت کی بھوک۔ شہریار عورتوں کا بھوکا ہے۔ شاید آپ جانتے ہوں گے کہ شہریار ماڈل سینٹر سے ایسی کمپنیوں اور فیکٹریوں کے لئے اشتہار بازی ہوتی ہے جو عورتوں کی آرائش و زیبائش کے لئے مصنوعات تیار کرتی ہیں۔ مثلاً سینے کو بھاری بھرکم اور جاذبِ نظر بنانے کے لئے فوم کی بریسیز' کمر میں لچکیلا خم پیدا کرنے کے لئے کورسیٹ بیلٹ اور کولہوں کے دلکش پھیلاؤ کے

لئے پیڈنگ انڈر ویئر وغیرہ وغیرہ۔ وہاں جو لڑکیاں خود کو ماڈل کے طور پر پیش کرنے جاتی ہیں' پہلے شہریار انہیں دیکھتا ہے' انہیں بے لباس کرتا ہے' ان کے جسم کے نشیب و فراز کو فیتے سے ناپتا ہے۔ کیمرے کے ویو پوائنٹ سے بدن کے ہر زاویے کو جانچتا ہے' ہاتھوں سے پرکھتا ہے اور اپنی ضرورت کے مطابق چکھتا ہے' پھر انہیں کسی اشتہار کی تصویر کے لئے پاس کر دیتا ہے۔"

یہ کہہ کر جمشید ذرا رک گیا' اپنے لئے دوسرا پیگ بنانے لگا۔ پھر دوسرے پیگ کی پہلی چسکی لیتے ہوئے کہنے لگا۔

"کچھ لوگوں کے پاس ڈیری فارم ہوتے ہیں' کچھ لوگوں کے پاس پولٹری فارم۔ میرے پاس لڑکیوں کا فارم ہے' ایک سے ایک حسین لڑکی میرے پاس ہے۔ ان میں سے ایک لڑکی کو میں نے ماڈل گرل کے روپ میں شہریار کے پاس بھیجا تھا۔ میں نے اسے سب کچھ سمجھا دیا تھا کہ وہاں جا کر اسے کس طرح ناٹک کھیلنا ہے۔ وہ گئی اور دوسرے دن واپس آکر اس نے جو رپورٹ مجھے دی' آپ اسے غور سے سنیں۔"

وہ ایک گھونٹ پینے لگا اور سنانے لگا۔ وہ لڑکی کے چشم دید واقعات تھے اور اتنی تفصیل کے ساتھ تھے کہ ناصر کی نگاہوں کے سامنے ایک فلم چلنے لگی۔ سامنے ٹی وی آن تھا۔ مگر اب ٹی وی کی اسکرین پر وہ لڑکی نظر آ رہی تھی۔ وہ مس روزی کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ مس روزی فون پر کسی سے باتیں کر رہی تھی بلکہ باتوں کے جواب میں صرف ہوں ہاں کر رہی تھی۔ پھر اس نے لڑکی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"باس! ایک لڑکی آئی ہے .... جی .... جی ہاں ناک نقشہ اچھا ہے۔ سیکسی ہے' باتھنگ سوٹ والے اشتہار میں خوب جچے گی۔ یو مے ہیو اے لک آن ہر.......... ہاں.......... اچھا.......... بھیج دیتی ہوں۔"

اس نے ریسیور رکھ کر لڑکی سے کہا۔ "تم باس کے کمرے میں جا سکتی ہو۔"

"تھینک یو۔" لڑکی اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کمرے سے باہر جانے لگی۔

نگاہوں کے سامنے اسکرین پر جو فلم چل رہی تھی' اس کا منظر بدل گیا۔ اب لڑکی اس دروازے پر دستک دے رہی تھی جس پر شہریار خان کے نام کی پلاسٹک پلیٹ لگی ہوئی تھی۔

"کم اِن۔" اندر سے آواز آئی۔

لڑکی دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔ شہریار بڑی میز کے پیچھے ایک ریوالونگ چیئر میں

دھنسا ہوا تھا۔ لڑکی نے ایک نظر اسے دیکھا۔ دوسری مختصر سی نظر کمرے پر ڈالی۔ وہ کمرہ دفتر بھی تھا اور بیڈروم بھی۔ میز کے ایک طرف دیوار تھی جہاں حسین لڑکیوں کی تصویریں تھیں۔ دوسری طرف ذرا فاصلے پر فوم کا ملائم بستر تھا اور جہاں وہ کھڑی تھی' وہاں آس پاس جوان عورتوں کے مجسمے تھے جن پر مختلف ملبوسات نمونے کے طور پر سجائے گئے تھے۔

وہ سر جھکائے آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کمرے کے وسط میں آکر کھڑی ہوگئی۔ شہریار اپنی جگہ سے اُٹھ کر اس کی طرف آرہا تھا۔ اسے سر سے پیر تک دیکھ رہا تھا۔ نگاہوں کی انگلیوں سے ٹٹول رہا تھا۔ پھر وہ بالکل قریب آگیا۔ اس کے چہرے کی ساخت کو غور سے دیکھنے لگا۔ بیضوی چہرہ' ستواں ناک' سانسوں کی حدت سے پھڑکتے ہوئے گلابی نتھنے اور گلابی ہونٹ لرزتے ہوئے' ترستے ہوئے اور ایک انجانے بوسے کو پکارتے ہوئے بھی چپ تھے۔ وہ آنکھوں کو نہ دیکھ سکا کیونکہ لانبی پلکیں جھکی ہوئی تھیں۔

پھر وہ چاروں طرف گھوم کر اسے اوپر سے نیچے تک دیکھنے لگا۔ اس کے پیچھے آکر اس نے پوچھا۔ "نام؟"

"مرجانہ یاسمین۔"

"مرجانہ بہت پرانے زمانے کا نام ہے مگر لوگ تمہیں دیکھ کر مرجاتے ہوں گے۔"

شہریار کے لہجے میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی۔ جیسے خود مرتے مرتے بچنے کی سعی میں مصروف ہو۔ پھر اس نے سامنے آکر پوچھا۔ "عمر؟"

"سترہ سال۔"

"ہر لڑکی سولہ کی ہوتی ہے یا سترہ کی۔ کوئی اس عمر سے آگے نہیں بڑھنا چاہتی۔ کیا پہلے کسی اشتہار میں آچکی ہو؟"

"جی نہیں۔"

"پھر تو مشکل ہے۔ نئی لڑکیاں شرماتی ہیں اور ہمارا بہت سا وقت اور کئی کئی فٹ کی فلمیں ضائع کر دیتی ہیں۔"

"میں' میں کوشش کروں گی کہ آپ کا نقصان نہ ہو۔"

"کیا تم کیمرے کو دیکھ کر بے باکی سے مسکرا سکتی ہو؟ فرض کرو کہ تمہارے سامنے کیمرہ ہے' ادھر دیکھو اور مسکراؤ۔"

مرجانہ کی پلکیں آہستہ آہستہ اٹھ گئیں۔ اس کی آنکھوں میں گہرائی تھی اور ایک ایسی چمک تھی جو دیکھنے والوں کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ شاید شہریار کو بھی کھینچ رہی

تھی۔ وہ منہ پھیر کر میز کی طرف چلا گیا۔ پھر میز پر دونوں ہاتھ ٹیک کر یوں جھک گیا جیسے شرابی لڑکھڑانے سے پہلے سنبھل رہا ہو۔

تھوڑی دیر بعد اس نے گھوم کر اسے دیکھا۔ وہ کسی قدر جھینپ رہی تھی اور مسکرا رہی تھی۔

"تمہاری مسکراہٹ میں جھجک ہے' حجاب ہے۔ اگر غسل کے مختصر سے لباس میں تمہاری اس مسکراہٹ کے ساتھ تصویر اتاری گئی تو یہ تاثر قائم ہوگا کہ باتھنگ سوٹ ایک بیہودہ لباس ہے جسے پہن کر لڑکیاں شرماتی ہیں۔ اس طرح تم ہمارا کاروبار چوپٹ کردو گی۔ نہیں تم اس ٹریڈ کے قابل نہیں ہو۔ میں تمہیں ماڈل نہیں بنا سکتا۔ تم جا سکتی ہو۔"

مرجانہ کا چہرہ مرجھا گیا۔ وہ جلدی سے اس کے قریب آتی ہوئی بولی۔ "پلیز مسٹر شہریار! مجھے ایک موقع اور دیجئے۔ میں بے باکی سے مسکرانے کی کوشش کروں گی۔ آپ نہیں جانتے میں بہت مجبور لڑکی ہوں۔ میری آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ آپ نے انکار کیا تو میں کہیں کی نہ رہوں گی۔ میں یہاں بہت سی امیدیں لے کر آئی ہوں۔"

"یہاں آنے سے پہلے تم کیا کرتی تھیں؟"

"ملازمت تلاش کرتی تھی۔ ہر جگہ مایوسی ہوئی۔ میرے ڈیڈی ایک فرم میں ملازمت کرتے تھے۔ پچھلے ماہ وہ زینے سے گر پڑے۔ سر پر ایسی چوٹیں آئیں کہ آنکھوں کی بینائی چلی گئی۔ وہ اندھے ہوگئے ہیں۔ گھر میں وہ ہیں یا میری ایک بہن ہے۔ میں ہی ان دونوں کا سہارا ہوں۔"

"کیا سر میں چوٹ آنے سے آدمی اندھا ہو جاتا ہے؟" اس نے بے یقینی سے پوچھا۔

"میں نہیں جانتی۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ بعض اوقات ایسا ہو جاتا ہے۔ آپ کو یقین نہ ہو تو آپ کسی وقت بھی میرے ڈیڈی کو جا کر دیکھ سکتے ہیں۔ میں نے مس روزی کو اپنے گھر کا پتہ لکھوا دیا ہے۔"

"مجھے کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں تمہارے متعلق مکمل معلومات حاصل ہو جائیں گی۔ بہرحال میں تمہیں موقع دوں گا۔"

لڑکی کا چہرہ خوشی سے کھل گیا۔ شہریار نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں' تمہیں اس طرح مسکرانا چاہئے۔ یہ تم نے دوپٹہ کیوں لپیٹ رکھا ہے' اسے پھینکو۔"

مرجانہ ایک لمحے کے لئے ہچکچائی' پھر اس نے نظریں جھکاتے ہوئے دوپٹے کو اتار کر فرش پر چھوڑ دیا۔ جسم پر بیل باٹم اور پھولدار شرٹ رہ گیا۔ سرخ اور سنہرے پھول کمر کے لوچ پر خم کھا رہے تھے اور سینے کے ابھار پر شعلوں کی طرح لپک رہے تھے۔ شہریار اسے دیکھتا رہا اور بے خیالی میں میز کے سرے کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر بھینچتا رہا۔ مرجانہ نے پوچھا۔

"مجھے کام مل جائے گا؟"

"مل سکتا ہے۔ تم اپنا لباس خود تیار کرتی ہو یا کسی ٹیلر کے پاس جاتی ہو؟"

"خود ہی سلائی کرتی ہوں۔"

اس نے میز کے ایک دراز کو کھولتے ہوئے کہا۔ "اپنے سینے' کمر اور کولھے کا ناپ بتاؤ؟"

"چھتیس' چھبیس اور چھتیس۔" مرجانہ نے جواب دیا۔

اس نے دراز سے ایک فیتہ نکالا اور اس کے قریب آ کر بولا۔

"ہاتھ اٹھاؤ۔"

اس نے دونوں ہاتھ اٹھا دیئے۔ وہ فیتے کو اس کی پشت کی جانب سے لا کر سینے کی بلندیوں پر ٹھہر گیا' تھم گیا' تھک گیا۔ پھر کسی کوہ پیما کی طرح ہانپتے ہوئے کمزور سی آواز میں بولا۔

"میں ماڈلنگ کی دنیا میں تمہیں آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دوں گا۔"

وہ لفظوں کی رشوت دے رہا تھا۔ اتنی دیر میں پہلی بار زبان سے کمزوری کا اظہار کر رہا تھا۔

"تمہاری شادی ہو چکی ہے؟"

"نہیں۔"

"کوئی بوائے فرینڈ؟"

"نہیں' میں کنواری رہ کر پہلے اپنا مستقبل بنانا چاہتی ہوں۔"

فیتہ اس کی کمر کے نشیب میں لرزنے لگا۔ وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔

"میں تمہارا مستقبل بناؤں گا۔ جو لڑکیاں ماڈل کے لئے پہلی بار آتی ہیں انہیں پانچ چھ سو روپے سے زیادہ نہیں دیئے جاتے۔ میں تمہیں ایک تصویر کے ایک ہزار دوں گا۔"

فیتہ کولھوں کے ابھار تک پہنچ کر فرش پر گر پڑا۔ اس کے خالی ہاتھ وہاں رہ گئے۔

کھلی ہتھیلیاں بھٹکنے لگیں۔ وہ جلدی سے ایک قدم پیچھے ہٹ کر بولی۔

"یہ' یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟"

وہ شرابی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "بہت سی لڑکیاں پیڈ باندھ کر آتی ہیں اور ہمیں دھوکہ دیتی ہیں کہ وہ چھتیس چھبیس چھتیس ہیں۔ مجھے دیکھنے دو کہ تم پیڈ استعمال کرتی ہو یا نہیں۔"

"نہیں' میں استعمال نہیں کرتی۔"

"تو پھر سانچ کو آنچ کیا ہے۔ یہ کپڑے اتار دو' میں دیکھنا چاہتا ہوں۔"

وہ دوسری طرف منہ پھیر کر بولی۔ "آپ .... آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ میں عزت کی روزی حاصل کرنے آئی ہوں۔"

"تم صحیح جگہ آئی ہو۔ یہاں سے تمہیں عزت بھی ملے گی' شہرت بھی ملے گی اور دولت بھی۔ میری بات مان جاؤ۔ جو کہتا ہوں' وہ کرو۔ تم جو کہو گی' وہ میں کروں گا۔"

"میں جو کہتی ہوں' میں جو چاہتی ہوں' وہ آپ مجھے نہیں دے سکتے۔ آپ زیادہ سے زیادہ ایک ہزار دے سکتے ہیں لیکن میں ہر نوجوان لڑکی کی طرح اونچے خواب دیکھتی ہوں۔ ایک کار' ایک کوٹھی' ایک سے ایک عمدہ لباس' ہائی سوسائٹی' بہت اونچے خواب ہیں میرے۔"

وہ اس کے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا اور دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر رکھتے ہوئے بولا۔

"خواب کی تعبیر آہستہ آہستہ سامنے آتی ہے۔ تم ایک ہی رات میں دولت مند نہیں بن سکتیں۔"

"کیوں نہیں بن سکتی؟" اس نے پلٹ کر کہا۔ "میں عورت ہوں۔ اسمگلنگ کا کاروبار نہیں کر سکتی مگر میں ریس کھیل سکتی ہوں۔ کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ تاش کھیلنے بیٹھوں تو میرے پاس تین اکے آ جائیں اور میں ایک ہی داؤ میں لاکھوں روپے سمیٹ لوں۔ یا پھر ایسا جوا کھیلوں جس میں ہارنے کا اندیشہ نہ ہو۔ میں دو لگاؤں تو چار وصول ہو جائیں۔"

وہ باتوں ہی باتوں میں اشارتاً کہہ گئی کہ سٹہ ہی ایک ایسا جوا ہے کہ دو لگاؤ تو چار آ جاتے ہیں۔ شہریار نے سنا اور سمجھا لیکن اس کی عیاری کو نہ سمجھ سکا کیونکہ اس کی نظریں مرجانہ کی شرٹ کے کھلے ہوئے گریبان کو دیکھ رہی تھیں۔ نہ جانے اس نے کس وقت شرٹ کے اوپری دو بٹن کھول دیئے تھے۔ سینے کی نصف گلابیاں ابھر کر عین نگاہوں کے

سامنے آ گئی تھیں اور شہریار کی کمزوری سے کھیل رہی تھیں۔ یعنی مرجانہ بالکل اسی طرح کھیل رہی تھی، جس طرح شہریار سگریٹ کا پیکٹ ردی کی ٹوکری میں پھینک کر انسپکٹر کمال وارثی کی نفسیات سے کھیلتا رہا تھا۔

مرجانہ نے خاموش نظروں سے اسے دیکھا۔ اس کی پیشانی سے پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ وہ ہونٹوں کو سختی سے بھینچے ایسی ہوس بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے ابھی ہاتھ بڑھائے گا اور مرجانہ کے گریبان کی دھجیاں اڑا دے گا۔ ذرا دیر بعد اس کے ہونٹ کانپنے لگے۔ وہ گریبان کے پسِ پردہ چکراتے ہوئے بولا۔

"سٹہ ہی ایک ایسا کھیل ہے جس میں دو لگاؤ تو چار ملتے ہیں۔"

"سچ!" وہ ایک دم قریب ہو کر بولی۔ "یہ سٹہ کس طرح کھیلا جاتا ہے؟ مجھے بتائیے، کیا میں دولت مند بن سکتی ہوں؟"

اس نے یکبارگی اس کی گردن میں بانہیں ڈال دیں۔ شہریار ایک دم سے گڑبڑا گیا۔ چھتیس کی بلندیاں اس کے سینے سے ٹکرا رہی تھیں۔ اس کے دل سے لگ کر دھڑک رہی تھیں۔ وہ اسے اپنے بازوؤں کے شکنجے میں لے کر اس کے لبوں پر جھک گیا۔ وہ ایک ادائے ناز سے کترا کر بولی۔

"اُوں ہونہہ، پہلے میرا مستقبل بنائیے۔ مجھے بتائیے کہ یہ سٹہ کیسے کھیلا جاتا ہے؟"

"میں سب کچھ بتا دوں گا مگر پہلے............"

وہ ایک جھٹکے سے الگ ہو گئی۔ دو قدم پیچھے چلی گئی۔ شہریار آگے بڑھا، وہ پھر کترا گئی۔

"کیا ہوا؟ تم قریب آ کر دور کیوں جا رہی ہو؟"

"آپ خودغرض ہیں، صرف اپنے مطلب کی بات کرتے ہیں۔ میں بازاری لڑکی نہیں ہوں۔ خوب سوچ سمجھ کر خود کو داؤ پر لگاؤں گی۔ پہلے مجھے بتائیے کہ یہ سٹہ کیسے کھیلا جاتا ہے؟"

"یہ ایک آسان سا کھیل ہے۔ کسی ایک نمبر پر روپے لگائے جاتے ہیں۔ اگر وہ نمبر آ جائے تو جیتنے والوں کو دوگنی رقم ملتی ہے۔ میں ایک بار کھیل چکا ہوں۔ پانچ ہزار لگا کر دس ہزار جیت چکا ہوں۔ میں تمہیں وہ جگہ بتا دوں گا۔ تم وہاں جا کر اپنی مرضی کے کسی نمبر پر جتنی رقم چاہو لگا دینا۔"

"اگر وہ نمبر نہ آیا تو؟"

"تو وہ رقم ڈوب جائے گی۔"

"یہ بھی کوئی کھیل ہے۔ آپ مجھے ڈبونا چاہتے ہیں؟"

وہ قریب آ کر بولا۔ "میں بہت لکی ہوں۔ تم میرے بتائے ہوئے نمبر پر رقم لگانا، ضرور جیت جاؤ گی۔"

"سچ!" وہ خوشی کے مارے آگ کے شعلے کی طرح اس سے لپٹ گئی۔

اسی وقت فون کی گھنٹی چیخنے لگی۔ شہریار نے ناگواری سے فون کی طرف دیکھا۔ وہ مرجانہ کی مرمریں بانہوں سے نکلنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ لڑکی بڑی مشکل سے اس کی آغوش میں پگھلنے آئی تھی مگر فون کال ضروری بھی ہو سکتی تھی۔ وہ جھلاتے ہوئے میز کے پاس گیا اور ریسیور اٹھا کر گرجنے لگا۔

"کون ہے؟ کیا بات ہے؟ کیوں ڈسٹرب کیا جا رہا ہے؟"

پھر وہ دوسری طرف کی آواز سن کر یک لخت خاموش ہو گیا اور ریسیور کو کان سے لگائے ہوں ہاں کرنے لگا۔ اس کے بعد وہ تعجب سے "اچھا" کہہ کر مرجانہ کو دیکھنے لگا۔ مرجانہ سمجھ گئی کہ فون پر اسی کا ذکر ہو رہا ہے۔ وہ شہریار کے چہرے سے تاڑنے لگی۔ فون پر جو کچھ کہا جا رہا تھا، اس کا ردِ عمل شہریار کی آنکھوں سے ظاہر ہو رہا تھا۔ وہ آنکھیں سکیڑ کر ذرا چبھتی ہوئی نظروں سے مرجانہ کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے ریسیور رکھ کر غراتے ہوئے پوچھا۔

"تمہیں یہاں آ کر ماڈل بننے کا مشورہ کس نے دیا تھا؟"

"کک............ کسی نے نہیں۔ میں اپنی مرضی سے آئی ہوں۔" مرجانہ کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

"تم جھوٹ بولتی ہو، ابھی تم نے کہا تھا کہ تمہارا کوئی بوائے فرینڈ نہیں ہے۔ پھر یہ کنور شمشاد تمہارا کون ہے؟"

مرجانہ نے اطمینان کی سانس لی لیکن اس نے جواب نہیں دیا، خاموشی سے سر کو جھکا لیا۔ شہریار نے کہا۔

"تم سمجھ رہی تھیں کہ ہم سے کوئی بات چھپی رہ جائے گی۔ تمہارے بتائے ہوئے پتے پر میرا ایک آدمی انکوائری کے لئے گیا تھا۔ یہ درست ہے کہ تمہارا ایک اندھا باپ ہے اور ایک بہن ہے۔ میرے آدمی نے تمہارے باپ سے باتیں کیں اور اسے جھانسا دیا کہ شہریار ماڈل سینٹر میں مرجانہ کو اسی شرط پر ملازمت مل سکتی ہے کہ وہ شادی شدہ ہو یا

ایک ماہ کے اندر اس کی شادی ہو جائے۔ تمہارے باپ نے بتایا کہ عنقریب تمہاری شادی ہو جائے گی۔ تم کنور شمشاد کو چاہتی ہو۔ وہ تمہارے ہاں اکثر آتا رہتا ہے۔ کیا یہ اطلاع غلط ہے؟''

''نہیں' میرے ڈیڈی نے جو کچھ کہا ہے وہ درست ہے۔ کنور شمشاد سے میری دوستی ہے لیکن میں اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔ میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ میں پہلے اپنا مستقبل بناؤں گی۔ آپ مجھ پر اس لئے ناراض ہو رہے ہیں کہ میرا ایک بوائے فرینڈ نکل آیا ہے۔''

''تمہارے بوائے فرینڈ کی ایسی کی تیسی۔ تمہیں یہاں کام نہیں ملے گا۔''

''میرا قصور؟''

''تم میرے دشمنوں کے مشورے پر یہاں آئی ہو۔''

''آپ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔''

''سنو بے بی! میں دوست اور دشمن کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ میرے آدمی نے تمہارے باپ سے کنور شمشاد کا پتہ پوچھا تھا۔ پتہ معلوم ہونے پر یہ بات سامنے آئی کہ کنور شمشار وہی ہے جو میرے چند دشمنوں کے ساتھ اکثر دیکھا گیا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ان میں سے کسی دشمن نے تمہیں یہاں کسی خاص مقصد کے لئے بھیجا ہو؟''

''آپ میرے متعلق بہت کچھ سوچ سکتے ہیں لیکن میں آپ کے کسی دشمن کو نہیں جانتی۔ میں ماڈلنگ کی دنیا میں اپنا کیریئر بنانے کے لئے آئی ہوں۔ آپ نے میرے اونچے خوابوں کو سنا اور مجھے سٹہ کھیلنے کا مشورہ دیا۔ میں نہیں جانتی کہ یہ سٹہ کیا ہوتا ہے۔ آپ نے خود ہی مجھے اتنی بڑی جیت کا لالچ دیا ہے کہ میں خود کو آپ کے سامنے داؤ پر لگانے کے لئے آمادہ ہو گئی ہوں۔''

شہریار اسے گہری نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس کی طرف دیکھنا ہی مہنگا پڑتا تھا۔ نظریں پھر کسی نظارے کی طرف نہیں بھٹکتی تھیں' اسی کی ہو کر رہ جاتی تھیں۔ اس پر غضب یہ کہ شرٹ کا تیسرا بٹن بھی کھل گیا تھا۔

پھر اس سے پہلے کہ وہ ڈگمگا جاتا' دوبارہ فون کی گھنٹی چیخنے لگی۔ اسے مجبور کرنے لگی کہ وہ مرجانہ سے اپنی نظریں ہٹا لے۔ وہ مجبوراً فون کی طرف پلٹ گیا۔ ایک جھٹکے سے ریسیور اٹھا کر کہنے لگا۔

''اب کیا ہے؟ کیوں بار بار مجھے پریشان کر رہی ہو؟''

اس نے چند لمحوں تک دوسری طرف کی باتیں سنیں' پھر کہا۔

''اگر وہ ابھی تک میرے کمرے میں ہے تو کیا ہوا؟ مجھے کھا تو نہیں جائے گی؟ جب میں کہہ چکا ہوں کہ اسے چانس نہیں دیا جائے گا تو تمہیں مطمئن ہو جانا چاہئے۔ وہ ابھی یہاں سے جا رہی ہے۔''

اس نے ریسیور کو کریڈل پر پٹخ دیا لیکن اس بار گھوم کر مرجانہ کو دیکھنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اسے دیکھتے ہی شوقِ دید میں اضافہ ہو جائے گا' اس نے وہیں سے منہ پھیر کر کہا۔

''چلی جاؤ یہاں سے۔ تمہارے لئے یہاں کوئی کام نہیں ہے۔ میں نہیں جانتا کہ تم دشمن بن کر آئی ہو یا دوست بن کر' مگر میں تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔ تم میرا وقت ضائع نہ کرو۔ چلی جاؤ۔ ابھی چلی جاؤ۔ میں تمہیں دیکھنا تو کیا تمہاری آواز سننا بھی گوارا نہیں کروں گا۔ اگر تم نہیں جاؤ گی تو ملازم تمہیں دھکے دے کر باہر نکال دیں گے۔ تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ چپ چاپ یہاں سے چلی جاؤ۔ مجھ پر تمہارا جادو نہیں چلے گا۔''

وہ نظریں چرا رہا تھا۔ ہاتھ اٹھا اٹھا کر چیخ رہا تھا کہ وہ نظروں سے دور ہو جائے۔ اسے دور بھگانے کا یہی طریقہ بہتر تھا کہ اس سے نظریں پھیر لی جائیں' کیونکہ سارا قصور آنکھوں کا ہوتا ہے۔ آنکھ ہی دیکھتی ہے' آنکھ ہی سمجھاتی ہے کہ جو حُسن سامنے نظر آ رہا ہے' اس کے پیچھے بھی' اس کے اندر بھی' اس کی گہرائی میں بھی بہت سے خزانے چھپے ہوئے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد شہریار کو احساس ہوا کہ وہ خواہ مخواہ چیخ رہا ہے۔ اب وہ جواب دینے والی موجود نہیں ہے اور وہ کمرہ اس کے وجود سے خالی ہو گیا ہے۔ تب اسے زندگی میں پہلی بار یوں لگا کہ وہ بہت بڑی بازی ہار گیا ہے۔ ایک انمول اور نایاب ہیرا اس کے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ اس نے تیزی سے پلٹ کر دیکھا۔ پہلی نظر میں کمرہ خالی نظر آیا۔ پھر دروازے پر نظر گئی۔ دروازے کی چٹخنی اندر سے لگی ہوئی تھی۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ یعنی وہ باہر نہیں گئی تھی۔

پھر اس نے شہریار کی نگاہوں کو کھینچ لیا۔ ایک عورت کے بے جان مجسمہ کے پیچھے وہ شرٹ لہرایا۔ سرخ اور سنہرے پھول جھلملائے۔ پھر وہ شرٹ نیچے فرش پر گر پڑا۔ شہریار کے جسم کا سارا خون سمٹ کر دماغ میں آ گیا اور پکتے ہوئے لاوے کی طرح کھولنے لگا۔ وہ نظر آ رہی تھی۔ وہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ سامنے بے جان مجسمہ تھا' جو ملبوس تھا' اس کے پیچھے

جاندار مجسمہ تھا جو لباس سے بے نیاز ہو رہا تھا۔ ایک ایک کپڑا آہستہ آہستہ کیلے کے چھلکے کی طرح اترتا جا رہا تھا۔ وہ نظر نہیں آ رہی تھی مگر یہ جو آنکھ ہے نا یہ سمجھاتی ہے کہ لباس کی تجوری کھل جائے تو باقی کیا رہ جاتا ہے۔

شہریار ایک قدم آگے بڑھا اور ڈگمگا گیا۔ شرابی کے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔

وہ مجسمے کے پیچھے سے اچانک ہی تیزی سے نکلی۔ ایک اُجلا' چمکتا ہوا' دمکتا ہوا چاندی جیسا بدن بجلی کی طرح کوند گیا اور دوسرے مجسمے کے پیچھے جا کر چھپ گیا۔ وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔ اپنی بصارت کی تمام قوتوں کو سمیٹ کر مجسمے کے پیچھے اسے ڈھونڈنے لگا۔ پھر اس نے ایک ہاتھ اٹھا کر التجا کی۔

"مر' مرجانہ .... نہ جانا .... تم نہ جانا .... آ جاؤ۔ میرے پاس آ جاؤ۔ تمہارے تمام اونچے خوابوں کی تعبیر میرے پاس ہے۔ تم جو مانگو گی' وہ ملے گا۔"

وہ دونوں ہاتھ اور دونوں گھٹنوں کے بل فرش پر رینگنے لگا۔ مجسمے کے پیچھے سے اس نے انگڑائی لی۔ انگڑائی کی اٹھان پر اور کمان کی طرح خم کھانے پر بدن کا کچھ حصہ جھلک گیا۔ کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح وہ نظارہ آنکھوں میں آ کر پیوست ہو گیا۔ پھر اس کی مترنم آواز لہرائی۔

"جو مانگوں گی' وہ ملے گا؟"

"ہاں ملے گا۔ تم میرے پاس آ کر مانگو۔"

"اُوں ہونہہ' پہلے نمبر بتاؤ۔ میں ایک ہی رات میں اپنے خوابوں کی تعبیر دیکھنا چاہتی ہوں۔ تم مجھے دشمن نہ سمجھو۔ میں تمہیں دوست بن کر دکھاؤں گی۔"

وہ پردے سے باہر آ گئی۔ اپنے ایک ہاتھ کو سر کے پیچھے اور دوسرے ہاتھ کو کمر کے پیچھے رکھے ایسی بانکی ترچھی ادا سے کھڑی ہو گئی کہ جسم کی تمام شادابیاں ہزار ہا قمقموں کی طرح جگمگ جگمگ کرنے لگیں۔ شہریار کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ وہ ایک تنکے کی طرح اڑتا ہوا قریب چلا آیا۔ دماغ کا سوئچ آن ہو رہا تھا' آف ہو رہا تھا۔ نظارہ روشن ہو رہا تھا' بجھ رہا تھا۔ نظارے نے کہا۔

"نمبر بولو!"

چھتیس نمبر چھبیس نمبر چھتیس نمبر۔ وہ ہانپتے کانپتے ہوئے کہنے لگا۔ "نمبر سات .... لکی سیون۔ تم سات پر رقم لگاؤ۔ ہزار دو ہزار' لاکھ دو لاکھ جتنا لگاؤ گی' اس سے دُگنا پاؤ گی۔ آؤ اب مجھے پا لینے کا یقین کرنے دو۔"

ٹی وی کی اسکرین پر فلم چل رہی تھی۔ مناظر بدلتے جا رہے تھے۔ آخری منظر کے بعد اسکرین سادہ ہو گئی۔ جمشید اپنی جگہ سے اٹھ کر لڑکھڑاتا ہوا ٹی وی کے پاس آیا اور سوئچ آف کرنے کے بعد بولا۔

"ٹی وی کے پروگرام بعض اوقات بہت بور کرتے ہیں۔"

ناصر نے وہسکی کا گلاس اٹھاتے ہوئے کہا۔ "مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں وہ سب کچھ اس اسکرین پر دیکھ رہا ہوں جو آپ کہتے جا رہے ہیں۔ ہاں تو آگے کہئے' کیا ہوا؟ کیا مرجانہ نے سات نمبر پر رقم لگائی تھی؟"

"وہ اُلو کی پٹھی کیا رقم لگائے گی۔ وہ تو ڈبل گیم کھیلتی ہے۔"

"کیا مطلب؟ کیا وہ آپ کے ماتحت نہیں ہے؟ آپ کے اشاروں پر نہیں چلتی ہے؟"

"نہیں' پہلے وہ معاملات کو اچھی طرح سمجھتی ہے۔ پھر ایک معقول معاوضہ لے کر اپنے طور پر کام کرتی ہے۔ میرے فارم میں جتنی لڑکیاں ہیں ان میں سے کچھ آزاد ہیں۔ خصوصاً مرجانہ اتنی ذہین اور تیز طرار ہے کہ میں جان بوجھ کر اسے ڈھیل دیتا ہوں اور اسے اس کے کام کا زیادہ سے زیادہ معاوضہ ادا کرتا ہوں۔

ہمارے درمیان یہ طے پایا تھا کہ اگر وہ شہریار کو اُلو بنا کر نمبر معلوم کر لے گی تو میں اسے تین ہزار روپے دوں گا۔ وہ بہت مہنگی ہے۔ صرف لباس اتارنے کے تین ہزار لیتی ہے اور ایسے کام کے لئے اس وقت آمادہ ہوتی ہے' جب اسے تین ہزار کے علاوہ دوسرے ذرائع سے بھی زیادہ سے زیادہ منافع کی توقع ہوتی ہے۔ یوں سمجھئے کہ وہ اکثر ایک تیر سے دو شکار کھیلتی ہے۔"

"ایسی عورتیں خطرناک ہوتی ہیں۔" ناصر نے ایک کڑوا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ "ایسے معاملات میں ایسی عورت سے کام لینا چاہئے جو پوری طرح ہماری مٹھی میں ہو اور ہمارے اشاروں پر ناچتی ہو۔"

جمشید نے گلاس میں وہسکی انڈیلتے ہوئے کہا۔ "میرے اشاروں پر ناچنے والی بہت سی لڑکیاں ہیں۔ وہ حسین بھی ہیں' دل نشین بھی ہیں لیکن شہریار جیسے فولاد کو پگھلانے کے لئے ایک ایسی حسینہ کی ضرورت تھی جو نوخیز بھی ہو اور دھماکہ خیز بھی' جس کے بدن میں بجلیاں بھری ہوں اور ایسی مرجانہ ہے جو چوبیس ہزار وولٹ کی بدنی حرارت سے فولاد کو پانی کر دیتی ہے۔ اسی لئے میں اس سے کام لینے پر مجبور ہو گیا ہوں۔

بہرحال جب مرجانہ نے مجھے بتایا کہ چار تاریخ کو سات نمبر کھلے گا تو میں سوچنے لگا کہ مجھے اس نمبر پر کتنی رقم لگانی چاہئے۔ بڑی سے بڑی رقم لگانے سے پہلے اس بات کا یقین ہونا چاہئے تھا کہ شہریار واقعی ہمارا باس ہے اور اس نے جو نمبر مرجانہ کو بتایا ہے وہ نمبر ہر حال میں چار تاریخ کو شام کے چھ بجے کھلے گا۔

ناصر صاحب! آپ اس بات کے لئے اس فون کال کو یاد کریں جس کے ذریعے شہریار کو مرجانہ کے متعلق معلومات حاصل ہوئی تھیں اور اس نے کہا تھا کہ مرجانہ اس کے دشمنوں کی طرف سے کسی خاص مقصد کے لئے آئی ہے۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں نے مرجانہ کو ماڈل گرل بنا کر وہاں بھیجا ہے' کیونکہ مرجانہ کا بوائے فرینڈ کنور شمشاد اکثر میرے ساتھ دیکھا گیا ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ شہریار کا آدمی اتنی جلدی مرجانہ کے گھر پہنچے گا۔ وہاں اسے مرجانہ اور کنور شمشاد کے تعلقات کا علم ہو گا اور اس طرح کنور شمشاد کے ذریعے شہریار مجھ پر شبہ کرے گا۔ اس نے کھل کر میرا نام نہیں لیا۔ اگر وہ میرا نام لیتا تو یہ پتہ چل جاتا کہ وہ باس کی حیثیت سے مجھے جانتا ہے اور جو سازش ہو رہی ہے' اس کی نوعیت کو سمجھتا ہے۔

میری ان باتوں پر غور کریں تو گمان گزرتا ہے کہ وہی ہمارا باس ہے اور محض اپنی ایک کمزوری سے مجبور ہو کر اور مرجانہ کی آغوش میں بہک کر اس نے نمبر بتایا ہے۔ معاوضے کے طور پر عورت کو سب ہی نقدی دیتے ہیں' اس نے کلی نمبر دے دیا۔

میں نے سوچ سمجھ کر نہ زیادہ رقم لگائی نہ کم۔ میں نے سات نمبر پر چالیس ہزار روپے لگا دیئے۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں' مرجانہ پہلے اپنے فائدے کی بات کرتی ہے' اس نے نمبر بتانے سے پہلے یہ طے کر لیا تھا کہ چالیس ہزار لگانے کے بعد جو مزید چالیس ہزار کا منافع ہو گا اس میں سے وہ بیس ہزار لے گی۔ میں نے انکار نہیں کیا' اس لئے کہ مجھے اس منافع سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ میں تو باس کے گریبان تک پہنچنا چاہتا تھا۔"

ناصر نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے پوچھا۔ "پہلے یہ بتایئے' کیا سات نمبر نکل آیا؟"

جمشید نے ایک گھونٹ پینے کے بعد اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو نشہ چڑھ رہا ہے۔ بھئی مرجانہ پچھلے ماہ کی تیس تاریخ کو گئی تھی اور آج چار تاریخ ہے۔ ابھی شام کے چھ بجے نمبر آؤٹ ہو چکا ہے۔ ابھی تو صرف پانچ گھنٹے گزرے ہیں۔ کیا آپ بھول گئے کہ اس گمنام شخص نے دو نمبر کا اعلان کیا ہے؟"

"اوہو' میں نے خیال نہیں کیا کہ آپ پچھلے پانچ دنوں کی باتیں کر رہے ہیں۔ آج تو دو نمبر آؤٹ ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے چالیس ہزار ڈوب گئے؟"

"ہاں ڈوب گئے۔"

"مرجانہ کیا کہتی ہے؟"

"وہ کیا کہے گی۔ وہ تو صرف میرے منافع میں شریک تھی۔ شہریار نے اسے جو نمبر بتایا' اس نے مجھے بتا دیا۔ اب وہ نمبر نہ آئے تو وہ کیا کر سکتی ہے؟ زیادہ سے زیادہ شہریار سے شکایت کرے گی اور وہ کہے گا کہ یہ قسمت کا کھیل ہے۔ مرجانہ تو یہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ وہ چالیس ہزار کی رقم ہار گئی ہے۔ شہریار پوچھے گا کہ اتنی بڑی رقم اس کے پاس کہاں سے آئی تھی' جبکہ وہ ملازمت کے لئے ماری ماری پھرتی ہے۔"

ناصر نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ شہریار ہمارا باس نہیں ہے۔ اس نے ایک اندازے سے سات نمبر کہا تھا۔"

جمشید نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ یقیناً وہی ہمارا باس ہے۔ عورت اس کی کمزوری سہی' وہ عورت کی آغوش میں جسمانی طور سے بہکتا ضرور ہے مگر دماغی طور پر حاضر رہتا ہے۔ اس نے جان بوجھ کر غلط نمبر بتایا تھا۔ ناصر صاحب! وہ اچھی طرح سمجھ گیا ہے کہ میں اسے بے نقاب کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے مجھے سزا دینے کے لئے غلط نمبر بتا کر مجھے چالیس ہزار کی چوٹ دی ہے۔"

"ویسے آپ سے ایک غلطی ہوئی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"ہم سب جانتے ہیں کہ وہ ٹھیک چھ بجے نمبر بولتا ہے اور آپ نے چار دن پہلے ہی یعنی پچھلے ماہ کی تیس تاریخ کو اس کے آگے مرجانہ کے حسن و شباب کا چارہ ڈالا تھا۔ وہ چار دن پہلے کبھی صحیح نمبر بول ہی نہیں سکتا تھا۔"

"نہیں ناصر صاحب! مجھے تو یہ ایک سٹنٹ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ٹھیک چھ بجے ایک خاص نمبر کا تعین کرتا ہے۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ وہ چار گھنٹے پہلے یا چار دن پہلے سوچ لیتا ہے کہ اسے کون سا نمبر بولنا چاہئے۔ یہ دوسری بات ہے کہ بدلتے ہوئے حالات کے تحت وہ کبھی نمبر تبدیل کرنے پر مجبور ہو جاتا ہو مگر یہ یقینی امر ہے کہ بہت پہلے سے ایک خاص نمبر سوچ لیا جاتا ہے۔"

"چلئے میں آپ کی بات تسلیم کر لیتا ہوں' آپ یہ بتایئے کہ آپ اسے کس طرح

گھیریں گے؟ اس کے خلاف ٹھوس ثبوت حاصل کئے بغیر آپ اسے بلیک میل نہیں کر سکتے۔"

"ٹھوس ثبوت بھی حاصل ہو جائیں گے۔ ابھی اس حد تک یقین ہو گیا ہے کہ وہ گمنام شخص شہریار ہے۔ میں پھر ایک بار مرجانہ کو اس کے پاس بھیج رہا ہوں۔ مرجانہ کہتی ہے کہ شہریار اس کا دیوانہ بن گیا ہے۔ پچھلے تین دنوں سے اسے تلاش کر رہا ہے۔ اس کے گھر کے کئی چکر لگا چکا ہے لیکن وہ چھپی ہوئی تھی اور لکی نمبر کا انتظار کر رہی تھی' جو آن لکی ہو گیا۔"

اسی وقت دروازے پر دستک سنائی دی۔ جمشید نے گلاس رکھتے ہوئے کہا۔ "آ جاؤ۔"

دروازہ کھلا اور ایک خوش پوش اور خوبرو نوجوان اندر آیا۔ جمشید نے اٹھ کر اس سے مصافحہ کیا اور ناصر سے کہا۔

"ناصر صاحب! ان سے ملئے' یہ ہیں کنور شمشاد۔"

ناصر نے آگے بڑھ کر مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

"ابھی آپ کا اور مرجانہ کا ذکر ہو رہا تھا۔ مرجانہ کے حُسن کی تعریف سنی ہے' اب آپ کی بھی مردانہ شخصیت کو دیکھ رہا ہوں اور یہ یقین کرتا ہوں کہ مرجانہ آپ پر واقعی مرتی ہو گی۔"

کنور شمشاد نے اپنی تعریف سن کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"بھئی جب تک وہ میرے عشق میں گرفتار ہے' میں فائدہ اٹھا رہا ہوں۔ وہ اُڑنے والی چڑیا ہے' پتہ نہیں کب اُڑ جائے۔ پچھلے تین دنوں سے شہریار کی تعریفیں کر رہی ہے اور مجھے رقابت کی آگ میں جلا رہی ہے۔ ویسے میں جانتا ہوں کہ وہ بڑی حرافہ ہے۔ ایک مرد کو احساسِ کمتری میں مبتلا رکھنے کے لئے دوسرے مرد کی تعریفیں کرتی ہے۔"

وہ تینوں بیٹھ گئے۔ جمشید نے دوسری بوتل اٹھا کر کنور شمشاد کے لئے ایک پیگ بنایا اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

"بے وقوف عاشق رقابت کی آگ میں جلتے ہیں اور آپ بے وقوف نہیں ہیں۔ کام کی بات کیجئے۔ کیا مرجانہ وہاں پھر جائے گی؟"

کنور شمشاد نے وہسکی کا ذائقہ چکھتے ہوئے جواب دیا۔

"ہاں' کہتی ہے کہ فیس مل جائے گی تو وہاں ضرور جائے گی اور آپ تو جانتے ہیں کہ

وہ تین ہزار لیتی ہے۔"

جمشید نے کڑوے گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔

"تین ہزار میں نے پہلے دیئے' چالیس ہزار کی بازی ہار گیا' اب وہ پھر تین ہزار کا مطالبہ کر رہی ہے۔ کیا آپ میرے نقصان کا اندازہ کر سکتے ہیں؟"

"بہت بڑا فائدہ حاصل کرنے کے لئے یہ بہت تھوڑا سا نقصان ہے۔ پھر یہ کہ مرجانہ کو آپ کے نفع نقصان سے کیا لینا ہے۔ آپ جو کہتے ہیں' وہ کرتی ہے۔ اس کی فراہم کردہ مکمل رپورٹ سے آپ اس یقین تک پہنچے ہیں کہ شہریار آپ لوگوں کا باس ہے۔ اب وہ دوبارہ وہاں جا کر مزید نئی معلومات فراہم کر سکتی ہے۔ دیکھئے وہ آپ کے کام سے وہاں جاتی ہے اور اپنی ایک رات کالی کرتی ہے۔ اس ایک رات کا معاوضہ اسے ضرور ملنا چاہئے۔"

"اچھی بات ہے۔ میں اس کا مطالبہ پورا کروں گا۔ وہ کب جائے گی؟"

"آپ ابھی چیک لکھ دیجئے وہ ابھی چلی جائے گی۔"

جمشید اٹھ کر الماری کے پاس گیا۔ وہاں ایک دراز کھول کر اس نے چیک بک نکالی اور کنور شمشاد کے نام پر تین ہزار کا چیک لکھنے لگا۔ کنور شمشاد نے اپنا گلاس خالی کیا اور سامنے رکھے ہوئے فون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔ جمشید نے قریب آ کر چیک اس کی جانب بڑھایا۔ اس نے چیک لے کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہیلو سویٹ .... مرجانہ! میں ہوں تمہارا شمشاد۔ چیک مل گیا ہے' تم چلی جاؤ۔ کل صبح دس بجے جمشید صاحب کے فون پر ملاقات ہو گی۔ او کے۔"

اس نے ریسیور کے ماؤتھ پیس کا ایک چٹخارے دار بوسہ لیا اور اسے رکھ دیا۔ ٹیلیفون کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ بوسے ایک جگہ سے دوسری جگہ سنسر کے بغیر پہنچ جاتے ہیں۔

شہریار کے کمرے کی فضا گرم تھی۔ وہ دیوانہ وار اِدھر سے اُدھر ٹہل رہا تھا۔ مس روزی ریوالونگ چیئر پر بیٹھی کبھی اسے ہمدردی سے دیکھ رہی تھی اور کبھی غصے سے۔ پھر وہ چیئر پر گھومتی ہوئی بولی۔

”سوچو کہ تم کیا تھے اور میں نے تمہیں کیا بنا دیا۔ میں نے اور مائیکل نے اتنا بڑا دھندا پھیلایا ہے اور تمہیں باس بنا دیا ہے اور میں ایک معمولی سیکرٹری بن کر تمہاری جی حضوری کرتی رہتی ہوں۔ کیا یہ سب اسی دن کے لئے کیا ہے کہ تم ایک معمولی چھوکری کے دیوانے بن جاؤ؟“

وہ تیزی سے قریب آ گیا اور میز پر ایک ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔

”ممی! وہ معمولی چھوکری نہیں ہے۔ تم اسے میرے دل سے‘ میری نظر سے دیکھو۔ وہ شہریار کے دل پر حکومت کرنے کے لئے پیدا کی گئی ہے۔“

”اُونہہ!“ مس روزی نے حقارت سے کہا۔ ”تم ایشیائی لوگ یوں تو ناقابلِ تسخیر ہوتے ہو مگر حسین عورت کی ایک ٹھوکر سے مرجاتے ہو۔ تم وہ دن بھول گئے جب لندن کی سڑکوں پر آوارہ گھومتے تھے اور چرس کا نشہ کرتے تھے۔ اس وقت اگر مرجانہ تمہیں دیکھ لیتی تو تھوک کر آگے بڑھ جاتی۔ تم سمجھتے کیوں نہیں کہ مرجانہ جیسی لڑکیاں مرد کی شخصیت سے نہیں‘ اس کی دولت سے متاثر ہوتی ہیں۔ آج تمہارے پاس کار ہے‘ کوٹھی ہے‘ لاکھوں روپے کا بینک بیلنس ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ تم ایک خفیہ کاروبار کے سب سے اہم رازدار ہو۔ دشمن کسی حسین اور ذہین لڑکی کے ذریعے ہی ہوس کی سرنگ بچھاتے ہوئے تمہارے گریبان تک پہنچیں گے۔

میری طرف دیکھو شہریار! میں نے اپنی زندگی کے چالیس برس یونہی گزار دیئے۔ کسی مرد کو قریب نہیں آنے دیا۔ میں ورجن ہوں‘ کنواری۔ اگر میں کسی کو اپنے دل و دماغ پر حکومت کرنے کا موقعہ دیتی تو نہ جانے کس عاشق کے فریب اور سازش کا شکار ہو جاتی اور اتنی کامیابی سے یہ کاروبار نہ پھیلا سکتی۔ مجھ جیسی عورت ہو یا تم جیسا مرد‘ ہماری

کامیابی کا راز یہی ہے کہ کوئی ہمارے دل و دماغ پر حکومت نہ کرے اور تم کہتے ہو کہ مرجانہ تمہارے دل پر حکومت کرنے کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ شیم آن یو۔“

شہریار نے جھلا کر ایش ٹرے کو ایک ہاتھ مارا۔ ایش ٹرے دور فرش پر شور مچاتا چلا گیا۔

”ممی! تم پتھر ہو۔ میں نہیں ہوں۔ تم یہ غلط کہتی ہو کہ صرف ہم ایشیائی‘ عورت کے دیوانے ہوتے ہیں۔ قلوپطرہ کی ٹھوکروں میں جان دینے والے ایشیائی نہیں تھے‘ تمہاری ہی ذات برادری کے لوگ تھے اور تم نے جو اتنے اونچے مقام پر مجھے بٹھا رکھا ہے تو میری صورت دیکھ کر نہیں بلکہ میری صلاحیتیں دیکھ کر مجھے باس بنایا ہے۔ اس کے باوجود میں تمہارا احسان مند ہوں۔ تم جو کچھ بھی کہتی ہو‘ میری بھلائی کے لئے کہتی ہو۔ تم میرے دشمنوں سے مجھے بچانا چاہتی ہو۔ تم چاہتی ہو کہ میرے آس پاس منڈلانے والی ہر لڑکی میری تمنا کرے لیکن مجھ پر حکومت نہ کرے۔ تم بڑے پتے کی باتیں کرتی ہو مگر میں کب تک کرائے کی لڑکیوں سے بہلتا رہوں گا؟ مرجانہ کو پا کر میں نے سوچا کہ میری یہ دولت‘ جو شیطان کی آنت کی طرح بڑھتی جا رہی ہے‘ وہ میرے بعد کس کے کام آئے گی؟ یہ سٹے بازیاں اور دماغی قلابازیاں کس کے لئے ہیں؟ کوئی تو اپنا ہونا چاہئے اور مرجانہ جیسی لڑکی اپنی نہ بن سکی تو پھر لعنت ہے اس زندگی پر اور اس کاروبار پر۔“

”اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اس لڑکی کو کاروبار پر ترجیح دے رہے ہو۔“

”نہیں‘ ابھی تو دونوں کی اہمیت ہے۔ ہاں اگر کاروبار کا تقاضا یہ ہوگا کہ میں مرجانہ کو چھوڑ دوں‘ تو یہ کبھی نہیں ہوگا۔ وہ میری جان کے ساتھ رہے گی۔ میں کاروبار کو چھوڑ دوں گا اور اگر مرجانہ نے مجھے یا کاروبار کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو میں اُسے .... میں اُسے ....“

”ہاں ہاں کہو‘ رک کیوں گئے؟ ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ وہ غضب کی لڑکی ہے‘ اسے چھوتے ہی تمہارے ہوش اُڑ جاتے ہیں۔ اگر اس کا فراڈ کُھل گیا تو تم اس سے کیسے انتقام لو گے؟“

شہریار نے ایک گہری سانس لی۔ پھر مستحکم لہجے میں کہا۔ ”میں اسے موقع نہیں دوں گا کہ وہ ہمیں نقصان پہنچائے۔ اس سے پہلے ہی میں اسے یہاں سے غائب کر دوں گا۔ اسے اس ملک سے باہر لے جاؤں گا۔“

مس روزی نے مایوسی سے سر ہلا کر کہا۔ ”واقعی مرجانہ کا جادو چل گیا ہے۔ شہریار!

سٹے بازی میں تمہاری ذہانت کا جواب نہیں ہے۔ جتنی خوبصورتی سے تم قانون کو دھوکا دیتے ہو اور اپنے ایجنٹوں کو اپنی مرضی کے مطابق نچاتے ہو۔ اتنی صلاحیتیں شاید ہی کسی دوسرے میں ہوں۔ میں تمہیں چھوڑنا نہیں چاہتی لیکن میرا تجربہ یہ کہتا ہے کہ مرجانہ بہت جلد تمہارا ذہنی توازن بگاڑ دے گی۔ بہتر یہی ہے کہ تم اسے لے کر لندن واپس چلے جاؤ۔ میں یہاں تمہاری جگہ مارٹن کو یا سرفراز کو آزماؤں گی۔"

"ابھی نہیں ممی! پہلے میں کچھ روز مرجانہ کو آزماؤں گا۔ اگر یہ ثابت ہو گیا کہ وہ ہمارے دشمنوں کی سازشوں میں شریک نہیں ہے' تو میں اس سے شادی کروں گا اور یہ جگہ چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ میں فیصلہ کر چکا ہوں ممی! کہ مجھے ایک بیوی کی اور اپنی دولت کے وارثوں کی ضرورت ہے۔ مرجانہ میری بیوی بنے گی اور میرے بچے پیدا کرے گی۔"

مس روزی میز پر پڑے ہوئے سگریٹ کے پیکٹ سے ایک سگریٹ نکال کر سلگانے لگی۔ شہریار نے کہا۔

"ہیلی کاپٹر پندرہ تاریخ کی رات یہاں پہنچے گا۔ یہاں ہماری جتنی کرنسی ہے وہ پونڈ اور ڈالر میں اور کچھ سونے میں تبدیل ہو گئی ہے۔ یہ مال یہاں سے نکل جائے گا۔ اگر اس وقت تک مرجانہ فراڈ ثابت ہو گئی تو میں بھی اُسی رات اُسے یہاں سے لے کر چلا جاؤں گا۔ اس کے بعد میری جگہ مارٹن سے کام لو۔ وہ میرا دستِ راست ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہیں کبھی نقصان نہیں پہنچائے گا۔"

اس کی باتیں ختم ہوتے ہی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ شہریار نے ریسیور اٹھا کر کہا۔

"ہیلو' کیا بات ہے؟"

دوسری طرف سے ملازم کی آواز آئی۔

"جناب! آپ سے مرجانہ یاسمین ملاقات کرنا چاہتی ہیں۔"

مرجانہ کا نام سنتے ہی دل کی دھڑکنیں پاگل ہو گئیں۔ اس نے جذبات سے لرزتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "آنے دو۔" پھر ریسیور رکھ دیا اور مس روزی سے کہا۔ "مرجانہ آ رہی ہے۔"

مس روزی جلدی سے اٹھ کر میز کے دوسری طرف چلی آئی اور شہریار باس کی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ مس روزی نے اپنی ریسٹ واچ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ لڑکی بارہ بجے رات کو ملنے آئی ہے' ٹھیک شیطانی وقت ہے۔"

اسی وقت دروازے پر دستک سنائی دی۔ مس روزی نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول

دیا۔ مرجانہ چند لمحوں تک دروازے پر کھڑی شہریار کو غصے سے دیکھتی رہی' پھر اندر آ گئی۔ مس روزی باہر چلی گئی۔ شہریار نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"خیریت تو ہے۔ تم اس طرح مجھے گھور گھور کر کیوں دیکھ رہی ہو؟"

"میں دیکھ رہی ہوں کہ مرد کتنے مکار ہوتے ہیں۔ میں نے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ تمہیں دھوکا نہیں دیا۔ مگر تم نے مجھے دھوکا دیا۔ ایک غلط نمبر بتا کر ساری رات میری عزت سے کھیلتے رہے۔ کیا یہی تمہاری مردانگی ہے؟"

شہریار نے قریب آ کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"تمہارا غصہ فضول ہے۔ میں نے تمہیں دھوکا نہیں دیا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ میں لکی ہوں۔ ایک بار کسی نمبر پر رقم لگائی تھی' خوش قسمتی سے جیت گیا۔ یہ سنتے ہی تم میرے سر ہو گئیں کہ میں تمہیں بھی کوئی نمبر بتاؤں۔ مرجانہ! میں کوئی عامل نہیں ہوں' جادوگر نہیں ہوں اور نہ ہی تمہارا دشمن ہوں کہ تمہیں کوئی غلط نمبر بتا کر تمہیں نقصان پہنچاتا۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ تمہارے بے لباس جلوے نے میرے ہوش اڑا دیئے تھے۔ میں اب تک ہوش میں نہیں ہوں مرجانہ! تم ایسا نشہ ہو جو اترتا نہیں' چڑھتا ہی جاتا ہے۔ تم اس وقت بضد تھیں کہ میں تمہیں کوئی نمبر بتاؤں اور میں تمہاری بے لباس مہربانی اور جلوؤں کی تابانی میں نہ جانے کون سا نمبر بول گیا۔ مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔ تم خود سوچو مرجانہ! میں سٹے بازی کا دھندا نہیں کرتا ہوں۔ میں پورے یقین سے کیسے کہہ سکتا تھا کہ کون سا نمبر آئے گا۔ ہاں' یہ میری خود غرضی ہے کہ تمہیں حاصل کرنے کے لئے زبان پر جو نمبر آیا' اسے اگل دیا۔ میں اپنی اس غلطی کی تلافی کروں گا۔ تم جتنی رقم ہار چکی ہو' وہ رقم ابھی اور اسی وقت مجھ سے لے سکتی ہو۔"

یہ کہہ کر اس نے مرجانہ کے دونوں بازوؤں کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ وہ خود کو چھڑاتی ہوئی بولی۔ "چھوڑ دو مجھے' تم میرا نقصان پورا نہیں کر سکو گے۔ میں بہت بڑی رقم ہار چکی ہوں۔"

شہریار نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تم نے اپنی حیثیت کے مطابق داؤ لگایا ہو گا۔ یا کسی سے قرض لے کر دو ہزار یا چار ہزار روپے لگائے ہوں گے۔"

وہ دوسری طرف منہ پھیر کر بولی۔ "میں نے اس سے بھی زیادہ لگائے ہیں۔ بہت زیادہ .... بہت زیادہ .... اب مجھے کہتے ہوئے ندامت ہو رہی ہے کہ میں نے کیوں اتنی بڑی حماقت کی اور وہ حماقت یہ ہے کہ میں نے اس نمبر پر تیس ہزار روپے

لگائے تھے۔"

"تیس ہزار روپے!" شہریار نے اسے تعجب سے دیکھا۔ ایک لڑکی جس کا باپ اندھا ہے اور جو چار پانچ سو روپے کی ملازمت تلاش کرتی رہتی ہے' وہ تیس ہزار روپے کہاں سے لے آئی۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ اس کی پشت پر دشمنوں کے لمبے ہاتھ ہیں۔ شہریار نے تیور بدل کر پوچھا۔

"اتنے روپے تمہارے پاس کہاں سے آ گئے تھے؟"

"میرے ڈیڈی جس فرم میں ملازمت کرتے تھے وہاں ان کا پراویڈنٹ فنڈ جمع ہوتا تھا۔ جب وہ اندھے ہو گئے تو انہیں ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا۔ ان کے حساب میں چالیس ہزار روپے جمع ہو گئے تھے۔ وہ روپے انہیں دے دیئے گئے۔ میں نے ان ہی میں سے تیس ہزار روپے اس نمبر پر لگا دیئے تھے۔"

"میں کیسے یقین کروں کہ تم سچ بول رہی ہو؟"

"میں تمہاری طرح جھوٹی اور دھوکے باز نہیں ہوں۔ میں سچ کہوں گی' تب بھی تم یقین نہیں کرو گے' کیونکہ تم میرے تیس ہزار لوٹا نہیں سکو گے۔"

"تم اپنی سچائی کا ثبوت دو' میں ابھی تیس ہزار تمہارے منہ پر پھینک دوں گا۔"

"مرجانہ نے اپنا وینٹی بیگ کھولا اور اس میں سے تہہ کئے ہوئے کاغذات نکال کر اس کی طرف بڑھا دیئے۔ "انہیں پڑھ کر دیکھ لو۔ یہ اُسی فرم کے کاغذات ہیں۔ جہاں ڈیڈی ملازم تھے۔ یہ کاغذات بتائیں گے کہ پچھلے ماہ ڈیڈی کو چالیس ہزار روپے ادا کئے گئے تھے۔"

شہریار انہیں پوری توجہ سے پڑھنے لگا۔ وہ کاغذات درست نظر آ رہے تھے۔ پھر بھی اس نے کہا۔ "کل صبح میرا آدمی ان کاغذات کی تصدیق کرے گا۔ اگر تمہاری سچائی ثابت ہو گئی تو میں تمہیں تیس ہزار کی بجائے چالیس ہزار دوں گا۔"

"یہ میرے ڈیڈی کے بہت ضروری کاغذات ہیں۔ میں انہیں تمہارے پاس چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔"

"کون کہتا ہے کہ چھوڑ کر جاؤ۔" اس نے مرجانہ کو بازوؤں کے حصار میں لے لیا۔

"تم یہاں رہ جاؤ' صبح چالیس ہزار لے کر چلی جانا۔"

"نہیں' تم پھر مجھے دھوکا دو گے۔ میں ایک بار دھوکا کھا چکی ہوں' اب کیسے یقین کروں۔"

"مرجانہ! میں تمہیں صرف ایک رات کے لئے نہیں' اپنی زندگی کی تمام راتوں کے لئے تمہارے جملہ حقوق اپنے نام کرنا چاہتا ہوں۔ تم یہ خیال دل سے نکال دو کہ میں تمہیں دھوکا دے رہا ہوں۔ صبح تمہیں یقین ہو جائے گا کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ چالیس ہزار کی رقم یوں اٹھا کر پھینک دیتا ہوں جیسے وہ چالیس پیسے ہوں۔"

"اچھی بات ہے۔ میں صبح تک تم پر بھروسہ کرتی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی مرمریں بانہوں کا ہار اسے پہنا دیا۔ شہریار! ایک دم پگھل گیا۔ دل کے قریب دل دھڑکنے لگا۔ سانسوں سے سانسیں ٹکرانے لگیں اور ان کے درمیان وقت ڈگمگاتے ہوئے گزرنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد وہ الگ ہو گئی اور ایک ادائے ناز سے چلتی ہوئی بیڈ کی طرف جانے لگی۔ شہریار نے دروازے کے پاس آ کر چٹخنی چڑھائی اور لائٹ آف کر دی۔ مرجانہ نے بیڈ لیمپ آن کر دیا۔ بیڈ لیمپ کی محدود روشنی میں آدھا بستر روشن تھا اور آدھا تاریک۔ شہریار کے ہاتھ میں ابھی تک وہ کاغذات تھے۔ ان کاغذات کو رکھنے کے لئے وہ میز کی طرف آیا تو اچانک ہی ذہن میں ایک سوال کلبلانے لگا کہ مرجانہ نے اتنی رقم داؤ پر لگانے کی جرأت کیسے کی؟ اس کے لئے تیس ہزار کی رقم بہت بڑی تھی۔ اس کی حیثیت سے بہت زیادہ تھی۔ جب تک کہ اسے جیتنے کا یقین نہ ہوتا وہ اپنے اندھے باپ کی کمائی کو یوں پانی کی طرح نہ بہاتی۔

یہ بات پہلے ہی شہریار کے ذہن میں آ جاتی۔ مگر مرجانہ کی قربت اسے سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہیں دیتی تھی۔ مس روزی نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ وہ لڑکی اس کی ذہانت کو زنگ لگا رہی ہے۔

شہریار شکست خوردہ انداز میں ریوالونگ چیئر پر بیٹھ گیا۔ پھر چیئر پر دوسری طرف گھوم گیا۔ بستر کی طرف سے اور مرجانہ کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ سختی سے بازپرس کرنے کے لئے چشم پوشی ضروری تھی۔ اسی طرح دل و دماغ قابو میں رہ سکتے تھے۔ پھر اس نے کہا۔

"مرجانہ! میرے ایک سوال کا جواب دو۔ تم دیکھنے سننے میں بہت ذہین ہو' تمہیں جب تک جیتنے کا یقین نہ ہوتا اس وقت تک تم اتنی بڑی رقم داؤ پر نہ لگاتیں۔ تمہیں کسی نے یقین دلایا ہو گا کہ جو نمبر میری زبان سے نکلے گا وہی لکی نمبر ہو گا۔ بتاؤ کس نے تمہیں یقین دلایا تھا؟"

"کسی نے نہیں۔ میں کہہ چکی ہوں کہ مجھ سے ایک بہت بڑی حماقت ہو گئی ہے۔"

"تم بکواس کرتی ہو۔ مجھے بیوقوف سمجھتی ہو۔ تمہاری جیسی لڑکیوں کے لئے تیس ہزار بہت بڑی رقم ہے' جو صرف خوابوں میں نظر آتی ہے۔ وہ تمہارے اندھے باپ کی ساری زندگی کی آخری پونجی تھی۔ تم نے پورے یقین سے اس پونجی کو داؤ پر لگایا تھا۔ بتاؤ کس نے تمہیں یقین دلایا تھا؟ اگر نہیں بتانا چاہتیں تو پھر ابھی اور اسی وقت یہاں سے چلی جاؤ۔ میں تمہاری صورت دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا۔"

مرجانہ کی مختصر سی ہنسی سنائی دی۔

"تم تو جواب سننے سے پہلے ہی میری صورت دیکھنے سے پرہیز کر رہے ہو' میری طرف دیکھو۔"

"نہیں' میں نہیں دیکھوں گا۔ تمہاری آواز میرے کانوں تک پہنچ رہی ہے۔ تم اپنی سچائی کا ثبوت دو' میں سن رہا ہوں۔"

مرجانہ کی ایک گنگناتی ہوئی "ہائے" سنائی دی۔ پھر اس نے کہا۔

"تم خواہ مخواہ مجھ پر شبہ کرتے ہو۔ ایک بار میں نے وہ کاغذات دے کر اپنی سچائی ثابت کی ہے۔ دوسری بار اپنی سچائی کا یہ ثبوت پیش کر رہی ہوں' یہ لو اسے دیکھو۔"

وہ ثبوت دیکھنے کے لئے ریوالونگ چیئر پر گھوم گیا۔ گھومتے ہی مرجانہ کا پاجامہ بیڈ کی فضا سے لہراتا ہوا آیا اور ریوالونگ چیئر کے ہتھے پر سے ہوتا ہوا فرش پر گر گیا۔ شہریار کی آنکھیں پھیل گئیں۔ نگاہیں جہاں پہنچیں وہیں ٹھہر گئیں۔ بیڈ لیمپ کی محدود روشنی میں آدھا بستر روشن تھا اور آدھے لباس میں آدھی مرجانہ روشن تھی۔ شباب کے سٹے میں بدن کا آدھا نمبر بول رہی تھی۔ باقی آدھے نمبر کو سسپنس میں رکھ چھوڑا تھا۔

یہ ایک اہم نفسیاتی حربہ ہے کہ کسی سے اپنی بات منوانے سے پہلے اس کی توجہ اور اس کی نگاہوں کو ایک نقطے پر مرکوز کر دو۔ بچے کے دھیان کو کھلونے کی طرف لے جاؤ' بوڑھے کی سوچ کو عاقبت کی طرف پرواز کرنے دو اور جوان مرد کی نگاہوں کو نظارے کی چکناہٹ پر پھسلنے دو اور اسے سنبھلنے کا موقع نہ دو۔

جب شہریار کی نگاہیں اس نظارے کے جال میں جکڑ گئیں تو مرجانہ نے اپنی بات منوانے کے لئے کہا۔

"میں کہہ چکی ہوں کہ مجھ سے ایک حماقت ہو گئی ہے۔ کتنے ہی لوگ ایسی حماقتیں کرتے ہیں۔ سر پھرے' ملنگ اور فقیروں سے نمبر پوچھتے ہیں۔ جذب و جنون کی حالت میں

ان کی زبان سے جو عدد نکلتا ہے' اس عدد پر ہزاروں روپے لگا دیتے ہیں۔ یہ محض اعتماد کی بات ہے۔ وہی اعتماد میں نے تم پر کیا تھا۔ اگر تم اسے میری حماقت نہیں کہو گے تو تمہیں پتہ چلے گا کہ میں تم پر کس طرح اندھا اعتماد کرتی ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے ایک ہاتھ بڑھایا اور بیڈ لیمپ کا سوئچ آف کر دیا۔ اندھیرے میں ایک تجسّس پیدا کرنے کے لئے چند ساعتوں کے لئے گم ہو گئی۔ پھر اس نے سوئچ آن کیا۔ وہ اپنے دوسرے ہاتھ سے شرٹ کا اوپری بٹن کھول رہی تھی۔ بٹن کھل گیا اور سوئچ آف ہو گیا۔

شہریار کو اس اندھیرے میں زلزلے کے سے جھٹکے لگے۔ سوئچ آن ہو گیا۔ دوسرا بٹن کھل چکا تھا۔ سوئچ آف ہو گیا۔ نظارہ ڈوب رہا تھا۔ وہ ریوالونگ چیئر سے یوں اٹھا جیسے آندھی کی زد میں حقیر تنکا اپنی جائے پناہ سے اٹھتا ہے۔

ایک لمحہ روشنی کا۔ "ہاں کتنے ہی لوگ ایسی حماقت کرتے ہیں۔ اس بیچاری سے بھی ایک حماقت ہو گئی۔"

دوسرا لمحہ اندھیرے کا۔ اندھی خواہشات کے آگے عورت کی ہر بات جیسے آسمان سے اترتی ہے۔ وہ ٹھٹک گیا۔ ذرا سنبھل گیا۔ اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اچھا ہے کہ وہ قیامت نظر نہ آئے۔ یہ کمبخت آنکھیں بہکاتی ہیں۔ یہ آنکھ دیکھنے سے انکار کر دے تو کوئی نظارہ دل میں نہ اترے۔ اے میری آنکھ! میری پیدائش سے میرے وجود کے ساتھ رہنے سہنے والی آنکھ! انکار کر دے۔ اس نظارے کو جھٹلا دے..........

پھر سوئچ آن ہوا روشنی ہوئی۔ شرٹ اس کے قدموں میں آ کر گرا اور اس کے قدم لڑکھڑا گئے۔ آنکھ دیکھنے کے لئے ہوتی ہے۔ آنکھ دیکھ رہی تھی۔ محو حیرت تھی کہ جذبے کیا سے کیا ہو جائیں گے۔ کبھی سوئچ آن ہو رہا تھا' کبھی آف ہو رہا تھا کبھی وہ روشنی کی سیپ سے دمکتے ہوئے موتی کی طرح اُبھرتی تھی' کبھی تاریکی میں رازہائے "ہائے" کی طرح گم ہو جاتی تھی۔ وہ اندھیرے اُجالے کی دھوپ چھاؤں میں بھٹکتا ہوا بستر کے ساحل تک پہنچ گیا۔ پھر بستر کے بحرِ عمیق سے ایک لہر نے کروٹ بدلی اور اسے اپنے ساتھ بہا کر لے گئی۔

رات چپکے چپکے گزرنے لگی۔ وقت کی سوئی آہستہ آہستہ سرکنے لگی۔ کمرے میں بیڈ لیمپ کی محدود روشنی اونگھ رہی تھی۔ سیج کے سفر سے تھکے ہوئے مسافر خاموش پڑے ہوئے تھے۔ دونوں جاگ رہے تھے اور دونوں اپنی اپنی سوچ کی دنیا میں ایک دوسرے سے

دور بھٹک رہے تھے۔

مرجانہ سوچ رہی تھی۔ "میں نے کیا کھویا اور کیا پایا؟ اگر کل صبح شہریار سے چالیس ہزار روپے مل جائیں تو میری جیت ہے۔ شہریار کے بتائے ہوئے نمبر پر جمشید نے چالیس ہزار روپے لگائے تھے۔ میں نے ایک پیسہ بھی داؤ پر نہیں لگایا تھا۔ میرے ڈیڈی کی فرم سے ملنے والی پے آرڈر کی سلپ کام آ گئی۔ میں شہریار کو احمق بنا کر چالیس ہزار وصول کر رہی ہوں۔ جمشید وغیرہ کو اس رقم کی ہوا بھی نہیں لگے گی۔ میں یہ رقم اپنی چھوٹی بہن کے اکاؤنٹ میں جمع کر دوں گی۔ ان مردوں کو اسی طرح بیوقوف بنانا چاہئے۔ جو عورت دوہری چالیں نہیں چلتی اور کسی ایک مرد کے عشق میں گرفتار ہو جاتی ہے' وہ دو کوڑی کی بھی نہیں رہتی' اپنی ساری جوانی بچے پیدا کرنے میں گزار دیتی ہے۔"

شہریار سوچ رہا تھا۔ "یہ حسن' یہ قیامت' جو میرے بستر پر دراز ہے۔ میں اسے دیکھ کر سنبھل نہیں سکتا۔ بے لباس ہوتے ہی اس کا بدن کوہ ندا کی طرح پکارتا ہے۔ ہم آئے دن دنیا جہان کی عورتوں کو دیکھتے ہیں۔ ان میں کچھ ایسی ہوتی ہیں جن سے وقتی طور پر کھیل کر آگے بڑھ جاتے ہیں لیکن زندگی میں کبھی نہ کبھی ایک خاص عورت ٹکراتی ہے جو اپنے اندر ایک خاص کشش رکھتی ہے۔ مرجانہ کی ساری کشش اس کے بے لباس ہونے میں ہے۔ اگر میں نے اسے ہمیشہ کے لئے نہیں اپنایا تو یہ مجھے ہمیشہ اپنے پیچھے بھاگتے رہنے پر مجبور کرے گی لیکن اسے اپنانے سے پہلے اس کا اصلی روپ دیکھنا ضروری ہے۔ یہ درست ہے کہ لوگ پاگل فقیروں کے بتائے ہوئے نمبروں پر رقم لگاتے ہیں لیکن اپنی حیثیت کے مطابق رقم لگاتے ہیں۔ مرجانہ کی طرح تیس ہزار روپے لگانے کی حماقتیں نہیں کرتے۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے حماقت کی ہو' مگر یہ مشکوک ہے۔ اب میرا نشہ اتر چکا ہے۔ مجھے خاص طور سے اسے آزمانا چاہئے.........."

یہ سوچ کر وہ کروٹ بدلتے ہوئے مرجانہ کے قریب آ گیا۔ اسی وقت مرجانہ نے بھی کروٹ لی اور اس سے ٹکرا گئی۔ شہریار نے اسے اپنے ایک بازو کی قید میں لے کر پوچھا۔

"کیا سوچ رہی تھیں؟"

"تمہارے بارے میں سوچ رہی تھی۔ تم نے مجھ پر جادو کر دیا ہے۔ اب تمہاری آغوش سے باہر نکلنے کو جی نہیں چاہتا۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ تم ہمیشہ میرے سینے سے لگی رہو۔ کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟"

"شادی؟" وہ ذرا گڑبڑا گئی۔ اس نے شادی جیسے فضول موضوع پر کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

"تم خاموش کیوں ہو گئیں؟ شاید تم یہ سوچ رہی ہو گی کہ میں ایک معمولی بزنس مین ہوں۔ نہیں مرجانہ! میں تمہاری سوچ سے بھی زیادہ دولت مند ہوں۔ اتنا دولت مند کہ ہر ماہ لاکھوں روپے ملک سے باہر بھیجتا ہوں۔ مختلف ممالک کے بینکوں میں میرے لاکھوں روپے محفوظ ہیں۔ میں تمہیں یہاں سے لے جاؤں گا۔ ہم ملک ملک کی سیر کریں گے۔ کبھی پیرس میں' کبھی سوئٹزرلینڈ میں' کبھی روم میں اور کبھی لندن میں وقت گزاریں گے۔ ہر جگہ دولت ہمارے قدموں میں ہو گی اور ہم ایک دوسرے کی آغوش میں رہیں گے۔"

مرجانہ سن رہی تھی اور دل ہی دل میں کہہ رہی تھی۔ "ایسے خواب مجھے کتنے ہی عاشقوں نے دکھائے ہیں۔ پہلے میں نادان تھی۔ ایسے خوابوں کے بہلاوے میں آ کر میں نے اپنی کتنی ہی راتیں ضائع کر دیں۔ اب ایسی غلطی نہیں کروں گی.........." پھر اس نے شہریار سے کہا۔

"میں جو خواب دیکھتی تھی' تم اس سے بھی اونچے خواب دکھا رہے ہو۔ تم اتنے دولت مند کیسے بن گئے۔ اتنی دولت تو اسمگلنگ یا دوسرے ناجائز کاروبار سے حاصل ہوتی ہے۔"

"تم ہمیشہ کے لئے میری ہو جاؤ گی تو میں تمہیں بتاؤں گا کہ یہ دولت میرے پاس کہاں سے آتی ہے۔"

"پہلے میرے چالیس ہزار دے دو' پھر میں تمہاری ہو جاؤں گی۔"

"چالیس ہزار صبح تمہیں مل جائیں گے۔ اس کے بعد تم فیصلہ کرو۔ میں تمہیں اپنے ساتھ ملک سے باہر لے جاؤں گا۔"

"نہیں شہریار! میں اپنے اندھے باپ اور جوان بہن کو چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہوں؟"

"تم ان کی فکر نہ کرو۔ صبح چالیس ہزار لے جاؤ۔ پھر یہ ملک چھوڑنے سے ایک دن پہلے پچاس ہزار روپے اور اپنے ڈیڈی کو دے دینا۔ باہر جا کر بھی تم جب چاہو گی یہاں تمہارے ڈیڈی کو ہزاروں روپے مل جایا کریں گے۔"

وہ اس ملک سے باہر نہیں جانا چاہتی تھی لیکن جانے سے ایک دن پہلے مزید پچاس ہزار روپے ملنے کی توقع تھی۔ وہ ہاتھ آنے والی اتنی بڑی رقم کو چھوڑ نہیں سکتی تھی۔ اس

نے پوچھا۔ "ہم یہاں سے کب جائیں گے؟"

"یہی دو چار روز میں............"

"اتنی جلدی؟" اس نے تعجب سے کہا۔ "میرے پاس تو اپنا پاسپورٹ بھی نہیں ہے۔"

"پاسپورٹ کی ضرورت نہیں ہے۔ میرا ایک ذاتی ہیلی کاپٹر ہے۔ آج شام کو مجھے خبر ملے گی کہ وہ ہیلی کاپٹر کس دن یہاں پہنچ رہا ہے۔ ہم اسی میں بیٹھ کر جائیں گے۔ ہمارے ساتھ دو لاکھ ڈالر اور ایک لاکھ روپے کا سونا ہو گا۔"

"اتنی دولت؟" مرجانہ کی اوپر کی سانس اوپر ہی رہ گئی۔

"یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ باہر ملکوں میں جا کر جب عیش کرو گی تو پتہ چلے گا کہ میں کس طرح دونوں ہاتھوں سے دولت لٹاتا ہوں۔"

"پھر تو میں ضرور تمہارے ساتھ جاؤں گی۔" وہ اس کی گردن میں بانہیں ڈال کر لپٹ گئی۔

نہ شہریار کو اس ملک سے باہر جانا تھا۔ نہ وہ جانا چاہتی تھی۔ جس ہیلی کاپٹر میں واقعی یہاں کی کمائی ہوئی دولت جانے والی تھی' وہ پندرہ تاریخ کو آنے والا تھا لیکن شہریار کا خیالی ہیلی کاپٹر دو چار روز میں آ رہا تھا۔ مرجانہ سوچ رہی تھی کہ باہر جانے کے بعد نہ جانے کب شہریار کی نظر بدل جائے یا اس کے حسن و شباب سے اس کا دل بھر جائے اور وہ بغیر پاسپورٹ لے جا کر نہ جانے اسے کہاں پھینک آئے۔ دانشمندی یہی ہے کہ جانے سے پہلے پچاس ہزار وصول کئے جائیں اور جانے کے دن دو لاکھ ڈالر اور ایک لاکھ روپے کے سونے پر ہاتھ صاف کیا جائے۔ یہ کام کنور شمشاد اور جمشید کریں گے اور اسے مالِ غنیمت میں سے تگڑا حصہ ملے گا۔

وہ ایک دوسرے کو چومتے رہے اور ایک دوسرے کو دھوکا دیتے رہے۔ دوسری صبح چھ بجے مرجانہ سوتی رہی۔ شہریار نے اٹھ کر کپڑے پہنے اور وہاں سے نکل کر مس روزی کے کمرے میں چلا آیا۔ وہ اپنے کمرے میں ناشتہ کر رہی تھی۔ اس نے کہا۔

"ہیلو بوائے! ناشتہ کرو گے؟"

"نہیں' مرجانہ کے ساتھ کروں گا۔"

وہ فون کا ریسیور اٹھا کر کسی کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔ مس روزی نے پوچھا۔

"کسے فون کر رہے ہو؟"

"کیپٹن ارشد کو۔" پھر وہ فون کے دوسری طرف کسی سے کہنے لگا۔ "ہیلو کیپٹن صاحب ہیں۔ ان سے کہو شہریار کا فون ہے۔" اس نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر مس روزی سے کہا۔ "ہمارے جتنے ایجنٹ بلیک لسٹ میں ہیں ان کے نام بتاؤ؟"

"جمشید" وہ نام بتانے لگی۔ "ناصر' وہاب' رحمت خان اور دلدار خان........."

"ہوں۔" شہریار نے کہا۔ "ابھی دلدار خان کو فون کرو۔ اسے لالچ دو کہ اگر ابھی وہ چالیس ہزار کی پگڑی دے گا تو جمشید کا علاقہ اسے دے دیا جائے گا۔"

"اور جمشید؟" مس روزی نے پوچھا۔

"دو چار روز میں جمشید قبرستان کے علاقہ میں چلا جائے گا۔"

"اوہ۔" وہ پریشان ہو کر بولی۔ "تم پھر ایک بار خونیں ڈرامہ کھیلنا چاہتے ہو۔ مائی گاڈ! میں ایسٹ بورن کی وہ رات نہیں بھولتی جب تم نے دشمنوں کو کتوں کی موت مارا تھا۔ کیا یہ سب اس لڑکی مرجانہ کے لئے ہے؟"

"ہاں۔ اگر وہ فراڈ ثابت ہوئی تو ان کے ساتھ ختم کر دی جائے گی۔ کام کی بات کرو ممی! ابھی دلدار راضی ہو جائے تو اس سے کہو کہ مرجانہ یاسمین کے نام چالیس ہزار کا چیک لکھے۔ مرجانہ نو اور دس بجے کے درمیان چیک لینے آئے گی۔ وہ چیک فوراً کیش ہو جانا چاہئے اور دلدار کا کوئی آدمی مرجانہ کا پیچھا نہ کرے ورنہ وہ زندہ واپس نہیں جائے گا۔"

"دلدار بھی ایک بار تمہیں بے نقاب کرنے کی کوشش کر چکا ہے۔ تم اسے دو علاقے کیوں دے رہے ہو؟"

"وہ بھی مرجانہ یاسمین کے نام چیک لکھ کر پھنسے گا۔ کس طرح پھنسے گا؟ یہ میں بعد میں بتاؤں گا۔"

اسی وقت فون پر کیپٹن ارشد کی آواز سنائی دی۔ شہریار نے کہا۔

"ہیلو ارشد! کیا ہو رہا ہے؟ ہاں .... اچھا .... بھئی میں تو آئے دن کی مصروفیات سے تنگ آ گیا ہوں۔ کہیں تفریح کا پروگرام بناؤ۔ ہاں .... ہاں .... نہیں .... اس شہر سے کہیں دور جائیں گے۔ یار اصل بات یہ ہے کہ میری ایک گرل فرینڈ کو ہیلی کاپٹر میں بیٹھنے کا شوق ہے۔ میں نے تمہارے بھروسے پر اس سے وعدہ کر لیا ہے۔ ہاں' کون؟ میری گرل فرینڈ؟ یار مت پوچھو۔ اتنی حسین ہے کہ دیکھو گے تو مر جاؤ گے۔ اس کا نام بھی مرجانہ ہے۔ ہاں' لڑکی کی بات آئی ہے ناں .... اب تو تمہارے فرشتے بھی ہیلی کاپٹر لائیں گے۔ یار تمہارے تو عیش ہیں۔ دفتر کے روزنامچہ میں سرکاری پرواز

لکھتے ہو اور چھوکریوں کو آسمان کی سیر کراتے ہو۔ اچھا بتاؤ .... کب انتظام کر رہے ہو .... ہاں .... اچھا .... او کے پرسوں شام کو پانچ بجے .... اسی جگہ جہاں ہم ملتے رہے ہیں .... اچھا خدا حافظ...........''

اس نے ریسیور رکھ کر اطمینان کی سانس لی۔ پھر مس روزی سے کہنے لگا۔

''ممی! پرسوں شام پانچ بجے کناٹ کے جنگل میں جو وسیع میدان ہے' وہاں ہیلی کاپٹر میری اور مرجانہ کی تفریحی پرواز کے لئے لینڈ کرے گا لیکن مرجانہ کو میں نے یہ بتایا ہے کہ میں اسے ملک سے باہر لے جا رہا ہوں۔ اس ہیلی کاپٹر میں دو لاکھ ڈالر اور ایک لاکھ روپے کا سونا ہو گا۔ اگر مرجانہ فراڈ ہے تو وہ جمشید وغیرہ کو اس کی اطلاع دے گی۔ میرے دشمن غیر ملک کی کرنسی کے ساتھ مجھے پکڑنے آئیں گے تاکہ وہ مجھے بے نقاب کرنے کی دھمکیاں دے کر ہمارے اس کاروبار میں برابر کے حصہ دار بن سکیں۔ لہٰذا وہاں میری حفاظت کا اور ان کے خاتمے کا مکمل انتظام ہونا چاہئے۔ میں وہاں جن دشمنوں کی توقع کرتا ہوں' وہ جمشید' ناصر اور کنور شمشاد ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی میرے مقابل نہ آئے تو مائیکل پرسوں رات جمشید کے گھر جائے گا۔ وہ اپنی عادت کے مطابق اس وقت نشے میں دھت ہو گا۔ مائیکل اسے اِن سینٹی کا انجکشن لگائے گا تاکہ وہ ہمیشہ کے لئے پاگل ہو جائے اور اپنے علاقے کو کنٹرول کرنے کے قابل نہ رہے۔ اسی رات ناصر کو بھی گھیرا جائے گا۔ اگر ناصر اور جمشید ایک جگہ پیتے ہوئے پائے گئے تو ایک کو انجکشن لگایا جائے اور دوسرے کی شراب میں زہر ملایا جائے۔ رہ گیا کنور شمشاد' اس سے میں نمٹ لوں گا۔''

یہ کہہ کر اس نے مس روزی کے سگریٹوں کا پیکٹ اٹھایا اور ایک سگریٹ نکال کر سلگانے لگا۔ مس روزی ریسیور اٹھا کر سرفراز کے نمبر ڈائل کرنے لگی۔ پھر اس سے رابطہ قائم ہوتے ہی اسے سمجھانے لگی کہ کس طرح دلدار خان سے جمشید کے علاقے کا سودا کرنا چاہئے اور آدھے گھنٹے کے اندر سودے کی رپورٹ یہاں پہنچائی جائے۔ تمام باتیں سمجھا کر اس نے ریسیور رکھ دیا۔ شہریار نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

''ممی! بلیک لسٹ میں اور کون رہ گیا ہے؟''

''وہاب اور رحمت خان۔''

''اچھا' رحمت خان کو ابھی ڈھیل دو۔ وہاب سے ناصر کے علاقے کا سودا کرو' پچاس ہزار کی پگڑی ہو گی اور یہ پچاس ہزار کا چیک بھی مرجانہ یاسمین کے نام لکھا جائے گا۔''

یہ کہہ کر وہ اپنی مرجانہ کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے لئے دوسرے کمرے

میں چلا گیا۔

☆======☆======☆

مرجانہ کا خیال تھا کہ دلدار خان کا دیا ہوا چیک کیش نہیں ہو گا اور شہریار اسے نقد چالیس ہزار کے بجائے ایک کاغذ کا ٹکڑا دے کر ٹرخا رہا ہے۔ پہلی بار غلط نمبر دیا تھا۔ دوسری بار چیک دے کر بہلا رہا ہے لیکن مرجانہ کا خیال غلط نکلا۔ بینک سے اسے چالیس ہزار روپے مل گئے۔ اتنی بڑی رقم لیدر بیگ میں رکھتے ہوئے وہ اپنی ذہانت پر فخر کرنے لگی۔ یہ ذہانت ہی تھی کہ چالیس ہزار جمشید کے ڈوبے تھے اور اس نے ایک پیسہ بھی داؤ پر لگائے بغیر وہ ڈوبی ہوئی رقم اپنے نام کر لی تھی۔ دیکھا جائے تو شہریار کا بتایا ہوا سات نمبر غلط نہیں تھا۔ اس کے لئے لکی ثابت ہوا تھا۔

مرجانہ وہ روپے اپنی بہن کے اکاؤنٹ میں جمع کرنے کے بعد ایک دکان میں آئی۔ وہاں سے اس نے جمشید کے فون پر کنور شمشاد کو کال کیا۔ پروگرام کے مطابق جمشید' ناصر اور کنور شمشاد اس کے فون کا انتظار کر رہے تھے لیکن مرجانہ نے کنور شمشاد سے کہا کہ پہلے وہ دونوں تنہائی میں ضروری باتیں کریں گے۔ اس کے بعد جمشید اور ناصر کو اس گفتگو میں شریک کیا جائے گا۔ مرجانہ کی اس شرط نے تینوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ ضرور کوئی خاص بات ہے اور مرجانہ جیسی عورت ایک معقول رقم لئے بغیر وہ خاص بات نہیں بتائے گی۔

بہرحال ایک گھنٹے بعد کنور شمشاد لارڈز ریسٹورنٹ کے ایک کیبن میں تنہا آیا۔ مرجانہ وہاں اس کا انتظار کر رہی تھی۔ چائے اور ہلکے ناشتے کا آرڈر دینے کے بعد کنور شمشاد نے کہا۔

''جمشید اور ناصر تم سے ملنے کے لئے بہت بے چین ہیں۔ وہ ہماری اس ملاقات کا مطلب سمجھ گئے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ تم شہریار کے متعلق اہم معلومات حاصل کر چکی ہو۔''

''ان کا خیال درست ہے لیکن جو معلومات میں نے حاصل کی ہیں' ان سے جمشید اور ناصر کا تعلق نہیں ہے کیونکہ میں اب تک یہ یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ شہریار سٹے باز ہے اور جمشید اور ناصر وغیرہ کا باس ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ اس سے بھی اونچا دھندا کرتا ہے۔ وہ ہر ماہ لاکھوں روپے ڈالروں میں تبدیل کرتا ہے اور انہیں ملک سے باہر بھیجتا ہے۔''

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"میں تمہیں پہلے بھی بتا چکی ہوں کہ وہ میرے سامنے کس طرح گھٹنے ٹیک دیتا ہے۔ وہ جنسی مریض ہے۔ انتہائی غصے کی حالت میں بھی مجھے بے لباس دیکھ کر اپنے غصے کو‘ اپنی ذہانت کو‘ اپنے کاروبار کو حتیٰ کہ خود کو فراموش کر دیتا ہے اور پسینہ پسینہ ہو کر میری آغوش میں آ گرتا ہے۔ اب اس کی دیوانگی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ وہ مجھے ہمیشہ کے لئے اپنا لینا چاہتا ہے۔ تمہارے لئے نئی اطلاع یہ ہے کہ وہ مجھے اس ملک سے باہر لے جا رہا ہے۔"

کنور شمشاد کے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ سامنے بیٹھی ہوئی سونے کی چڑیا اڑنے والی تھی۔ اس نے ناراضگی سے کہا۔

"شہریار نہیں‘ اس کی دولت تمہیں یہاں سے لے جا رہی ہے۔"

وہ ہنسنے لگی۔ "بس جل گئے؟ اتنا تو سوچو کہ تمہیں چھوڑ کر جانا ہوتا تو کسی دن چپ چاپ اس کے ساتھ چلی جاتی۔ تمہیں یہ باتیں بتانے کے لئے یہاں نہ آتی۔ دیکھو شمشاد! نہ میں تمہاری لیلیٰ ہوں‘ نہ تم میرے مجنوں۔ تم میری ضرورت ہو۔ جب تک تم میرے ساتھ ہو‘ اس شہر کا کوئی بدمعاش مجھے ٹیڑھی نظر سے نہیں دیکھ سکتا۔ پولیس والے مجھے پریشان کرتے ہیں تو تم کچھ کھلا پلا کر معاملہ رفع دفع کر دیتے ہو۔ اسی طرح میں تمہاری ضرورت ہوں۔ میں تمہیں مہنگی شراب پلاتی ہوں‘ بہترین لباس پہناتی ہوں‘ تمہاری کوٹھی کا کرایہ ادا کرتی ہوں۔ ہر ماہ تم پر ہزاروں روپے خرچ کرتی ہوں۔ مرد اور عورت کو اسی طرح باہمی سمجھوتے سے ایک دوسرے کی ضرورت بن کر رہنا چاہئے۔ یہ شادی کرنا اور بچے پیدا کرنا بیوقوفوں کا کام ہے اور وہ بیوقوف دیوانہ شہریار مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے لیکن میں جب تک جوان ہوں‘ ایسی حماقت نہیں کروں گی۔"

کنور شمشاد نے مسکرا کر اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ "ویری گڈ‘ تم بہت سمجھدار ہو۔"

"شہریار سے میری دلچسپی صرف دو چار دنوں تک رہے گی۔ آج شام کو وہ بتائے گا کہ اس کا ہیلی کاپٹر کس دن یہاں آئے گا۔ اسی دن وہ مجھے یہاں سے لے جانا چاہے گا۔ میں اس کے ساتھ ہیلی کاپٹر تک جاؤں گی کیونکہ وہ اپنے ساتھ دو لاکھ ڈالر اور ایک لاکھ روپے کا سونا لے جا رہا ہے۔"

"کیا واقعی" کنور شمشاد نے حیرانی سے پوچھا۔ "کہیں وہ تمہیں دھوکا تو نہیں دے رہا

ہے؟ ایسے راز کی باتیں وہ تم سے کیسے کہہ سکتا ہے۔ مرجانہ! وہ تم سے جھوٹ کہہ رہا ہے۔"

"شمشاد! میری بانہوں میں قید ہو کر آج تک کوئی مرد جھوٹ نہیں بول سکا اور شہریار ایسا مرد ناداں ہے جس کی نادانی اور دیوانگی کو مجھ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا۔"

"ٹھیک ہے کہ تم جانتی ہو مگر بھول رہی ہو کہ ایک بار اس نے دیوانگی کے عالم میں تم سے جھوٹ کہا تھا۔ تمہیں ایک غلط نمبر بتایا تھا۔"

"غلط نمبر۔" وہ ہنسنے لگی۔ "وہ نمبر جمشید کے لئے غلط تھا۔ میرے لئے صحیح تھا۔ اس لکی سیون سے میں نے اتنی بڑی رقم جیتی ہے کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ اب یہ نہ پوچھنا کہ میں نے کس طرح ایک بڑی رقم جیت لی ہے۔ یہ میرا اپنا گیم ہے۔ میں ابھی جو کچھ کہہ رہی ہوں اس پر غور کرو۔ دیکھو شمشاد! شہریار چالاک ضرور ہے مگر جسمانی اعتبار سے تم سے ٹکرائے گا تو بے موت مرے گا۔ کیا تم وہ دو لاکھ ڈالر اور ایک لاکھ روپے کا سونا حاصل نہیں کرو گے؟"

"کیوں نہیں‘ تم جہاں کہو گی میں اس پر دھاوا بول دوں گا۔"

اتنے میں ناشتے کی پلیٹیں اور چائے آ گئی۔ جب بیرا تمام چیزیں رکھ کر چلا گیا تو مرجانہ نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ شہریار وہ ڈالر اور سونا ساتھ لے کر ہیلی کاپٹر تک نہیں جائے گا۔ تم اسے راستے میں کہیں روکو گے تو یہ حماقت ہو گی۔ وہ تمام مال اس کے ساتھی ہیلی کاپٹر تک پہنچائیں گے۔ جس وقت بھی مجھے اس جگہ کا علم ہو گا۔ میں تمہیں فون پر بتا دوں گی۔ اتنا یاد رکھنا کہ شہریار تنہا نہیں ہو گا۔ جو شخص اتنی دولت ساتھ لے کر چلتا ہے‘ اس کی حفاظت کے لئے دو چار یا دس محافظ ضرور آس پاس رہتے ہوں گے۔"

"تم ان کی پرواہ نہ کرو۔ میرے پاس بھی جان لڑا دینے والے آدمی ہیں۔ وہ دن شہریار کا آخری دن ہو گا۔"

"ہاں‘ اسی عزم کے ساتھ ٹھوس پلاننگ کرنا۔ اگر تم ناکام ہو گئے تو وہ دولت بھی ہاتھ سے جائے گی اور مجھے بھی مجبوراً اس کے ساتھ جانا پڑے گا۔ خیر میں تو نقصان میں نہیں رہوں گی۔ ملک سے باہر جا کر بھی اسی طرح شہریار کو اپنا دیوانہ بنا کر رکھوں گی کہ وہ میرے اشاروں پر ناچے گا۔ میرے لباس کے ایک ایک بٹن میں اس کی دیوانگی کا راز چھپا ہوا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ دو پیالیوں میں چائے بنانے لگی۔

شام کو پروگرام کے مطابق وہ پھر شہریار کی تنہائی دور کرنے گئی۔ شہریار نے اسے بتایا کہ پرسوں شام کے پانچ بجے وہ اس ملک کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دیں گے۔ مرجانہ اس فکر میں تھی کہ اس جگہ کا علم ہو جائے' جہاں ہیلی کاپٹر پہنچنے والا ہے لیکن وہ ہربات کہہ رہا تھا مگر اس جگہ کا نام اس کی زبان سے نہیں نکل رہا تھا۔ آخر اس نے مجبور ہو کر پوچھا۔

"ہیلی کاپٹر یہاں کس جگہ لینڈ کرے گا؟ ہمیں کتنی دور جانا ہو گا؟"

"اس شہر سے پچاس میل دور جائیں گے۔ تم فکر نہ کرو' ہم اپنی ائرکنڈیشنڈ کار میں بیٹھ کر جائیں گے۔"

اتنا کہہ کر وہ دوسری باتیں کرنے لگا۔ وہ بات ادھوری ہی رہ گئی۔ صرف اتنا معلوم ہوا کہ شہر سے پچاس میل دور جانا ہے۔ وہ الجھنے لگی' سوچنے لگی کہ پچاس میل دور کوئی ایسا خفیہ اڈا ہو گا.......... یا ایسا جنگل ہو گا جہاں غیر قانونی طور سے آنے والا ہیلی کاپٹر لینڈ کر سکتا ہے اور وہاں سے پرواز کر سکتا ہے۔

وہ شہریار کے بازوؤں میں کھیلتی رہی اور سوچتی رہی۔ وہ بار بار اپنے مطلب کا ایک ہی سوال کر کے اسے کسی خطرے کا احساس نہیں دلانا چاہتی تھی۔ رات کے تین بجے وہ سو گیا۔ مگر یہ جاگتی رہی اور فیصلہ کرتی رہی کہ اگر اس جگہ کا علم نہ ہوا تو وہ شہریار کے ساتھ جانے سے انکار کر دے گی۔

صبح ہونے لگی تو اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ فکر اور پریشانی کے باعث اب بھی اسے نیند نہیں آ رہی تھی مگر شہریار کے جاگنے کا وقت ہو چکا تھا اور مرجانہ آنکھیں موند کر یہ ظاہر کرنا چاہتی تھی کہ وہ پریشان نہیں ہے بلکہ سکون سے گہری نیند سو رہی ہے۔

تھوڑی دیر بعد شہریار کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور مرجانہ کو بڑی محبت سے دیکھنے لگا۔ اس کے جی میں آیا کہ اس پر جھک کر اس کے رس بھرے ہونٹوں کو چوم لے۔ مگر اسی وقت مرجانہ کی بند آنکھیں کچھ کہہ گئیں۔ اس کی پلکوں میں ہلکی سی لرزش پیدا ہو گئی تھی۔ اگر وہ اسے چومنے کے لئے نہ جھکتا تو اس لرزش کو نہ دیکھ پاتا۔ وہ مسکرانے لگا۔ اتنا تو سمجھ ہی گیا تھا کہ نیند کا بہانہ ہے۔ مگر وہ جاگ رہی ہے۔ کچھ دیر تک وہ اسے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا۔ پھر بستر سے اتر کر اس نے کپڑے پہنے اور فون کے پاس جا کر ریسیور اٹھا لیا۔ مرجانہ کے کانوں تک ڈائل گھومنے کی آواز آ رہی تھی۔ پھر شہریار کی دھیمی دھیمی

سی آواز آنے لگی۔ وہ رازدارانہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"ہیلو' میں شہریار بول رہا ہوں۔ تمام انتظامات مکمل ہیں؟ ویری گڈ' میں کل شام کو چار بجے یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔ میرے ساتھ مرجانہ ہو گی۔ ہاں' ہوں' نہیں نہیں' مرجانہ پر مجھے پورا بھروسہ ہے۔ وہ مجھے دل و جان سے چاہتی ہے۔ اس کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ تم وہ تمام مال لے کر ٹھیک ساڑھے چار بجے کناٹ کے جنگل میں پہنچ جانا۔ اونچے اور گھنے درختوں کے درمیان جو کھلی جگہ ہے ہیلی کاپٹر وہیں لینڈ کرے گا اور کچھ پوچھنا ہے؟ اچھا' ٹھیک ہے دوپہر کو فون کرنا۔"

ریسیور رکھنے کی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی مرجانہ کے دل و دماغ سے ساری پریشانیاں ڈھل گئیں۔ اب اسے نیند آ رہی تھی۔ مگر ابھی سونا مناسب نہیں تھا۔ ابھی شہریار سے مزید پچاس ہزار کا چیک لینا تھا۔ اسے کیش کرانے کے بعد کنور شمشاد کو کناٹ فورسٹ کا پتہ بتانا تھا۔ اس کے بعد ہی وہ سکون سے سو سکتی تھی۔

شہریار نے پلنگ کے قریب آ کر ذرا جھک کر اس سونے اور جاگنے والی کو دیکھا اس کے تغافل عارفانہ پر مسکرایا۔ پھر باتھ روم کی طرف چلا گیا۔

☆======☆======☆

شہریار ڈرائیور کر رہا تھا۔ مرجانہ اس کے پاس بیٹھی ہوئی ونڈ اسکرین کے پار دیکھ رہی تھی۔ کار پچاس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بھاگی جا رہی تھی۔ جب وہ شہر سے دور نکل آئے تو شہریار نے کہا۔

"تم خاموش کیوں ہو؟ کیا گھر والے یاد آ رہے ہیں؟"

"ہاں' سوچتی ہوں کہ نہ جانے پھران سے کب ملاقات ہو گی۔"

"دو چار گھنٹے کے بعد ہو جائے گی۔ تم بہت اداس ہو' اس لئے میں تمہیں ملک سے باہر نہیں لے جاؤں گا۔ ہم ہیلی کاپٹر میں بیٹھ کر ذرا کھلے آسمان کی سیر کریں گے پھر نیچے اتر آئیں گے۔"

"کیوں مذاق کرتے ہو۔" وہ مسکرانے لگی۔

"میں ایسے ہی مذاق کا عادی ہوں۔ اس طرح دشمن کھل کر سامنے آ جاتے ہیں۔"

مرجانہ کو خطرے کا احساس ہوا۔ وہ سیٹ پر پہلو بدلتی ہوئی بولی۔

"تم کیا کہہ رہے ہو؟ میرے ساتھ مذاق کر رہے ہو اور دشمنوں کی بات کہہ رہے ہو' کیا میں تمہیں دشمن نظر آتی ہوں؟"

"نہیں، مگر یہ بتاؤ کہ اگر کنات کے جنگل میں جمشید اور کنور شمشاد سے ملاقات ہو گئی تو میں تمہیں کیا سمجھوں گا۔ دوست یا دشمن؟"

"دوست، میں دشمن نہیں ہوں۔ اگر دشمن ہوتی، تب بھی میں تمہارے دشمنوں کو یہ کیسے بتا سکتی تھی کہ تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟"

"کیا صبح تم نے فون پر ہونے والی گفتگو نہیں سنی تھی؟"

"نہیں، مجھے کیا معلوم کہ تم کب فون پر کسی سے باتیں کر رہے تھے۔ میں تو سو رہی تھی۔"

"تم جاگ رہی تھیں۔"

"یہ جھوٹ ہے۔ تم شکی مزاج کے آدمی ہو۔ مجھ پر کئی بار شبہ کر چکے ہو۔ کئی بار میں نے ثابت کیا ہے کہ میں تمہاری دوست ہوں، دشمن نہیں ہوں۔" اب تم ایک نیا الزام لگا رہے ہو کہ میں نے تمہاری فون کال سنی ہے۔"

"یہ تو ابھی منزل پر پہنچ کر معلوم ہو جائے گا۔ اگر وہاں کسی دشمن سے سامنا نہ ہوا تو پھر میں تم پر کبھی شبہ نہیں کروں گا۔ تمام عمر تمہاری عزت کروں گا۔ تمہارا آنے والا کل اتنا شاندار ہو گا کہ تمہاری شان و شوکت اور شاہانہ زندگی کو دیکھ کر لوگ یہ بھول جائیں گے کہ تم کبھی ایک معمولی کال گرل تھیں اور آنے والا کل تمہارے لئے اتنی تباہیاں بھی لا سکتا ہے کہ تم پیسے پیسے کی بھی محتاج بن سکتی ہو۔ پتہ نہیں آج کے بعد تم سے ملاقات ہو یا نہ ہو۔ اس لئے میری باتوں کو غور سے سنو۔ میں نے ایک سچے عاشق کی حیثیت سے اب تک تمہیں نوے ہزار روپے دیئے ہیں۔ جب تم دشمن بن کر سامنے آؤ گی تو وہ روپے تمہارے گلے کا پھندا بن جائیں گے۔ پولیس انکوائری ہو گی کہ ایک دن چالیس ہزار اور دوسرے دن پچاس ہزار تمہارے یا تمہاری بہن کے یا تمہارے باپ کے اکاؤنٹ میں کہاں سے آئے۔ پولیس کو خفیہ طور سے اطلاع ملے گی کہ وہ دونوں چیک تم نے کہاں سے وصول کئے ہیں؟ وہ دونوں چیک جاری کرنے والے وہاب اور دلدار خان پولیس کی بلیک لسٹ میں ہیں۔ تم زیادہ سے زیادہ یہی کہو گی کہ میں نے تمہیں ان کے پاس بھیجا تھا لیکن میرا کچھ نہیں بگڑے گا۔ پولیس والوں نے بارہا میرے لئے جال بچھائے ہیں لیکن ہر بار مایوس ہو کر انہیں یہی رپورٹ لکھنی پڑی کہ میں ایک سیدھا سادہ سا ماڈلنگ اور پبلسٹی کا کام کرتا ہوں، باقاعدہ انکم ٹیکس ادا کرتا ہوں۔ میں جن بڑی بڑی کمپنیوں کے کام کرتا ہوں وہ سب میرے اعلیٰ کردار کی ضمانت دیتے ہیں۔ بہرحال تم اپنے طور پر پھر ایک بار کوشش

کر لینا مجھے کچھ نقصان پہنچ جائے۔"

مرجانہ نے دونوں ہاتھوں سے اس کے بازو کو تھام کر کہا۔ "شہریار تم کیوں دشمن کی طرح باتیں کر رہے ہو؟ میں ایسی کون سی قسم کھاؤں کہ تمہیں میری دوستی کا یقین آ جائے۔"

"تم اب تک قسمیں کھا کر نہیں، لباس اتار کر یقین دلاتی رہی ہو لیکن یہاں اس کا موقعہ نہیں ہے اور وقت بھی نہیں ہے۔ ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے ہیں۔"

اس نے کار کی رفتار سست کر دی، راستے کے دونوں طرف گھنے جنگلات تھے اس نے کار کو دائیں جانب موڑ لیا۔ سڑک چھوڑ کر درختوں کے درمیان اونچے نیچے راستوں میں کار ڈرائیو کرتا رہا۔ گاڑی اِدھر سے اُدھر ڈگمگا رہی تھی۔ مرجانہ بھی اِدھر سے اُدھر لڑھکتی اور سنبھلتی جا رہی تھی۔ بہت دور جا کر اس نے گاڑی روک دی، پھر جیب سے ریوالور نکال کر بولا۔

"منہ سے ایک آواز نہ نکالنا۔ میرے دشمنوں کو کسی طرح کا سگنل نہ دینا۔ ہم یہاں سے ہیلی کاپٹر تک جائیں گے۔ اگر کوئی ہنگامہ نہ ہوا تو یہ بڑی اچھی بات ہو گی۔ تمہاری تقدیر بدل جائے گی، چلو اترو۔"

وہ دونوں کار سے باہر آ گئے۔ شہریار نے ریوالور والا ہاتھ جیب میں ڈال لیا پھر وہ دونوں آگے بڑھنے لگے۔ اسی وقت ہیلی کاپٹر کی آواز سنائی دی۔ شاید وہ نیچے اتر رہا تھا۔ کیونکہ درختوں کی پتیاں اور شاخیں زور زور سے ہل رہی تھیں۔ شہریار مرجانہ کا ہاتھ پکڑ کر دوڑنے لگا۔ ہیلی کاپٹر کی آواز قدم قدم پر قریب آ رہی تھی۔ درخت شاخیں، پتیاں، گھاس اور جھاڑیاں سب کی سب جیسے طوفانی ہوا کی زد میں آ کر لرز رہی تھیں۔ وہ دونوں دوڑتے دوڑتے کھلے میدان کے سامنے آ گئے۔ اسی وقت ہیلی کاپٹر زمین پر آ کر ٹھہر گیا تھا۔ شہریار نے آس پاس دیکھا اور مرجانہ سے کہا۔

"چلو، پہلے تم چل کر بیٹھو۔"

وہ تیزی سے قدم بڑھاتی ہوئی ہیلی کاپٹر کے قریب گئی۔ کیپٹن ارشد نے دروازہ کھولتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"ہیلو بے بی! شہریار نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اتنی حسین ہو کہ تمہیں دیکھتے ہی میں مر جاؤں گا۔ آؤ، بیٹھو، میں مرنے کا پروگرام بناتا ہوں۔"

وہ جھجکتی ہوئی بو بیٹھنے لگی۔ اسی وقت دور کہیں سے کنور شمشاد کی آواز سنائی دی۔

"شہریار! دونوں ہاتھ اوپر اٹھالو' تم ریوالور کی زد میں ہو۔"

کنور شمشاد کی آواز سنتے ہی مرجانہ نے ہیلی کاپٹر سے ایک پاؤں باہر نکالا۔ مقصد یہی تھا کہ وہاں سے نکل بھاگے۔ اچانک ہی شہریار نے جیب سے ہاتھ نکالا اور پھرتی سے پلٹ کر فائر کر دیا۔ گولی سنسناتی ہوئی کنور شمشاد کے قریب سے گزر گئی۔ وہ اُچھل کر ایک درخت کے پیچھے چلا گیا۔ شہریار دوڑتا ہوا دوسرے درخت کی آڑ میں چلا آیا۔ ایک گولی اسی درخت کے تنے میں آ کر پیوست ہو گئی۔ پھر تو کئی جگہ سے فائرنگ ہونے لگی۔ کنور شمشاد کے آدمی فائر کر رہے تھے اور شہریار کے ساتھی گولیوں کا جواب گولیوں سے دے رہے تھے۔ کنور شمشاد نے ایک فائر کرتے ہوئے کہا۔

"شہریار! مفت میں مارے جاؤ گے۔ اپنی زندگی عزیز ہے تو تمام مال میرے حوالے کر دو۔ میں مرجانہ کو لے کر یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

شہریار نے اس کی بات کا جواب ریوالور کی ایک گولی سے دیا۔ اتنی دیر میں مرجانہ میدان کے دوسری طرف بھاگتی چلی گئی تھی۔ اتنی دیر میں ہیلی کاپٹر کا انجن اسٹارٹ ہو گیا تھا۔ شاید کیپٹن ارشد کی سمجھ میں یہ بات آ گئی تھی کہ اس کی ملازمت خطرے میں ہے اور اسے فوراً ہی وہاں سے نکل جانا چاہئے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہیلی کاپٹر فضا میں بلند ہو گیا۔ کنور شمشاد کے ایک آدمی نے ہیلی کاپٹر کا نشانہ لیا لیکن اس سے پہلے ہی کسی دوسری گولی کا نشانہ بن گیا۔ شہریار متواتر فائر کرتے ہوئے اور دوڑتے ہوئے دوسرے درخت کے پیچھے چلا گیا۔ کنور شمشاد نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا۔ متواتر فائر کرتا ہوا دوسرے درخت کے پیچھے آ گیا۔ وہاں سے اس نے دو فائر کئے۔ پھر زمین پر بیٹھ گیا۔ دور تک گھنی جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ جھاڑیوں کے پیچھے پیچھے رینگتے رینگتے راستہ بدلنے لگا۔ ایک لمبا چکر کاٹ کر شہریار کے پیچھے جانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک ایسے درخت کے پیچھے پہنچ گیا جہاں سے شہریار صاف اور سیدھے نشانے پر آ گیا تھا۔ وہ اپنے دشمن سے بے خبر تھا۔ اس نے شہریار کا نشانہ لیا۔ ٹریگر دبایا لیکن ریوالور کا چیمبر خالی ہو گیا تھا۔ فائرنگ کے دوران اسے یاد ہی نہیں رہا کہ کتنی گولیاں ضائع ہو چکی ہیں۔ اس نے شہریار کی جانب دیکھا۔ وہ دوسرے درخت کی طرف فائر کرتا ہوا اسی درخت کی جانب چلا آ رہا تھا۔ جہاں کنور شمشاد چھپا ہوا تھا۔ کنور شمشاد کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ دوبارہ ریوالور لوڈ کرتا۔ اس نے ریوالور کو نال کی طرف سے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ شہریار تیزی سے بھاگتا ہوا آ رہا تھا۔ جیسے ہی وہ درخت کے قریب آیا کنور شمشاد نے پوری قوت سے ریوالور کا دستہ اس کی پیشانی پر مار

دیا۔ شہریار اچانک حملے سے گڑبڑا گیا۔ آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔ پھر دوسرا حملہ بھی ناقابلِ برداشت تھا۔ سر پر ہتھوڑے جیسی چوٹ لگی' آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام کر گھاس پر گر پڑا۔ کنور شمشاد نے اس کا ریوالور اٹھایا۔ فوراً ہی اس کے چیمبر کو دیکھا۔ اس میں ایک گولی رہ گئی تھی لیکن وہ گولی شہریار کے سینے میں اتارنے کی حسرت ہی رہ گئی۔ پیچھے سے کسی نے فائر کیا تھا۔ ایک گولی کنور شمشاد کی پشت میں سوراخ کرتی ہوئی سینے سے نکل گئی۔ دوسری گولی اس کی کھوپڑی میں پیوست ہو گئی اور وہ شہریار کے قریب ہی گر کر ٹھنڈا ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد جنگل میں خاموشی چھا گئی۔ ہار جیت کا فیصلہ ہو گیا۔ شہریار سمیت دو آدمی زخمی ہوئے تھے اور ایک مارا گیا تھا۔ کنور شمشاد اور اس کے تمام ساتھی ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئے تھے۔ مارٹن اور سرفراز اپنے ساتھیوں کے ساتھ دوڑتے ہوئے شہریار کے قریب آئے۔ وہ بیہوش ہو چکا تھا۔ مارٹن نے سرفراز سے کہا۔ "تم دو آدمیوں کے ساتھ باس کو کسی قریبی ہسپتال میں پہنچاؤ۔ میں ماتھر کو کسی دوسرے ہسپتال میں لے جاؤں گا۔ تین آدمی کنور شمشاد کی لاش کو اٹھا کر لے جائیں گے اور اسے ایسی جگہ دفن کریں کہ پولیس تو کیا چیل کوے بھی وہاں تک نہ پہنچ سکیں۔ ورنہ پولیس والے اس کی لاش دیکھ کر مرجانہ تک پہنچیں گے۔ پھر مرجانہ کے ذریعے باس تک پہنچ جائیں گے۔"

مارٹن کے ساتھی اس کے حکم کی تعمیل کرنے لگے۔

ان سے دور بہت دور مرجانہ بدحواسی میں بھاگتی جا رہی تھی۔ کبھی جنگل کے نشیب و فراز میں ٹھوکریں کھا رہی تھی۔ کبھی جھاڑیوں کے درمیان الجھتی جا رہی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ کون جیتا ہے اور کون ہار گیا ہے۔ بس اتنا سمجھ میں آ گیا تھا کہ وہ ہار گئی ہے۔ شہریار کے ساتھ دو لاکھ ڈالر اور ایک لاکھ کا سونا نہیں تھا۔ کنور شمشاد اگر وہاں سے بچ کر نکل گیا۔ تب بھی خالی ہاتھ آئے گا۔ دولت بھی نہ ملی اور شہریار جیسا فراخدل گاہک بھی ہاتھ سے نکل گیا۔

وہ دوڑتی رہی اور سوچتی رہی اور اپنی ناکامی پر کڑھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھی آ گئے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب وہ کہاں جائے گی' کب تک اس جنگل میں بھٹکتی رہے گی۔ شہر وہاں سے پچاس میل دور تھا اور رات کی سیاہی پھیلتی جا رہی تھی۔ وہ پریشان ہو کر چیخنے لگی۔ کسی کو مدد کے لئے پکارنے لگی۔

"کوئی ہے .... کوئی ہے .... مجھے بچاؤ .... مجھے یہاں سے نکالو۔ کوئی

ہے۔"

جواب میں گیدڑوں کی آوازیں سنائی دیں۔ پھر دور کہیں ایسی آواز آئی جیسے موٹر کار گزر رہی ہو۔ وہ آواز کی سمت تیزی سے بھاگنے لگی۔ "رک جاؤ۔ مجھے بچاؤ۔ پلیز رک جاؤ۔" وہ گرتی پڑتی بھاگتی رہی۔ آخر اس پختہ سڑک تک آ گئی جہاں سے وہ شہریار کے ساتھ ائرکنڈیشنڈ کار میں بیٹھ کر گزری تھی۔ مگر اب وہ راستہ دور دور تک سنسان نظر آ رہا تھا۔ شاید کچھ دیر پہلے وہاں سے کوئی گاڑی گزر گئی تھی جس کی آواز دور جنگل تک اسے سنائی دی تھی۔

وہ تھکے ہوئے انداز میں ڈگمگاتی ہوئی سڑک کے کنارے کنارے چلنے لگی۔ تھوڑی تھوڑی دیر میں وہ پیچھے پلٹ کر دیکھتی تھی کہ شاید اُدھر سے کوئی گاڑی آتی ہو۔ مگر گاڑی نظر نہیں آ رہی تھی کبھی دور سے اور کبھی قریب سے گیدڑوں کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ مارے دہشت کے اس کی جان نکلی جا رہی تھی۔ ناکامی' پریشانی' دشمنی کا خوف اور دوست کی جدائی نے اسے بالکل توڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ چلتے چلتے لڑکھڑا کر گر پڑی۔ ایسی گری کہ دوبارہ اٹھنے کی سکت نہ رہی۔

پھر وہ رونے لگی۔ گیدڑ اسے چیرنے پھاڑنے آتے ہیں تو آئیں۔ اب تو وہ ایک قدم بھی نہیں چل سکتی تھی۔ نہ بھاگنے کا راستہ تھا۔ نہ پناہ کی کوئی جگہ تھی اس کا شاہکار بدن جسے اس کے چاہنے والے پھول کی طرح ہاتھوں میں لیتے تھے اور ریشم کی سیج پر سلاتے تھے وہ پتھر کے بے حس راستے پر پڑا تھا۔ یہی سوچ کر اسے رونا آ رہا تھا کہ وہ بڑی بے قدری سے اپنی زندگی کے اختتام تک پہنچ رہی ہے۔

مگر ابھی اس کے دن پورے نہیں ہوئے تھے۔ دور سے ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس نظر آنے لگیں۔ ایک سہارا پاتے ہی اس کے جسم میں ایک نئی زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ ہانپتی کانپتی اُٹھی اور دونوں ہاتھ اٹھا کر بیچ سڑک پر دوڑتی ہوئی گاڑی کی طرف جانے لگی۔

گاڑی اس کے قریب آ کر رک گئی' ایک ادھیڑ عمر کے آدمی نے کار کی کھڑکی سے سر نکال کر پوچھا۔ "کون ہو تم؟"

"مجھے بچاؤ۔ مجھ پر رحم کرو۔ مجھے یہاں سے لے چلو۔" وہ دوڑتی ہوئی آئی اور اس کا جواب سنے بغیر اگلی سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔ کار ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔

"کون ہو تم؟ اس جنگل میں کیسے آئیں؟"

مرجانہ سانسیں درست کرنے کے بہانے ذرا دیر خاموش رہی اور سوچتی رہی کہ شہریار اور کنور شمشاد کے ٹکراؤ کا ذکر کرنا حماقت ہوگی۔ وہاں نہ جانے کتنی لاشیں گر چکی ہوں گی وہ خواہ مخواہ مرڈر کیس میں پھنس جائے گی۔ اس نے سوچ سمجھ کر جواب دیا۔

"میں ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی۔ وہ مجھے یہاں لایا تھا۔ اس نے میری عزت لوٹ لی' میرے زیورات اتار لئے۔ پھر وہ مجھے مار ڈالنا چاہتا تھا' میں اپنی جان بچا کر بھاگنے لگی۔ وہ میرا پیچھا کر رہا تھا۔ آپ کی گاڑی کو دیکھتے ہی وہ واپس جنگل کی طرف بھاگ گیا۔"

"تم کہاں رہتی ہو؟"

"لڑکیوں کے ایک ہوسٹل میں۔ اس نوجوان نے کہا تھا کہ ایک فورسٹ آفیسر سے اس کی دوستی ہے۔ ہم وہاں جا کر ایک ہفتہ گزاریں گے۔ میں ہوسٹل سے ایک ہفتہ کی چھٹی لے کر آئی تھی۔ میرے زیورات' سوٹ کیس اور تمام کپڑے وہیں رہ گئے۔ اب میں کس منہ سے ہوسٹل جاؤں گی۔"

کار ڈرائیو کرنے والے مہربان نے کہا۔ "فکر نہ کرو۔ ہوسٹل جانے کے لئے ابھی ایک ہفتہ کا وقت ہے۔ اس ایک ہفتہ میں' میں تمہارے زیورات بنوا دوں گا۔ تمہارے لئے درجنوں سوٹ تیار ہو جائیں گے۔ شرط یہ ہے کہ یہ ایک ہفتہ تم میرے ساتھ گزارو گی۔"

ہاں .... یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ انسان ایک ہاتھ سے دیتا ہے اور دوسرے ہاتھ سے لیتا ہے۔ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کھیلنے والی مرجانہ اس حقیقت کو خوب سمجھتی تھی۔ اسی لئے اس نے اپنی دکھ بھری کہانی میں زیورات اور کپڑوں کا اضافہ کر دیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اپنے اس مہربان کو ایک ہفتہ کے اندر پانچ دس ہزار روپے کا دھکا لگا جائے گی۔

یوں بھی وہ کچھ دنوں تک اپنے گھر سے دور کہیں ایسی جگہ رہنا چاہتی تھی جہاں شہریار یا اس کے آدمی نہ پہنچ سکیں۔ تقدیر نے ساتھ دیا اور وہ اپنے مہربان کی کوٹھی میں قید ہو کر دن گزارنے لگی۔ اس نے دوسرے دن کا اخبار دیکھا۔ کوئی اس کے مطلب کی خبر نہیں تھی۔ تیسرے دن کے اخبار میں جمشید اور ناصر کے متعلق مختصر سی خبر شائع ہوئی تھی۔ خبر یہ تھی کہ جمشید کے ڈرائنگ روم میں ناصر کو زہریلی شراب پلائی گئی تھی۔ زہر دینے والا جمشید تھا۔ وہ سزا سے بچنے کے لئے پاگل بن گیا تھا۔ اسے پولیس کی نگرانی میں طبی معائنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ یہ خبر پڑھنے کے بعد مرجانہ کے دل میں شہریار کی دہشت

بیٹھ گئی۔ وہ سمجھ گئی کہ اس نے جمشید اور ناصر سے انتقام لیا ہے۔ اس کے دشمنوں کی فہرست میں کنور شمشاد اور مرجانہ کا نام بھی ہو گا۔

وہ ٹیلیفون کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور ریسیور اٹھا کر ان تمام نمبروں پر باری باری رنگ کرنے لگی جہاں کنور شمشاد سے ملنے کی توقع ہو سکتی تھی مگر ہر جگہ سے یہی جواب ملا کہ وہ پچھلے دو دن سے نظر نہیں آیا ہے۔ مرجانہ کا کلیجہ کانپنے لگا۔ اسے کہیں تو ملنا چاہئے تھا۔ کہیں نہ ہونے کا مطلب یہی تھا کہ اب وہ اس زمین پر نہیں ہے۔ شہریار نے اسے بھی ختم کر دیا ہے۔

اس نے دوسرے تیسرے دن بھی ٹیلیفون پر اسے تلاش کیا لیکن اس کا چہیتا کنور شمشاد نہیں ملا اور یہ یقین پختہ ہو گیا کہ اس کا محافظ مارا گیا ہے اور اب وہ تنہا رہ گئی ہے۔ اس پناہ گاہ سے نکلتے ہی شہریار یا اس کے آدمیوں کی نظروں میں آتے ہی ختم کر دی جائے گی۔

ایک بار جی میں آیا کہ اپنی جان بچانے کے لئے پولیس سٹیشن پہنچ جائے لیکن اس کے پاس اس بات کا کوئی ثبوت نہیں تھا کہ شہریار نے جمشید کو پاگل بنایا ہے اور ناصر اور کنور شمشاد کو موت کی نیند سلا دیا ہے اور اب اس کی جان لینا چاہتا ہے بلکہ اس کے خلاف یہ ثبوت موجود تھا کہ اس نے چالیس ہزار اور پچاس ہزار کے چیک ایسے لوگوں سے لئے ہیں جو پولیس کی بلیک لسٹ میں ہیں۔ پھر یہ خوف بھی دل میں سمایا ہوا تھا کہ جو شخص بڑے بڑے مکار دشمنوں کو کچل سکتا ہے وہ اسے تھانے تک پہنچنے سے پہلے ہی چیونٹی کی طرح مسل کر رکھ دے گا۔

وہ تھانے تک نہیں جا سکتی تھی۔ آزادی سے باہر نہیں نکل سکتی تھی۔ جہاں اس نے پناہ لی تھی وہاں اس مہربان شخص کی محتاج رہ کر ساری زندگی نہیں گزار سکتی تھی۔ آخر اس نے سوچا کہ توبہ کرنے سے خدا بھی معاف کر دیتا ہے۔ پھر کیا معافی مانگنے سے شہریار معاف نہیں کرے گا؟ ضرور معاف کرے گا۔ اگر ایک بار اس سے تنہائی میں ملاقات کا موقعہ مل جائے تو وہ اس دیوانے کو پھر اپنا دیوانہ بنا لے گی۔ وہ عام حالات میں ذہین بھی ہے اور خطرناک بھی، لیکن خاص حالات میں ایک مریض ہے جس کا علاج صرف وہی کر سکتی ہے۔

وہ ذہنی پریشانیوں میں اپنی اس خوبی یا اس حربے کو بھول گئی تھی جس سے شہریار جیسا فولاد پگھل جاتا تھا۔ اس نے فوراً ہی فون کا ریسیور اٹھایا اور شہریار کے نمبر ڈائل کرنے

لگی۔

دوسری طرف سے مس روزی کی آواز سنائی دی۔ مرجانہ نے کہا۔

"میں مرجانہ ہوں۔ شہریار سے بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"شہریار نہیں ہے۔ وہ تم سے کبھی نہیں ملے گا۔"

"میں اس سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ کنور شمشاد کہاں ہے؟"

"وہ کسی کنور شمشاد کو نہ پہلے جانتا تھا' نہ اب جانتا ہے۔"

"کیا جمشید اور ناصر کو بھی نہیں جانتا؟"

"نہیں' یہ کون لوگ ہیں؟ تم ایسے لوگوں کے متعلق پوچھ رہی ہو۔ جن سے ہمارا دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ بہرحال تم شہریار کا حکم سن لو۔ اس نے کہا ہے کہ تم جلد سے جلد وہ نوے ہزار روپے واپس کر دو۔ اس کے بعد تمہیں آزادی سے گھومنے پھرنے کی اجازت دے دی جائے گی۔"

"تم بکواس مت کرو۔ شہریار ایسی باتیں نہیں کہہ سکتا۔ میں تمہاری قید میں نہیں ہوں کہ تم مجھے ایک آزاد زندگی کا لالچ دے رہی ہو۔ دیکھو مس بوڑھی مجھے شہریار سے ملا دو ورنہ تمہارے فرشتے بھی اس جگہ نہیں پہنچ سکیں گے جہاں میں نے پناہ لے رکھی ہے۔"

مس روزی کی غراہٹ سنائی دی۔

"بیوقوف لڑکی! کس ہوا میں اڑ رہی ہو۔ تم اس وقت ماڈل کالونی کی ستائیس نمبر کی کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہو اور فون نمبر دو آٹھ سات چھ صفر تین سے بکواس کر رہی ہو۔ جسے تم مس بوڑھی کہہ رہی ہو اس کا بوڑھا ہاتھ اس وقت بھی تمہاری شہ رگ کے قریب ہے .... نان سنس۔"

مارے حیرت کے مرجانہ کے ہاتھ سے ریسیور چھوٹ گیا۔ وہ دوڑتی ہوئی دوسرے کمرے میں گئی۔ وہاں وہ مہربان شخص ایک ٹائپ رائٹر کے سامنے بیٹھا ایک کاغذ پر کچھ ٹائپ کر رہا تھا۔ مرجانہ نے اس کے قریب جا کر پوچھا۔

"تم کون ہو؟"

"کیوں' کیا بات ہو گئی؟"

"میں پوچھتی ہوں' تم کون ہو؟ تم میرے لئے زیورات لے آئے۔ میری مرضی کے مطابق کپڑے سلوا دیئے لیکن مجھے کبھی ہاتھ تک نہیں لگایا۔ مجھ سے دور ہی دور رہتے

ہو .... کیوں؟"

اس شخص نے کرسی کا رخ بدل کر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

"جس دسترخوان پر ہمارا باس کھاتا ہے وہاں ہم ہاتھ باندھ کر کھڑے رہتے ہیں۔ ہماری مجال نہیں ہے کہ ہم اس کھانے کو ہاتھ بھی لگائیں۔"

"تمہارا باس کہاں ہے؟"

"تمہاری مہربانیوں کے باعث وہ ایک ہسپتال میں زیرِ علاج ہے۔"

"مجھے اس کے پاس لے چلو۔ میں اس سے معافی مانگوں گی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی سارا غصہ بھول جائے گا۔ مجھے سینے سے لگا لے گا۔"

"یہی ہم نہیں چاہتے کہ وہ تمہیں سینے سے لگائیں۔ ہم اس کا موقعہ ہی نہیں دیں گے کہ تم ان کے سامنے جاؤ۔ ہمارا بس چلے تو ہم تمہیں زندہ دفن کر دیں مگر باس کے حکم سے مجبور ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ کوئی تمہیں ہاتھ نہ لگائے۔ نوے ہزار وصول کر کے تمہاری تقدیر کے رحم و کرم پر تمہیں چھوڑ دیا جائے۔"

وہ غصے سے پاؤں پٹخ کر بولی۔ "میں نوے ہزار پر تھوکتی ہوں۔ میں کل ہی یہ روپے واپس کر دوں گی۔ مجھے ایک بار شہریار سے ملا دو۔ ایسے کتنے ہی نوے ہزار میرے قدموں میں آ جائیں گے۔ مگر تم سب ڈرتے ہو کہ وہ پھر دیوانگی میں کوئی نقصان اٹھا لے گا۔ میں قسم کھا کر کہتی ہوں' مجھے بہت بڑی سزا مل چکی ہے۔ میں نے اپنے دیوانے کی اہمیت کو پہچان لیا ہے۔ میں اسے کبھی نقصان نہیں پہنچاؤں گی۔ مجھے صرف ایک بار اس سے ملنے دو۔"

مگر اس سے ملنا آسان نہ تھا۔ اس پناہ دینے والے نے اس کی درخواست کو ٹھکرا دیا۔ مرجانہ نے دوسرے دن نوے ہزار لوٹا دیئے۔ مس روزی کے پاس جا کر التجائیں کرتی رہی کہ شہریار سے ایک بار ملا دو۔ مگر وہاں سے بھی مایوسی ہوئی۔ مس روزی نے خود اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ وہ دس بیس ہزار روپے لے کر شہریار کا پیچھا چھوڑ دے۔ یعنی وہ لوگ سودے بازی پر بھی آمادہ ہو گئے تھے کہ جس طرح ہو سکے شہریار کو اس ناگن سے دور رکھا جائے۔ وہ لوگ نہیں جانتے تھے کہ مرجانہ بند کمرے میں شہریار کے سامنے کون سا حربہ استعمال کرتی ہے وہ صرف اتنا ہی جانتے تھے کہ وہ جب بھی باس کی تنہائی میں جاتی ہے اسے پہلے سے زیادہ دیوانہ بنا کر چلی آتی ہے۔

مرجانہ کے راستے میں جتنی رکاوٹیں پیدا کی جا رہی تھیں اتنا ہی اسے اپنی اہمیت کا

یقین ہوتا جا رہا تھا۔ اب اس بات کا خوف نہیں تھا کہ کوئی اسے ہلاک کرے گا یا اسے ذہنی یا جسمانی اذیتیں پہنچائے گا۔ کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ شہریار کی مرضی کے خلاف کوئی اسے ہاتھ بھی لگا دیتا۔ اسی لئے مجبور ہو کر وہ سودے بازی کر رہے تھے۔ اسے بڑی سے بڑی رقم کا لالچ دے کر اپنے باس سے دور کر دینا چاہتے تھے اور ان کا باس شاید اس سودے بازی سے بے خبر تھا۔ کسی ہسپتال میں پڑا ہوا تھا۔

مرجانہ کا اب یہی کام رہ گیا تھا کہ وہ شہریار کو تلاش کرے۔ وہ صبح سے شام تک مختلف ہسپتالوں میں جاتی تھی۔ جنرل وارڈ اور اسپیشل وارڈ کے ہر مریض کو دیکھتی تھی مگر شہریار کا چہرہ نظر نہیں آتا تھا۔

ایک ماہ گزر گیا۔ اگلے ماہ کی چار تاریخ آ گئی۔ مرجانہ کو یقین ہو گیا کہ شہریار کسی ہسپتال میں نہیں۔ مس روزی اور اس کے ساتھی اسے دھوکہ دے رہے ہیں۔ شہریار اپنی کوٹھی میں ہی ہے اور وہیں اس سے ملاقات ہو سکتی ہے۔ یہ سوچ کر اس نے آخری فیصلہ کیا کہ خواہ کچھ ہو آج وہ شہریار کے کمرے میں ضرور جائے گی۔

جب وہ کوٹھی کے برآمدے میں پہنچی تو زور کی بارش ہو رہی تھی۔ شام کے پانچ بجے تھے مگر کالے کالے بادلوں نے اندھیرا پھیلا رکھا تھا۔ رہ رہ کر بجلیاں چمک رہی تھیں۔ مرجانہ کو دیکھتے ہی مس روزی پر بھی بجلی سی گری' اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"یہاں کیوں آئی ہو؟"

"میرے آنے کا مقصد تم جانتی ہو۔"

"میں کچھ نہیں جانتی' چلی جاؤ یہاں سے۔"

مرجانہ مسکراتی ہوئی سامنے کرسی پر بیٹھ گئی اور طنزیہ انداز میں بولی۔ "مس روزی تم اتنا گھبراتی کیوں ہو۔ اتنا سوچو کہ باہر بارش ہو رہی ہے۔ میں یہاں سے نہیں جا سکتی۔"

مس روزی غصے اور نفرت سے اُسے گھورنے لگی۔ مرجانہ نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر کہا۔ "تمہارا باس فولاد ہے اور فولاد ہمیشہ مقناطیس کی طرف کھنچ کر آتا ہے۔ تم کب تک ہمارے درمیان دیوار بنی رہو گی۔"

وہ جواب نہ دے سکی کیونکہ فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ اس نے ریسیور اٹھا کر کہا۔ "ہیلو' ہاں اس وقت سوا پانچ ہو چکے ہیں۔ صرف پینتالیس منٹ رہ گئے ہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ تم ابھی آؤٹ کر دو اور جا کر آرام کرو۔ تمہیں زیادہ سے زیادہ آرام کرنا چاہئے۔"

مرجانہ کے دماغ میں فوراً یہ بات آ گئی کہ کس بیمار کو آرام کرنے کا مشورہ دیا جا رہا

ہے۔ وہ یکبارگی اپنی جگہ سے اٹھی۔ سامنے میز پر جھکی۔ ریسیور کے قریب آئی اور چیخ کر کہنے لگی۔

"شہریار! میں مرجانہ ہوں' مجھے اپنے پاس.........."

مس روزی نے فوراً ہی ریسیور کے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ دیا اور جھلا کر بولی۔ "یو ڈرٹی گرل' بھاگ جاؤ یہاں سے۔" پھر وہ فون پر کہنے لگی۔ "ہاں' ہاں وہ یہاں ہے۔ مگر شہریار تم نے وعدہ کیا تھا کہ اسے کبھی قریب نہیں آنے دو گے۔ یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ اس کی آواز سنتے ہی تم پھر ایک نادان بچے کی طرح ضد کر رہے ہو۔"

مرجانہ فاتحانہ انداز میں مسکرا رہی تھی۔ مس روزی کی گفتگو سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ دیوانے کو عقل و شعور کی باتیں سمجھانے کی ناکام کوشش کر رہی ہے۔ آخر تھک ہار کر اس نے ریسیور کو رکھ دیا۔ چند لمحوں تک اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتی رہی۔ پھر دانت پیس کر بولی۔

"جاؤ.......... مر جاؤ.......... گڑ جاؤ.......... نکل جاؤ یہاں سے' وہ تمہیں بلا رہا ہے۔"

وہ ہنستی ہوئی اس کا شکریہ ادا کرتی ہوئی کمرے سے باہر آ گئی۔ باہر بادل گرج رہے تھے۔ بارش کی رم جھم اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں بدن میں انگڑائیاں جگا رہی تھیں۔ ان انگڑائیوں کو ابھی جاگنا تھا۔ شہریار کے کمرے میں قیامت بن کر ٹوٹنا تھا اور وہ کمرہ سامنے تھا۔

دروازے پر شہریار خان کی نیم پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ یہ وہ دروازہ تھا جہاں بڑے بڑے پولیس آفیسر آئے تھے اور شہریار کو قانون کے شکنجوں میں کسنے کی انتہائی کوششیں کی تھیں اور ناکام ہو کر چلے گئے تھے۔ یہ وہ دروازہ تھا جہاں تک پہنچنے کے لئے جمشید پاگل ہو گیا تھا۔ ناصر نے زہر کا پیالہ پیا تھا۔ کنور شمشاد کتے کی موت مارا گیا تھا۔ قانون کو مطمئن کر دیا گیا تھا۔ دشمنوں کو ختم کر دیا گیا تھا۔ اب کوئی نہیں تھا' کوئی نہیں تھا' صرف ایک دشمن رہ گئی تھی.......... مرجانہ۔

اب مرجانہ کے لئے بھی یہ آخری موقعہ تھا۔ اس فولادی انسان کو وہ جیت لیتی یا ہار کر ہمیشہ کے لئے اس دروازے سے نکل جاتی۔ مگر وہ جیتنے کا سلیقہ جانتی تھی۔ تاریخ گواہ ہے کہ ایک حسین عورت کے سامنے بادشاہ اپنا تخت اور سپاہی اپنی تلوار چھوڑ دیتا ہے۔

مرجانہ کا ہاتھ دروازے کے ہینڈل پر گیا۔ بجلی زور سے کوندی' تیزی سے لپکی اور

کسی کے دل پر' دماغ پر گرنے کے لئے دروازہ کھل گیا۔

کمرے کے اندر گہری تاریکی تھی۔ بادل گڑگڑا رہے تھے۔ اندھیرے میں یوں لگ رہا تھا جیسے دو پہاڑ آپس میں ٹکرا کر گڑگڑاہٹ کی دل ہلا دینے والی آواز پیدا کر رہے ہوں۔ اس نے دروازے کو اپنے پیچھے بند کرتے ہوئے اسے آواز دی۔

"شہریار! یہ اندھیرا کیوں ہے؟"

تاریکی میں گونجتی ہوئی آواز ابھری۔

"میرے لئے اندھیرا سازگار ہے۔ نہ میں تمہیں دیکھ سکتا ہوں۔ نہ تم مجھے دیکھو۔ جو کہنا ہے اندھیرے میں کہو اور واپس چلی جاؤ۔"

"شہریار! تم مجھ پر مرتے بھی ہو اور مجھ سے ڈرتے بھی ہو۔ میں تمہاری دشمن نہیں ہوں۔ پہلے بھی دوست تھی' اب بھی دوست بن کر آئی ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے دیوار کی جانب ہاتھ بڑھایا اور اندھیرے میں ٹٹول کر سوئچ آن کر دیا۔ کمرے میں روشنی پھیل گئی۔ وہ کمرے کے آخری سرے میں میز کے دوسری طرف ریوالونگ چیئر پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ پتھر کے مجسمے کی طرح ساکت تھا۔ اس کی پیشانی پر سوکھے ہوئے زخم کا نشان دور سے نظر آ رہا تھا۔ روشنی ہوتے ہی اس نے آنکھیں جھکا لی تھیں۔ اس کی جھکی ہوئی آنکھیں دیکھ کر مرجانہ بے اختیار مسکرانے لگی۔ وہ آگے بڑھتی ہوئی بولی۔

"میں اپنی غلطیوں کی معافی مانگنے آئی ہوں۔ کیا تم اپنی مرجانہ کو معاف نہیں کرو گے؟"

اس نے منہ پھیر کر ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"جہاں ہو' وہیں رک جاؤ۔ میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ مجھ سے دشمنی کرو گی تو تباہ ہو جاؤ گی۔ کوئی تمہارا پرسانِ حال نہ ہو گا۔"

وہ کمرے کے وسط میں ٹھہر گئی اور اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر عاجزی سے کہنے لگی۔

"میں سچ مچ تباہ ہو گئی ہوں۔ کوئی مجھے رات بھر کے لئے کال کرتا ہے تو میں وہاں جانے سے ڈرتی ہوں۔ کیونکہ میری حفاظت کرنے والا کنور شمشاد ایک ماہ سے لاپتہ ہے۔ کوئی عورت کسی بدمعاش یا باڈی گارڈ یا دلال کے بغیر اپنا دھندا نہیں کر سکتی۔ میرے سب سہارے چھن گئے ہیں۔ مجھ پر ترس کھاؤ شہریار.......... ایک بار مجھے معاف کر دو۔ میں سچے دل سے تمہاری وفادار بن کر رہنے کے لئے یہاں آئی ہوں۔ مجھے اپنے سینے سے لگا

لو۔ صرف ایک بار اور مجھ پر بھروسہ کر لو۔"

وہ ریوالونگ چیئر پر گھومتے ہوئے بولا۔ "شاید میں تم پر بھروسہ کر لیتا مگر تم نے مجھے اتنا زبردست نقصان پہنچایا ہے کہ جس کی تلافی ناممکن ہے۔ تمہاری جگہ کوئی مرد ہوتا تو میرے آدمی اس کی بوٹی بوٹی کاٹ کر چیل کوؤں کو کھلا دیتے۔ مگر میں نے تمہاری جان بخش دی۔ صرف اس لئے کہ اس نقصان کے بعد اب میں کبھی تمہارے فریب میں نہیں آؤں گا۔"

"میں تمہیں فریب دینے نہیں آئی ہوں۔"

"بکواس مت کرو۔" وہ گرجنے لگا۔ "نکل جاؤ یہاں سے .... چلی جاؤ .... تمہارا کوئی جادو مجھ پر نہیں چلے گا۔"

"جادو پھر جادو ہے۔" اس کا ہاتھ اپنے شرٹ کی زپ پر گیا۔ "اس جادو کا اثر تم جانتے ہو۔ کئی بار روٹھتے ہو' کئی بار من جاتے ہو۔ میری طرف دیکھو۔"

وہ آواز کی سمت گھوم گیا۔ زپ کھل گئی۔ سینہ روشن ہو گیا۔ مرجانہ کی آواز تھرائی۔

"تم اِدھر دیکھ رہے ہو مگر اِدھر نہیں دیکھ رہے ہو۔ اپنا رخ ذرا اِدھر کرو۔" اس نے ہدایت کے مطابق اپنا رخ اُدھر کیا۔ بجلیاں کوندنے لگیں۔ بادل گرجنے لگے۔ باہر تیز ہواؤں کی زد پر پتے اڑ رہے تھے۔ اندر لباس اڑ رہا تھا۔ اپنی جگہ چھوڑ رہا تھا۔ آبشار کی طرح اوپر سے نیچے آ رہا تھا۔ سو کینڈل پاور کی روشنی میں سر سے پاؤں تک بدن کا آبگینہ جگمگا رہا تھا۔

شہریار اپنی کرسی پر جما رہا۔ وہ بدن شراب سے بھری ہوئی بوتل تھا جس پر سے لباس کا کاگ اڑ گیا تھا۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔

اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ شباب کی رعنائیوں میں اور حُسن کی جلوہ سامانیوں میں کوئی کمی واقع ہو گئی تھی۔ نہیں' اس کا نشہ پہلے سے زیادہ تیز تھا' توبہ شکن تھا' وہ ایک بجلی تھی۔ سیدھی آسمان سے اتر کر کمرے کے وسط میں آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

اے زاہد خشک! توبہ توڑ دے۔ میدانِ محبت کا سپاہی ہے تو تلوار توڑ دے۔ شہنشاہ عشق ہے تو ریوالونگ چیئر چھوڑ دے۔ ارے یہ وہ نظارہ ہے کہ دماغ کا کوہ طور جل کر رہ جاتا ہے۔ تو اس طرح خاموش کیوں بیٹھا ہے؟

وہ پورے عزم و استقلال سے خاموش بیٹھا رہا۔ مرجانہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل

گئیں۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کا جادو بے اثر ہو گیا ہے۔ وہ' وہ جو جلوے کی ابتدا سے ہی بہکنے لگتا تھا' وہ اس نظارے کی انتہا پر بھی پتھر کے بت کی طرح خاموش تھا۔ مرجانہ کے دل کو ایک دھچکا سا لگا۔

عورت سب کچھ برداشت کر سکتی ہے اپنی بے قدری برداشت نہیں کر سکتی۔ وہی تو ایک پونجی تھی اس کے پاس جس پر وہ ناز کرتی تھی اور ایک فولاد کو پگھلا کر رکھ دیتی تھی۔ فولاد نے زور سے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"چلی جاؤ یہاں سے .... آئی سے .... گیٹ آؤٹ.........."

اس گرجتی گونجتی آواز میں ایسی نفرت ایسا غیظ و غضب تھا کہ وہ سر سے پیر تک لرز گئی۔ فوراً ہی فرش پر جھک کر لباس اٹھانے لگی۔ ٹھکرائے ہوئے بدن پر تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں سے غلاف چڑھانے لگی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ بازی ہار چکی ہے۔ وہ بدن کی پھول پتی سے ہیرے کا جگر نہیں کاٹ سکتی تھی۔

وہ الٹے قدموں دروازے کی طرف جاتے ہوئے اسے دیکھنے لگی۔ اب بھی ایک موہوم سی امید' ایک بے نام سی آس تھی کہ شاید وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور اس کی آغوش میں آ کر ہار جائے گا۔

"نکل جاؤ یہاں سے .... گیٹ آؤٹ یو ڈرٹی ڈک.........."

وہ دروازہ کھول کر باہر چلی گئی۔ ہمیشہ کے لئے چلی گئی۔ کمرے میں دروازہ بند ہونے کی آواز گونجی۔ شہریار میز پر دونوں ہاتھ پھیلا کر جھک گیا۔ ایک منٹ کے بعد فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ گھنٹی کی آواز سنتے ہی اس کا ایک ہاتھ ٹیلیفون کی تلاش میں اِدھر سے اُدھر سرکنے لگا۔ پھر وہ ہاتھ ٹیلیفون سے ٹکرایا۔ اس نے ریسیور اٹھا کر کہا۔ "ہیلو۔"

دوسری طرف سے مس روزی کی آواز آئی۔

"شہریار! میرے بچے' وہ جا چکی ہے۔ اس پر مٹی ڈالو۔ چھ بجنے کے لئے تین منٹ رہ گئے ہیں۔ نمبر بولو۔"

وہ چند سیکنڈ تک خاموش رہا۔ پھر اس نے آہستگی سے کہا۔

"ٹو آئیز' اَپ اینڈ ڈاؤن .... نمبر ایٹ۔"

(دو آنکھیں' ایک اوپر ایک نیچے' انگریزی کا نمبر آٹھ)

ہاں دو آنکھیں .... اس کے ہاتھ ریسیور رکھنے کے لئے اِدھر اُدھر بھٹکنے لگے۔ پھر وہ ریسیور کو میز پر چھوڑ کر اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

ہاں دو آنکھیں .... وہ میز کے کناروں کو تھام تھام کر آگے بڑھنے لگا۔

ہاں دو آنکھیں .... میز پیچھے رہ گئی۔ وہ دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر خلا میں راستہ ٹٹولتے ہوئے کمرے کے وسط سے گزرنے لگا۔ ایک عورت کے مجسمے سے ٹکرا گیا لیکن گرنے سے پہلے سنبھل گیا۔ وہاں سے آگے بڑھا تو دروازے سے ٹکرا گیا۔ پھر دونوں ہاتھوں سے دیوار کو ٹٹولتے ہوئے سوئچ بورڈ تک پہنچ گیا اور سوئچ آف کر دیا۔ کمرے میں اندھیرا پھیل گیا۔

اندھیرے کے مسافر کو روشنی سے کیا غرض.........!

☆======☆======☆

دستِ مشترک

اس کے ظالم شوہر نے اس کے دونوں ہاتھوں کو تیزاب سے گلا دیا تھا۔

اس خاندان کی کہانی جہاں پیدا ہونے والی ہر لڑکی

ہاتھوں سے معذور ہوتی تھی۔

وہ صدیوں سے دوسروں کے لہو پر زندہ تھی۔

اس پُراسرار اور حیرت انگیز کہانی کا انجام چونکا دے گا۔

دریائے سیتا لکھا کے اُس پار سیتا کنڈ نامی ایک بستی میں قتل کی واردات ہو گئی تھی۔ انسپکٹر سجاد کو ہیڈ کوارٹر سے حکم ملا کہ وہ جائے واردات پر پہنچ کر قتل کی تفتیش کرے اور قاتل کو گرفتار کر کے لے آئے۔ انسپکٹر سجاد تیس برس کا ایک صحتمند نوجوان تھا' ہیڈ کانسٹیبل سے ترقی کر کے سب انسپکٹر بن گیا تھا۔ تھانے کے بوڑھے انسپکٹر نے اسے سمجھایا۔

"تم جوان ہو۔ پہاڑی راستہ پیدل طے کر سکتے ہو۔ میں اس بڑھاپے میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکوں گا۔ تم اپنے ساتھ تین سپاہی لے جاؤ۔ وہ تمہیں راستہ بتائیں گے اور جائے واردات تک پہنچا دیں گے۔"

انسپکٹر سجاد مہم جوئی کا شوق رکھتا تھا' اس لئے دشوار گزار پہاڑی راستوں سے گزرنے کے لئے تین سپاہیوں کے ساتھ چل پڑا۔ شہر سے باہر سات میل تک وہ تھانے کی جیپ میں آئے۔ وہاں ایک چھوٹی سی بستی میں تھوڑی دیر کے لئے ٹھہر کر اس نے سپاہیوں کے ساتھ پیٹ بھر کر ناشتہ کیا' گرما گرم چائے پی اور تھانے کی جیپ کو واپس بھیج دیا۔ کیونکہ آگے موٹر گاڑیوں کے لئے راستہ نہیں تھا۔ سپاہی اس بستی سے ایک موٹا تازہ گدھا پکڑ کر لے آئے تاکہ نئے انسپکٹر صاحب کو پیدل نہ چلنا پڑے۔ چھوٹے چھوٹے علاقوں میں پولیس والوں کے بڑے مزے ہوتے ہیں۔ وہ جہاں جہاں سے گزرتے تھے وہاں انہیں مفت کھانا مل جاتا تھا۔ بستی کے لوگ ان کے رات گزارنے کا انتظام بھی کر دیتے تھے' ان کے لئے ضرورت کی ہر چیز مہیا کر دیتے تھے۔ حتیٰ کہ آگے جانے کے لئے سواری کا انتظام بھی کر دیا جاتا تھا۔

جب سجاد گدھے پر سوار ہو کر آگے بڑھا تو موسم خوشگوار تھا۔ پہاڑی راستوں کے اطراف ہریالی بھی تھی اور دور تک اونچی چٹانیں اور چھوٹے چھوٹے خشک ٹیلے بھی نظر آ رہے تھے۔ کہیں گہری کھائیاں تھیں اور کہیں اونچی نیچی پہاڑیاں لمبے لمبے تناور درختوں سے چھپی ہوئی تھیں۔ سجاد جوان تھا۔ ابھی اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ مگر وہ شادی کے

خواب دیکھتا تھا۔ پولیس کی ملازمت میں شادی کی فرصت نہیں مل رہی تھی۔ اس لئے خیالی دوشیزاؤں سے دل بہلاتا تھا۔ اس وقت بھی اس کے ذہن میں کوئی قاتل نہیں تھا جس کی تلاش میں وہ جا رہا تھا' کوئی حسین قاتلہ تھی' جو اپنے گھر کی دہلیز پر اس کے لیے کنواری بیٹھی ہوئی تھی۔ ایسے وقت آگے چلنے والے ایک سپاہی نے کان پر ہاتھ رکھ کر ماہیا گانا شروع کر دیا۔ اس کی آواز آس پاس کی چٹانوں سے ٹکرا کر گونجنے لگی اور سجاد کے دل میں اترنے لگی۔ ماہیا کے بول میں سجاد اپنی خیالی محبوبہ کو اپنے لئے تڑپتے دیکھ رہا تھا۔ گیتوں اور سپنوں میں گم رہ کر اسے سفر کی دشواری کا ذرا بھی احساس نہیں ہوا۔ جب شام ہونے لگی اور چپکے چپکے تاریکی پھیلنے لگی تو وہ گانے والا سپاہی خاموش ہو گیا۔ وہ دریائے سیتا لکھا کے قریب پہنچ رہے تھے۔ ابھی وہ دریا سے آدھے میل کے فاصلے پر تھے کہ سجاد کو ایک طرف درختوں کے جھنڈ میں ایک پرانی حویلی نظر آئی۔ سجاد نے گدھے کو روکتے ہوئے پوچھا۔ "رام دیال! اس ویرانے میں کون رہتا ہے؟"

سپاہی رام دیال نے جواب دیا۔ "ہمارے باپ دادا کہتے ہیں کہ دریا کے اس پار سیتا کنڈ کی طرح اس پار بھی ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ پتہ نہیں یہ کیسے اجڑ گئی؟ کچے مکانات سیلاب وغیرہ میں بہہ گئے۔ صرف وہ حویلی اب تک اپنی جگہ کھڑی ہوئی ہے۔"

سجاد نے حویلی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہاں روشنی نظر آ رہی ہے' کیا اب بھی وہاں لوگ آباد ہیں؟"

"جی ہاں' وہاں حویلی کی ایک بوڑھی مالکہ ہے اور اس کی ایک جوان پوتی ہے۔ وہ بڑھیا اپنی ضرورت کا تمام سامان سیتا کنڈ سے خرید کر لے جاتی ہے اور وہاں اپنی پوتی کے ساتھ تنہا رہتی ہے۔"

اگر کوئی بوڑھی عورت وہاں تنہا رہتی تو اس حویلی سے اتنی دلچسپی کبھی نہ پیدا ہوتی۔ اس کے ساتھ ایک جوان لڑکی کا ذکر آیا تو سجاد کا دل بے اختیار اس کی طرف کھنچنے لگا۔ کتنا رومانٹک ماحول تھا۔ گھنے سایہ دار درختوں کے درمیان شام کی نیم تاریکی میں وہ حویلی شاخوں اور پتوں کے پیچھے سے جھلک رہی تھی اور ایک اونچی کھڑکی سے باہر آنے والی روشنی مدھم مدھم اشاروں کی طرح اپنی طرف بلا رہی تھی۔ اس رومانی ماحول میں کہیں ایک نوجوان لڑکی بھی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ وہی اس کے خوابوں کی دلہن ہو اور اس ویرانے میں اس کے لئے اب تک کنواری بیٹھی ہو۔ سجاد نے سپاہیوں سے کہا۔

"ہم رات کو دریا پار نہیں کریں گے۔ ہمیں اس حویلی میں رات گزارنا چاہئے۔ کل

صبح سیتا کنڈ پہنچ کر قاتل کو تلاش کیا جائے گا۔"

ایک سپاہی نے کہا۔ "جناب! انسپکٹر صاحب نے کہا تھا کہ ہمیں جلد سے جلد جائے واردات پر پہنچنا چاہئے۔ اگر ہم نے وقت ضائع کیا تو قاتل بہت دور نکل جائے گا۔"

سجاد کو سپاہی کی یہ بات بہت بُری لگی۔ وہ بیچارہ سپاہی' جوان انسپکٹر کے جذبات کو نہیں سمجھ رہا تھا۔ صرف فرض کا احساس دلا رہا تھا۔

سجاد نے ناگواری سے کہا۔ "اطلاع کے مطابق صبح چار بجے قتل ہوا تھا۔ ہم پندرہ گھنٹے بعد وہاں پہنچیں گے۔ کیا قاتل ہمارے انتظار میں وہاں بیٹھا ہو گا؟ تم احمق ہو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ مجھے اپنے فرض کا احساس نہیں ہے؟ اگر تم مجھ سے زیادہ تجربے کار' چالاک اور دلیر ہو تو اپنے ساتھ ایک سپاہی کو لے کر جاؤ اور اپنے طور پر تفتیش کرو۔ میں صبح وہاں آؤں گا تو مجھے مکمل رپورٹ پیش کرنا۔"

سجاد نے یہ بات غصے سے کہی تھی۔ پھر اس کے دماغ نے کہا جو کچھ وہ کہہ رہا ہے' وہی مناسب ہے۔ اگر سپاہی اس سے پہلے وہاں پہنچ کر اپنے طور پر تفتیش کرتے ہیں تو دوسرے دن اس کے لئے بہت سا کام آسان ہو جائے گا اور وہ خواہ مخواہ کی بھاگ دوڑ سے بچ جائے گا۔ اس منصوبے کا دوسرا پہلو بھی بہت خوبصورت نظر آیا۔ سپاہیوں کے جانے کے بعد وہ تنہا اس حویلی میں رات گزارتا تو اس بڑھیا کی جوان بیٹی سے کھل کر گفتگو کرنے اور آزادی سے وقت گزارنے کا موقع مل جاتا۔ اس نے خوب اچھی طرح سوچ کر بڑی نرمی سے کہا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو' وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ تم لوگ ابھی میرے ساتھ حویلی تک چلو۔ اگر مجھے وہاں آرام سے رات گزارنے کا موقع ملا تو میں وہاں صبح تک رہ جاؤں گا۔ تم تینوں ابھی سے سیتا کنڈ پہنچ کر اپنا کام شروع کر دینا۔"

وہ تینوں اس گدھے کے پیچھے چلنے لگے۔ گدھے سے مراد' انسپکٹر نہیں ہے بلکہ اس گدھے سے ہے جس پر وہ بیٹھا ہوا تھا۔ ویسے تینوں سپاہی دل ہی دل میں سمجھ رہے تھے کہ اپنی منزل سے ہٹ کر دوسری راہ اختیار کرنے والا گدھا ہی ہوتا ہے۔

حویلی کے دروازے پر پہنچ کر ایک سپاہی نے دستک دی۔ دو چار بار دروازہ اچھی طرح پیٹنے کے بعد ویران حویلی کے اندر زندگی کے آثار نظر آئے۔ دور کسی عورت کے بڑبڑانے کی دھیمی دھیمی سی آواز سنائی دے رہی تھی۔ پھر دروازہ کھل گیا۔ کھلے ہوئے دروازے کے پیچھے ایک بوڑھی عورت ہاتھ میں شمعدان لئے کھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں

اندر کو دھنسی ہوئی تھیں چہرے پر اتنی جھریاں تھیں کہ انہیں گنتے گنتے صبح ہو جاتی۔ ان جھریوں سے پتہ چلتا تھا کہ وہ ساٹھ ستر برس کی ہو گی۔ ویسے بوڑھی ہونے کے باوجود اچھی خاصی صحت مند تھی۔ اس نے آنے والوں کو سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں سن چکی ہوں کہ گوپی اپنی گھر والی کو قتل کر کے فرار ہو گیا ہے۔ میں یہ بھی جانتی تھی کہ تم لوگ اسے تلاش کرنے کے لئے یہاں آؤ گے۔ کیونکہ یہاں مجرموں کو آسانی سے چھپایا جا سکتا ہے۔ آؤ اندر آ جاؤ اور یہاں کا کونہ کونہ دیکھ لو۔ میں قانون کا ساتھ دینا اپنا فرض سمجھتی ہوں۔"

اس وقت تک سجاد کے ذہن میں صرف ایک جوان دوشیزہ تھی۔ جوانی کے اندھے جذبے اس طرح بھٹکاتے ہیں کہ اصل راستہ گم ہو جاتا ہے۔ سجاد نے ایک جوان لڑکی کے متعلق سوچتے وقت اس پہلو پر غور نہیں کیا تھا کہ ایک مفرور قاتل ایسی ویران حویلی میں آ کر چھپ سکتا ہے۔ بڑھیا کی بات سن کر اسے اپنے فرض کا احساس ہوا۔ اس نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔

"ماں جی! مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ آپ ہمارے ساتھ تعاون کر رہی ہیں۔ میں اس علاقے میں پہلی بار آیا ہوں۔"

بڑھیا نے کہا۔ میں نئے اور پرانے چہروں کو پہچانتی ہوں۔ میں نے اس علاقے میں آدھی صدی گزار دی ہے۔ بوڑھے انسپکٹر کی جگہ تمہیں دیکھ کر میں پہلے ہی سمجھ گئی تھی کہ تم نئے بھی ہو اور اناڑی بھی..........."

سجاد نے اس کی بات میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ "آپ کیسے کہہ سکتی ہیں کہ میں اناڑی ہوں؟"

وہ شمعدان اٹھائے بڑے ہال کے ننگے فرش پر چلتی ہوئی بولی۔ "میں ابھی آدھ گھنٹہ پہلے سیتا کنڈ سے آئی ہوں۔ وہاں تم اور تمہارے سپاہی نہیں تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم سیدھے یہاں چلے آئے ہو اور یہاں صرف ستانے اور آرام کرنے آئے ہو مجرموں کی تلاش میں آنے والے سپاہیوں کے انداز ہی کچھ اور ہوتے ہیں۔ اگر تم تلاش میں آتے تو پہلے کسی آدمی کو حویلی کے پچھلے دروازے پر بھیجتے اور یہاں اندر آتے ہی تلاشی شروع کر دیتے۔ مگر تم وقت ضائع کر رہے ہو۔"

سجاد اپنے ماتحتوں کے سامنے جھینپ گیا پھر بات بناتے ہوئے بولا۔ "شاید آپ یہ نہیں جانتیں کہ ہم پولیس والے چہروں سے جرم کرنے والوں کو پہچان لیتے ہیں۔ آپ کا

اطمینان بتا رہا ہے کہ آپ نے کسی مجرم کو چھپانے کا جرم نہیں کیا ہے۔ پھر بھی میں فرض ادا کرنے کے طور پر تلاشی لوں گا۔ آپ سے درخواست ہے کہ آپ مجھے اس حویلی کا ایک ایک کمرہ دکھائیں۔"

ایک ایک کمرہ دیکھنے کی درخواست کرتے وقت بھی اس کے ذہن میں یہ بات تھی کہ وہ دوشیزہ کسی نہ کسی کمرے میں موجود ہوگی۔ تین سپاہیوں نے تین شمعیں روشن کیں اور تین اطراف چلے گئے۔ سجاد بڑھیا کے ساتھ چلنے لگا۔ پتہ نہیں بڑھیا نے اس کے خیالات پڑھ لئے تھے یا وہ محض اتفاق تھا کہ وہ سیدھی اسی کمرے میں گئی جہاں وہ بیٹھی ہوئی تھی۔

سجاد کمرے میں پہنچتے ہی اسے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ پھر بے اختیار اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس نے خیالوں میں جتنی دلہنوں کے چہرے بنائے تھے وہ ان سے بھی زیادہ حسین تھی۔ شمعوں کی روشنی میں اس کے حسن کی چاندنی نکھر رہی تھی۔ اس کے بدن پر ریشم کی ایک نائٹی تھی۔ ریشم کی نائٹی سے اس کے ریشمی بدن کی شادابیاں اسے پکار رہی تھیں۔ وہ اس کا سراپا نہیں دیکھ سکا کیونکہ وہ ایک میز کے پیچھے بیٹھی تھی۔ اس کے دونوں چکنے چکنے گلابی ہاتھ میز پر رکھے ہوئے تھے۔ میز پر کھانے کے برتن بھی تھے۔ مگر وہ لقمہ اٹھانے کے بجائے خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ دروازے پر آہٹ سن کر اس نے اپنی گھنی پلکوں کو اٹھایا تو اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں سجاد کے ذہن میں پیوست ہو گئیں۔ وہ ایسی سہمی ہوئی سی معصوم نظریں تھیں کہ انہیں دیکھتے ہی سجاد کا دل دھڑکنے لگا تھا اور جسم میں دھیما دھیما سا سرور جاگ اٹھا تھا۔ اس کے دماغ نے کہا۔ "بس یہی منزل ہے یہیں تھک کر بیٹھ جانا چاہئے۔ فرائض کی ادائیگی تو ہوتی ہی رہتی ہے۔ پروگرام کے مطابق تینوں سپاہیوں کو سیتا کنڈ بھیج دینا چاہئے۔ تینوں اپنا کام کرتے رہیں گے اور وہ یہاں تنہا اس دوشیزہ کے دل کی طرف اپنا راستہ بناتا رہے گا۔"

اس بوڑھی عورت نے آگے بڑھ کر شمعدان کو اس دوشیزہ کے قریب میز پر رکھ دیا۔ دوشیزہ کے چہرے کے نقوش اور زیادہ واضح ہو گئے۔ بڑھیا نے کن انکھیوں سے سجاد کی طرف دیکھا پھر دوشیزہ کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔

"یہ میری پوتی سونیا ہے۔"

سجاد نے لفٹ لینے کی خاطر آگے بڑھ کر مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ "مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔"

مگر وہ خاموش بیٹھی رہی۔ شاید وہ مصافحہ نہ کرنے کے باعث خود ہی شرمندہ تھی۔ کیونکہ اس کی آنکھیں ندامت سے جھک گئی تھیں۔ بڑھیا نے لجاجت سے کہا۔

"سوری انسپکٹر! سونیا آپ سے مصافحہ نہ کر سکے گی' اس کے دونوں ہاتھ مفلوج ہیں۔"

سجاد نے بڑی ہمدردی سے ان خوبصورت ہاتھوں کو دیکھا جو میز پر رکھے ہوئے تھے۔ ان ہاتھوں میں جوانی کا حسن تھا اور عمر کی شگفتگی تھی۔ مگر وہ خوبصورت ہاتھ کسی کے گلے کا ہار نہیں بن سکتے تھے۔ وہ ہاتھ جس حسینہ کی ملکیت تھے' اس حسینہ کی زلفیں بھی نہیں سنوار سکتے تھے۔ اگر کوئی دشمن اس کی قیامت خیز جوانی کی طرف بڑھتا تو وہ ہاتھ اس کی حفاظت بھی نہیں کر سکتے تھے۔ کتنی مجبور تھی وہ' ہاتھوں کے بغیر وہ ایک خاموش مجسمہ نظر آ رہی تھی۔

وہ بوڑھی عورت پلیٹ سے لقمے اٹھا کر اسے کھلانے لگی۔ سجاد کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسے وقت کس طرح ہمدردی کا اظہار کرنا چاہئے۔ اس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔

"آپ کی پوتی بہت حسین ہے۔ کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ اس کے ہاتھ کیسے مفلوج ہو گئے؟"

"یہ پیدائشی طور پر ہی ایسی ہے۔"

سجاد نے کہا۔ "مجھے سونیا سے بے حد ہمدردی ہے۔ اسے دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے یہ اپنے اندر بہت سے دکھ سمیٹے بیٹھی ہو۔"

"انسپکٹر! اس کے دکھوں کا حساب کرو گے تو قاتل ہاتھ سے نکل جائے گا۔ جاؤ اور اپنا فرض ادا کرو۔"

"کسی کے دکھ مصیبت میں کام آنا بھی میرا فرض ہے۔ میرے سپاہی دوسرے فرض کی ادائیگی کے لئے ابھی سیتا کنڈ جائیں گے۔ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں یہ رات یہاں گزار لوں؟"

بڑھیا نے مسکرا کر کہا۔ "ہماری حویلی ایسی جگہ ہے کہ کتنے ہی بھولے بھٹکے مسافر یہاں آ کر پناہ لیتے رہتے ہیں اور تم تو پولیس انسپکٹر ہو' جان و مال کے محافظ ہو تمہارے یہاں رہنے پر بھلا میں کیسے اعتراض کر سکتی ہوں۔"

سجاد نے اس کا شکریہ ادا کیا تو وہ ہاتھ اٹھا کر بولی۔ "لیکن میں تمہیں فرض کا احساس

بھی دلانا چاہتی ہوں۔ وہ تینوں سپاہی صرف لاٹھیاں لے کر قاتل کے پیچھے جائیں گے تو وہ
ہاتھ نہیں آئے گا۔"

"آپ یہاں رہتی ہیں اس لئے قاتل کو اچھی طرح جانتی ہوں گی۔ آپ مجھے اس
کے متعلق بتائیں۔ میں اسے گھیرنے کی تدبیر کروں گا۔"

یہ کہہ کر سجاد میز کی دوسری طرف سونیا کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ بوڑھی
عورت نے سونیا کو کھانا کھلاتے ہوئے کہا۔

"اس کا نام گوپی ہے۔ وہ ایک قدآور جوان ہے۔ تمہاری طرح صحتمند بھی ہے۔ وہ
دلیر ہے مگر چالاک نہیں ہے۔ بستی والے کہتے ہیں کہ اس پر کسی چڑیل کا سایہ پڑ گیا ہے۔
اسی لئے اس نے اپنی خوبصورت بیوی کو قتل کر دیا ہے۔"

سجاد نے کہا۔ "قتل کی کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے۔ قانون یہ تسلیم نہیں کرے گا کہ
ایک چڑیل کے لئے قتل کیا گیا ہے۔ کیا اس چڑیل کا کوئی وجود ہے؟"

"اسے کسی نے نہیں دیکھا ہے لیکن گوپی خود لوگوں کو بتایا کرتا تھا کہ رات کو دریا
کے کنارے ایک بہت ہی حسین عورت اس سے ملنے آتی ہے اور اسے اپنے ساتھ چلنے
کے لئے کہتی ہے۔"

سجاد نے کہا۔ "گوپی ایسی من گھڑت باتیں کہہ کر سزا سے نہیں بچ سکے گا۔"

بڑھیا نے کہا۔ "سزا تو اس وقت ہوگی جب وہ پکڑا جائے گا۔ تمہارے سپاہی صرف
لاٹھیوں سے ہانک کر اسے حوالات تک نہیں لے جا سکیں گے کیونکہ وہ چڑیل اس کی
حفاظت کرتی ہے۔"

"میں بھوتوں اور چڑیلوں پر یقین نہیں رکھتا۔ یہ سب فضول باتیں ہیں۔"

"تم سیتا کنڈ جاؤ گے تو تمہیں اس بات کے چشم دید گواہ ملیں گے کہ وہ چڑیل اس
کی حفاظت کرتی ہے۔"

"ابھی تو آپ کہہ رہی تھیں کہ اس چڑیل کو کسی نے نہیں دیکھا ہے پھر چشم دید
گواہ کیسے ملیں گے؟"

بڑھیا نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر جواب دیا۔ "دیکھنے والے کہتے ہیں کہ جب
گوپی اپنی بیوی کو قتل کرنے کے بعد وہاں سے بھاگنے لگا تو بستی کے چار جوانوں نے اس کا
پیچھا کیا۔ اس وقت صبح کے چار بجے تھے اور رات کا دم توڑتا ہوا اندھیرا ابھی باقی تھا۔ گوپی
کا پیچھا کرنے والے چاروں نوجوان اچانک ہی ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے۔ کہر آلود نیم تاریکی

میں انہیں دو استخوانی ہاتھ نظر آئے۔ ان ہاتھوں نے سب سے آگے والے نوجوان کا گلا
دبوچ لیا۔ یہ منظر دیکھ کر دو نوجوان خوف سے چیختے ہوئے بھاگ گئے۔ تیسرا نوجوان دلیر
تھا۔ وہ آگے بڑھ کر استخوانی ہاتھوں سے اپنے ساتھی کی گردن چھڑانے لگا۔ اس کے ساتھی
کی گردن تو چھوٹ گئی مگر دونوں کے منہ پر دو ہاتھوں کا طمانچہ پڑا۔ وہ دونوں لڑکھڑا کر پیچھے
چلے گئے پھر انہوں نے آگے بڑھنے کی ہمت نہیں کی۔ وہ دونوں ہاتھ اسی طرح ان کے
سامنے فضا میں معلق تھے۔ یوں لگتا تھا کہ ان ہاتھوں کے پیچھے پورا جسم موجود ہے جو کہر
کے پردے میں چھپا ہوا ہے۔ وہ ہاتھ صرف کہنی سے پنجوں تک نظر آ رہے تھے یعنی نادیدہ
جسم ساکت تھا اور دونوں ہاتھ متحرک تھے۔"

بڑھیا کی باتیں سن کر سجاد کی نظریں بے اختیار سونیا کے ہاتھوں پر گئیں۔ وہاں اس
کے برعکس تھا۔ یعنی دونوں ہاتھ ساکت تھے اور سونیا کا سانس لیتا ہوا بدن متحرک تھا۔ ایسا
کہتے وقت بڑھیا نے بھی اپنی پوتی کے ہاتھوں کو دیکھا تھا۔ اس کے بعد وہ ایک ٹھنڈی
سانس لے کر بولی۔

"کاش کہ وہ حرکت کرنے والے ہاتھ میری سونیا کو مل جاتے۔ ہاتھ خواہ ہڈیوں کے
بنے ہوئے ہوں' ان میں گوشت نہ ہو' ان پر کھال نہ ہو مگر وہ حرکت تو کرتے ہوں۔ اس
طرح میری بیٹی اپاہج تو نہیں کہلائے گی۔ جب سے میں نے بستی والوں کی زبانی یہ بات سنی
ہے' تب سے یہی سوچ رہی ہوں کہ سونیا کے ہاتھ اتنے خوبصورت نہ ہوتے۔ صرف
استخوانی ہوتے تو کیا فرق پڑ جاتا۔ اس کا باقی جسم اتنا خوبصورت ہے کہ میں پلاسٹک سرجری
کے ذریعے استخوانی ہاتھوں کی بدصورتی کو چھپا دیتی۔ پھر میری بیٹی ہر لحاظ سے مکمل ہو
جاتی۔ یہ اپنے ہاتھ سے کھانا کھاتی۔ اپنے ہاتھوں سے بال سنوارتی اور کوئی اس کا چاہنے والا
اسے محبت سے ایک پھول پیش کرتا تو یہ ہاتھ بڑھا کر اس پھول کو قبول کر لیتی۔"

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ تینوں سپاہی حویلی کی تلاشی لینے کے بعد اس کمرے
میں آ گئے تھے۔ سپاہی رام دیال نے کہا۔

"جناب! ہم نے حویلی کا کونہ کونہ چھان مارا ہے۔ قاتل یہاں نہیں ہے اور حویلی کا
پچھلا دروازہ بھی اندر سے بند ہے۔ یہ نہیں سوچا جا سکتا کہ وہ پچھلے دروازے سے فرار ہو
گیا ہے۔"

سجاد نے سر ہلا کر کہا۔ "ٹھیک ہے۔ میں پہلے ہی ماں جی کا چہرہ دیکھ کر سمجھ گیا تھا کہ
یہاں قاتل کو پناہ نہیں دی گئی ہے۔ تم تینوں سیتا کنڈ چلے جاؤ۔ میں صبح وہاں پہنچ جاؤں

گا۔"

بڑھیا نے کہا۔ "انسپکٹر اپنے سپاہیوں سے کہو کہ گوپی کہیں نظر آئے تو اسے نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کریں۔ یہ لوگ وہاں پہنچیں گے تو بستی والے انہیں بھی استخوانی ہاتھوں کی کہانی سنائیں گے۔ بہتر ہے کہ یہ کسی نادیدہ قوت سے نہ ٹکرائیں۔ صرف یہ معلوم کریں کہ گوپی نے کہاں پناہ لی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اسے دن کی روشنی میں گھیرا جائے گا تو شاید وہ استخوانی ہاتھ اس کی مدد نہیں کر سکیں گے۔"

سونیا کی دادی کا مشورہ مناسب تھا۔ سجاد نے سپاہیوں سے کہا کہ وہ اس مشورے پر عمل کریں۔ اگر کہیں گوپی نظر آ جائے تو اس کی لاعلمی میں اس کا پیچھا کریں اور اس کی جائے پناہ معلوم کرنے کی کوشش کریں۔

وہ افسرانہ انداز میں سپاہیوں کو حکم دے رہا تھا۔ اس دوران اس نے محسوس کیا کہ سونیا اسے متاثر ہونے کے انداز میں دیکھ رہی ہے۔ اس نے سر گھما کر دیکھا تو وہ اس کی وردی اور صحتمند جسم کو بڑی توجہ سے دیکھ رہی تھی۔ سجاد کا سینہ فخر سے تن گیا۔ وہ سپاہیوں کے سامنے کچھ اور زیادہ افسرانہ اور تحکمانہ انداز اختیار کرنے لگا تاکہ وہ حسینہ اس سے مرعوب ہوتی رہے۔

مؤدب کھڑے ہوئے سپاہی اس کا حکم سنتے رہے۔ پھر ایڑیاں بجا کر سلیوٹ کرنے کے بعد رخصت ہو گئے۔ سجاد نے گردن اکڑا کر افسرانہ شان سے سونیا کی طرف دیکھا تو وہ جلدی سے نظریں چرانے لگی۔ اس کی دادی نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"انسپکٹر! میں تمہارے رات گزارنے کے لئے کمرہ ٹھیک کرتی ہوں۔ تم میرے ساتھ چلو وہیں کھانا بھی کھالینا۔"

سجاد نے سونیا کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں یہاں بیٹھ کر بھی کھا سکتا ہوں۔ اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو یہیں کھانا لے آیئے۔"

بوڑھی دادی نے اسے ذرا ناگواری سے دیکھا۔ پھر اپنی پوتی کو دیکھنے لگی۔ سونیا اپنی دادی کو ایسی نظروں سے دیکھ رہی تھی جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہی ہو۔

تم چلی جاؤ۔ انسپکٹر کو یہاں رہنے دو۔"

بوڑھی ایک جھٹکے سے گھوم کر کمرے سے باہر جانے لگی۔ پھر دروازے کے پاس جا کر رک گئی۔ اس نے پلٹ کر دونوں کو میز کے اطراف آمنے سامنے بیٹھے دیکھا۔ پھر انسپکٹر کو مخاطب کرتی ہوئی بولی۔

"یہ سونیا کی خوابگاہ ہے' ڈائننگ ہال نہیں ہے۔ آفیسر! تمہیں کچن میں آ کر کھانا چاہئے۔"

وہ اپنی بات کا جواب سنے بغیر وہاں سے چلی گئی۔ سجاد نے طنزیہ انداز میں مسکرا کر اسے جاتے ہوئے دیکھا۔ پھر گھوم کر سونیا سے بولا۔

"تمہاری دادی کو میرا یہاں بیٹھنا ناگوار گزر رہا ہے۔"

سونیا نے کوئی جواب نہیں دیا' چپ چاپ سر جھکائے بیٹھی رہی سجاد نے پوچھا۔

"کیا تمہیں بھی میری موجودگی ناگوار گزر رہی ہے؟"

سونیا نے نفی میں سر ہلایا۔ یہ خاموش جواب پا کر سجاد کو خوشی ہوئی کہ اس حسینہ کو اس کی موجودگی گراں نہیں گزر رہی ہے۔

"سونیا! میں بہت دیر سے یہاں بیٹھا ہوں مگر ابھی تک تمہاری آواز نہیں سنی۔ کیا تم قوتِ گویائی سے محروم ہو؟"

اس نے پھر نفی میں سر ہلایا۔

"یعنی تم بول سکتی ہو؟"

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تعجب ہے۔ سوا سیر کا سر ہلا رہی ہو' چھٹانک بھر کی زبان نہیں ہلاتی ہو۔"

اس کے رس بھرے لبوں پر سندر سی مسکراہٹ آ گئی۔ سجاد کے جی میں آیا کہ اس میٹھی رس بھری مسکراہٹ کو چرا لے مگر چوری کی راہیں ابھی کھل رہی تھیں۔ اس لئے وہ صبر کئے بیٹھا رہا۔ وہ آہستگی سے بولی۔

"میں زیادہ نہیں بولوں گی۔ دادی اماں آ جائیں گی۔ میں آپ سے التجا کرتی ہوں کہ آپ رات یہاں نہ گزاریں۔"

"اگر تم مجھے بارِ خاطر سمجھتی ہو تو میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

سونیا نے اسے یوں نظریں اٹھا کر دیکھا جیسے اس کے جانے کے ذکر سے اسے صدمہ پہنچا ہو۔

"آپ بارِ خاطر نہیں ہیں۔ آپ بہت اچھے ہیں۔ میں یہاں تنہا زندگی گزارتی ہوں۔ مجھے بھی ایک ساتھی کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ آخر میں بھی تو انسان ہوں۔ میں دل سے چاہتی ہوں کہ آپ یہاں سے کبھی نہ جائیں مگر یہ بھی چاہتی ہوں کہ آپ پر کوئی آنچ نہ آئے۔ آپ یہ رات یہاں گزاریں گے تو پھر آپ اس رات کی صبح نہیں دیکھ سکیں

گے۔"

اس کی آواز خوف سے لرز رہی تھی۔ سجاد ذرا سنبھل کر بیٹھ گیا۔ پہلے اس نے محتاط نظروں سے دروازے کی طرف دیکھا پھر پلٹ کر پوچھا۔

"تم سہمی ہوئی ہو۔ مجھے بتاؤ کیا بات ہے؟ میں تمہاری مدد کروں گا۔"

"آپ میری مدد نہیں کر سکیں گے۔ اگر میرے دونوں ہاتھ مفلوج نہ ہوتے تو میں آپ کو یہاں سے جانے کے لئے نہ کہتی۔ تمام رات آپ کی حفاظت کرتی۔"

سجاد کا تجسس بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ حویلی ہر لمحے پُراسرار بنتی جا رہی تھی۔ اسے بچپن کی سنی ہوئی وہ کہانی یاد آئی جس میں ایک دیو نے ایک حسین شہزادی کو لے جا کر ایک قلعے میں قید کر دیا تھا۔ ایک شہزادے نے آ کر اس شہزادی کو دیو کے چنگل سے آزاد کرایا تھا۔ سجاد نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"اگر تم کسی مصیبت میں گرفتار ہو تو سمجھ لو کہ تمہاری بدنصیبی کے دن ختم ہو گئے ہیں۔ تمہارے دونوں ہاتھ بیکار ہیں مگر میرے دونوں ہاتھ فولاد کی طرح مضبوط ہیں۔ تم مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ' بے خوف و خطر بتاؤ کہ تم کس لئے سہمی ہوئی ہو؟"

وہ دھیمی آواز میں ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ میں صرف آپ کے لئے خوفزدہ ہوں۔ آپ سمجھتے کیوں نہیں؟"

"تم سمجھاؤ گی تو سمجھوں گا۔ یہ اچھی طرح سمجھ لو کہ میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔"

"نہیں' پلیز آپ میری خاطر یہاں سے چلے جائیں۔"

"میں تمہاری خاطر ہی یہاں رات گزارنے آیا ہوں۔"

وہ پریشان ہو کر بولی۔ "اوہ' آپ بہت ضدی ہیں۔ میں کیا کروں؟ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر آپ یہاں رہنے پر بضد ہیں تو کم از کم میرے ایک مشورے پر عمل کریں۔ جس کمرے میں آپ رات گزاریں' اس کا دروازہ اندر سے بند رکھیں اور صبح سے پہلے دادی اماں سے سامنا نہ کریں۔"

اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "آخر بات کیا ہے؟ کیا مجھے تمہاری دادی اماں سے کوئی خطرہ ہے؟"

"ہاں' میں ابھی آپ کو نہیں بتا سکتی کہ وہ کتنی خطرناک ہیں۔ آدھی رات کے بعد ان کا مزاج' ان کا چہرہ اور ان کی شخصیت بدل جاتی ہے۔"

سجاد نے بے یقینی سے کہا۔ "یہ تم قصے کہانیوں والی باتیں کر رہی ہو۔"

وہ بڑی بے بسی سے بولی۔ "ابھی میں آپ کو یقین نہیں دلا سکتی۔ وہ ٹھیک تین بجے اپنے کمرے میں جا کر سو جاتی ہیں۔ جب وہ سو جائیں گی تو آپ تین بجے کے بعد میرے کمرے میں آئیں۔ میں نے ان کے متعلق جو کچھ کہا ہے' اس وقت اس کا ثبوت پیش کر دوں گی۔ ابھی آپ یہاں سے چلے جائیں۔ وہ کچن میں آپ کا انتظار کر رہی ہوں گی۔ اگر انہیں ذرا بھی شبہ ہو گیا تو آپ کے ساتھ میری بھی شامت آ جائے گی۔"

اسے خوفزدہ دیکھ کر سجاد اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "اچھی بات ہے۔ میں جا رہا ہوں۔ مگر ٹھیک تین بجے کے بعد یہاں آؤں گا۔ کیا تم میرے لئے جاگتی رہو گی؟"

"ہاں' میں گہری نیند سونے کی عادی ہوں مگر آج آپ کے لئے جاگتی رہوں گی۔"

سجاد نے اسے بڑی میٹھی نظروں سے دیکھا پھر کامیابی سے مسکراتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ بوڑھی دادی اس کے لئے کچن میں انڈوں کا آملیٹ بنا رہی تھی۔ اسے دیکھ کر مسکراتی ہوئی بولی۔

"کچن کے ساتھ ہی ڈائننگ روم ہے' تم وہاں بیٹھو میں کھانا لے کر آتی ہوں۔"

سجاد نے آگے بڑھ کر پلیٹیں اٹھاتے ہوئے کہا۔ "آپ بوڑھی ہو کر میرے لئے تکلیف اٹھا رہی ہیں۔ میں آپ کا ہاتھ بٹانا چاہتا ہوں۔"

"میں بوڑھی ضرور ہوں مگر تمہارے جیسے جوان کی کلائی پکڑ لوں تو چھڑا نہیں سکو گے۔"

سجاد کو یوں محسوس ہوا جیسے ایک نادیدہ استخوانی پنجے نے اس کی کلائی پکڑ لی ہو۔ وہ خیالی گرفت بڑی مضبوط تھی۔ اس نے چونک کر وحشت زدہ نظروں سے اس بوڑھی خبیثہ کو دیکھا۔ جو دوسری طرف منہ کئے کیتلی میں چائے انڈیل رہی تھی۔ سجاد نے سر جھکا کر اپنی کمر سے لگے ہوئے ہولسٹر کو دیکھا جس میں بھرا ہوا ریوالور تھا۔ ریوالور کی موجودگی سے وہ مطمئن ہو کر مسکرانے لگا۔ بوڑھی دادی چائے کا کپ اور کیتلی ٹرے میں رکھ کر اٹھاتے ہوئے بولی۔

"میرے ساتھ آؤ۔ کھانے کے بعد تمہیں ایسی چائے پلاؤں گی کہ تمام رات خوابوں میں جنت کی سیر کرتے رہو گے۔"

سجاد نے روٹی اور سالن کی پلیٹیں اٹھا کر اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کو یہ بتانا بھول گیا تھا کہ میں چائے نہیں پیتا ہوں۔"

بڑھیا نے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر اس سے نظریں ٹکراتے ہی سنبھل کر بولی۔ ”تعجب ہے۔ آج کل کے سبھی نوجوان چائے پیتے ہیں اور تم اس نعمت سے پرہیز کرتے ہو۔ اگر تم کہو تو دودھ گرم کر کے لے آؤں؟“

وہ ڈائننگ روم میں پہنچ گئے۔ سجاد نے میز پر پلیٹیں رکھ کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”میرے سامنے جو کھانا ہے‘ میں صرف وہی کھاؤں گا۔ دودھ بچے پیتے ہیں۔ ہم پولیس والوں کو صرف دشمنوں کا لہو اچھالتے ہوئے مزا آتا ہے۔“

وہ میز کے دوسری طرف رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھتے ہوئے ناگواری سے بولی۔ ”تم بہت زیادہ ڈینگیں مارتے ہو۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ تم اناڑی ہو مگر میری بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ کیسی نادانی اور ناتجربہ کاری ہے کہ بغیر سوچے سمجھے اس حویلی میں رات گزارنے کے لئے تیار ہو گئے ہو؟“

سجاد نے لقمہ چباتے ہوئے انجان بن کر پوچھا۔ ”کیوں اس حویلی میں ایسی کیا بات ہے؟ کیا یہاں رات گزارنے والے مسافروں کو تم لوٹ لیا کرتی ہو؟“

اس کے جواب دینے سے پہلے ہی ایک بڑی سی دیوار گھڑی ٹن ٹن دس بجانے لگی۔ اس ویران حویلی میں ٹن ٹن کی آواز بڑی اعصاب شکن تھی۔ جب آواز گونجتے گونجتے فضا میں تحلیل ہو گئی تو وہ بڑے ہی تھکے ہوئے انداز میں بولی۔

”ابھی تو دس بجے ہیں۔“

”کیا تم بارہ بجانا چاہتی ہو؟“

”میں چاہتی ہوں کہ اس حویلی میں تمہارے بارہ نہ بجیں۔ یا تو تم بارہ بجے سے پہلے اس حویلی کو چھوڑ کر چلے جاؤ یا پھر جو کمرہ میں تمہیں رات گزارنے کے لئے دوں۔ اس کا دروازہ اندر سے بند کر لینا اور صبح سے پہلے باہر نہ نکلنا۔“

سجاد کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ وہ الجھی ہوئی نظروں سے بڑھیا کو دیکھنے لگا۔ یہی بات اسے سونیا نے بھی کہی تھی۔ اس نے کہا۔

”تم اپنی باتوں سے مجھے الجھا رہی ہو۔ صاف صاف کہو۔ کیا کہنا چاہتی ہو؟“

بڑھیا نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”یہ بات میں تمہیں بہت پہلے ہی بتانا چاہتی تھی مگر سونیا کے سامنے نہ کہہ سکی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کس طرح تمہیں اس خوبصورت چڑیل سے دور رکھوں۔“

سجاد نے ناگواری سے کہا۔ تمہیں اپنی معصوم اور اپاہج پوتی کے بارے میں ایسے

الفاظ نہیں کہنے چاہئیں۔“

”وہ میری پوتی نہیں ہے۔“

”پھر کون ہے؟ کیا تمہارا اس سے خونی رشتہ نہیں ہے؟“

”ہاں‘ خونی رشتہ ہے۔ مگر میں بتا نہیں سکتی کہ وہ کیسا رشتہ ہے۔ کچھ رشتے ایسے ہوتے ہیں جو دوسروں کو بتائے نہیں جا سکتے۔ یہ ہمارا گھریلو معاملہ ہے۔ میں اس سلسلے میں تمہیں کچھ نہیں بتا سکتی۔“

”تم یہ نہیں بتا سکتیں۔ مگر یہ بتا رہی ہو کہ وہ اپاہج لڑکی چڑیل ہے۔ کیا وہ تمہارے گھر کی اور تمہارے خاندان کی ایک فرد نہیں ہے؟“

”سونیا میرے خاندان کی ایک فرد ہے۔ میں اس سے بہت زیادہ محبت بھی کرتی ہوں۔ مگر تم انسان کے جان و مال کے محافظ ہو اس لئے میں تمہاری حفاظت بھی کرنا چاہتی ہوں۔ میری بات مان لینے میں کیا حرج ہے۔ میں تم سے صرف اتنا ہی چاہتی ہوں کہ تم صبح تک اپنے کمرے سے باہر نہ نکلو۔“

سجاد نے کہا۔ ”اگر میں تمہاری بات مان لوں تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ میں سونیا کو ایک مجرمہ تسلیم کر رہا ہوں۔ تم بھی قانون کی زد میں آؤ گی۔ کیونکہ تم نے بقول تمہارے ایک چڑیل کو پناہ دے رکھی ہے۔“

”بیشک وہ انسانی لہو کی پیاسی ہے اور میں نے اسے پناہ دے رکھی ہے۔ ہم دونوں قانون کی زد میں آتے ہیں۔ مگر تم کیسے ثابت کرو گے کہ ہم دونوں مجرم ہیں۔ کیا تم نے کوئی ایسی بات دیکھی ہے جو خلافِ قانون ہو؟ یہ بات تو میں نے صرف تمہاری بھلائی کے لئے کہی ہے۔“

سجاد سوچ میں پڑ گیا۔ واقعی وہ ثابت نہیں کر سکتا تھا کہ اس حویلی میں آدھی رات کے بعد خونی ڈرامہ کھیلا جاتا ہے۔ اس نے بڑھیا سے کہا۔ ”میں آج تمام رات جاگتا رہوں گا اور یہ دیکھوں گا کہ تم دونوں میں سے چڑیل کون ہے؟“

”کیا؟“ بڑھیا نے چیخ کر کہا۔ ”کیا سونیا نے تم سے کہا ہے کہ میں چڑیل ہوں۔ وہ حرافہ جھوٹی ہے۔ میں اس کا گلا دبا دوں گی۔“

سجاد کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اسے ایسی کوئی بات نہیں کہنی تھی جس سے سونیا پر الزام آتا۔ اس نے جلدی سے بات بناتے ہوئے کہا۔

”میں نے یہ کب کہا ہے کہ سونیا تمہیں چڑیل کہتی ہے۔ یہ تو میں خود اس لئے کہہ

رہا ہوں کہ تم مجھے چڑیل نظر آ رہی ہو۔"

وہ غصے سے جھلا کر ایک جھٹکے سے اس طرح اٹھی جیسے ابھی اس کی گردن دبوچ لے گی۔ سجاد بھی بڑی پھرتی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اتنی ہی پھرتی سے اس نے ریوالور نکال کر اسے نشانے پر رکھ لیا۔ ریوالور کو دیکھتے ہی وہ جھاگ کی طرح بیٹھ گئی پھر جبراً مسکراتی ہوئی بولی۔

"میں قانون کا احترام کرتی ہوں۔ تمہیں شکایت کا موقع نہیں دینا چاہتی۔"

وہ فوراً ہی گرم ہو جاتی تھی۔ فوراً ہی نرم پڑ جاتی تھی۔ ریوالور کو دیکھتے ہی اس کے جبراً مسکرانے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ بہت مکار ہے۔ سجاد نے ریوالور کو اپنے سامنے میز پر رکھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اگر تم قانون کا احترام کرتی ہو تو اس بات کا ثبوت پیش کرو کہ سونیا وہ نہیں ہے جو نظر آتی ہے۔ میں کسی ثبوت کے بغیر تمہاری بات تسلیم نہیں کروں گا۔"

وہ ہچکچاتی ہوئی بولی۔ "میں کیسے ثبوت پیش کروں۔ آدھی رات کے بعد وہ جس بھیانک روپ میں آتی ہے' اسے تم دیکھ نہیں سکو گے اور اگر دیکھنے کے لئے اس کا سامنا کرو گے تو پھر یہ حویلی تمہارا مدفن بن جائے گی۔ آج تک کوئی چشم دید گواہ اس حویلی سے باہر نہیں جا سکا۔"

"میں ان دھمکیوں میں آنے والا نہیں ہوں۔"

"تم غلط سمجھ رہے ہو۔ میں تمہیں خوفزدہ نہیں کرنا چاہتی۔ تمہیں سونیا کے اصل روپ کو سمجھنے کے لئے ذرا عقل سے کام لینا چاہئے۔ کیا تم نے سونیا کے دونوں ہاتھوں کو نہیں دیکھا؟ تم شاید میری بات کا یقین نہیں کرو گے۔ مگر وہی دونوں ہاتھ گوپی کی حفاظت کرتے ہیں۔ وہ ہاتھ ابھی اس لئے مفلوج ہیں کہ حویلی سے باہر جا کر اس قاتل نوجوان کی حفاظت کر رہے ہیں۔ آدھی رات کے بعد جب وہ اپنے اصلی روپ میں آئے گی تو وہ دو استخوانی ہاتھ اسے واپس مل جائیں گے۔"

سجاد بڑی گہری نظروں سے اس بڑھیا کے چہرے کو تک رہا تھا۔ وہ بڑی سنجیدگی سے یہ باتیں کہہ رہی تھی۔ سجاد نے کہا۔

"تم کہتی ہو کہ مجھے ذرا عقل سے کام لینا چاہئے۔ مگر عقل ایسی باتیں تسلیم نہیں کرتی۔ پھر میں کیسے تسلیم کر لوں کہ وہ مفلوج ہاتھوں والی ایسی ظالم ہے جیسی کہ تم لفظوں میں پیش کر رہی ہو۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھتی ہوئی بولی۔ "ہاں تم میری بات کا یقین نہیں کرو گے۔ ایک حسین نوجوان عورت کے سامنے بوڑھی کھنڈر نما عورت کی باتیں بے وزن ہوتی ہیں۔"

سجاد کھانا ختم کر چکا تھا۔ اپنے ریوالور کو تھام کر اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ وہ سجاد کو اس کمرے کی طرف لے جانا چاہتی تھی جو اس کے لئے مخصوص تھا۔ اس کے ساتھ چلتے ہوئے بڑھیا نے کہا۔

"تمہارا کمرہ بہت محفوظ ہے۔ کھڑکیاں اور دروازے اندر سے بند ہو جاتے ہیں۔ کیا میں یقین کروں کہ تم میری باتوں پر عمل کرو گے؟"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم سونیا کے متعلق ایسی باتیں کیوں کر رہی ہو جبکہ تم اس سے بے حد محبت کرتی ہو۔ کیا تمہیں اس بات کا ڈر نہیں ہے کہ میں کسی طرح بھی قانونی ہیرا پھیری سے اسے گرفتار کر سکتا ہوں اور اسے اذیتیں پہنچا کر اس کی اصلیت معلوم کر سکتا ہوں۔"

وہ ایک کمرے کے دروازے پر آ کر رک گئی۔ پھر اسے دیکھ کر مسکراتی ہوئی بولی۔

"اسے اذیتیں پہنچانا تو بہت دور کی بات ہے۔ وہ اتنی حسین اور نازک ہے کہ تم اسے صرف ایک پھول کی طرح چھونا چاہو گے۔ یہ تمہارا کمرہ ہے' جاؤ آرام سے بستر پر لیٹ کر اپنے دل کو ٹٹولو کہ تم کسی حال میں بھی اس پر ظلم کرو گے یا محبت سے آغوش میں لینے کی تمنا کرو گے؟"

سجاد نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم بھی یہاں سے جا کر اپنے دل کو ٹٹولو اور اپنے جھوٹ اور سچ کو سمجھو۔ ویسے میں سمجھ گیا ہوں کہ تم محض اپنی حسین پوتی سے مجھے دور رکھنے کے لئے اسے ایک بھیانک روپ میں پیش کر رہی ہو۔ میں اناڑی نہیں ہوں جیسا کہ اب تک تم مجھے کہتی آئی ہو۔"

یہ کہہ کر اس نے دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ بوڑھی بند دروازے کو یوں گھور کر دیکھ رہی تھی جیسے دروازے کے پیچھے جانے والے کو کچا چبانے کا تصور کر رہی ہو۔ پھر وہ بہت آہستگی سے زیر لب بڑبڑانے لگی۔

"چراغ بجھنے سے پہلے بہت زیادہ بھڑکتا ہے۔ اس اناڑی کی زبان بھی بند ہونے سے پہلے قینچی کی طرح تیزی سے چل رہی ہے۔ بہت جلد یہ زبان کی قینچی کند ہو جائے گی۔"

☆======☆======☆

وہ بڑبڑاتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ سجاد کمرے میں آ کر پہلے چاروں طرف نظریں

دوڑانے لگا۔ کھڑکی اور دروازے اندر سے بند تھے۔ پھر بھی اس نے سوچا' سونے سے پہلے وہ کمرے کے در و دیوار کو اچھی طرح چیک کر لے گا۔ مگر نیند ابھی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ ابھی وہ بہت کچھ سوچنا چاہتا تھا۔ دادی اور پوتی کی باتوں نے اسے الجھا کر رکھ دیا تھا۔ ان کی باتوں کی روشنی میں یہ سمجھنا اور پرکھنا ضروری تھا کہ دونوں میں سے کون سچی اور کون جھوٹی ہے؟

اس نے سگریٹ کیس اور لائیٹر جیب سے نکال کر ایک تپائی پر رکھا اور قریب ہی ایک ایزی چیئر پر نیم دراز ہو گیا۔ پہلے اس نے سونیا کے متعلق سوچنا شروع کیا۔ اس کے متعلق سوچتے ہی وہ تصور میں اپنے مفلوج ہاتھ لئے اس کے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔ اس کی شہد ٹپکانے والی رسیلی آواز' اس کی معصومیت' آنکھوں کو چکاچوند کرنے والا حسن اور جاذبِ نظر بدن سب کچھ ایسا تھا کہ اسے کسی پہلو سے بد ہیئت اور بد شکل چڑیل نہیں کہا جا سکتا تھا۔ پھر بچپن میں سنی ہوئی باتیں یاد آئیں کہ چڑیلیں خوبصورت عورت کے روپ میں آتی ہیں۔ ان کی پہچان یہ ہے کہ ٹخنوں کی طرف سے ان کے پنجے پیچھے کی طرف مڑے ہوتے ہیں اور سونیا کے دونوں ہاتھ مفلوج تھے اس طرح وہ پیچھے کی طرف بھی مڑ سکتے تھے۔

اس نے چشمِ تصور میں اس کے دونوں ہاتھوں کو پیچھے مڑتے دیکھا۔ اس کے باوجود وہ ایک ذرا سی بھی بدصورت یا قابلِ نفرت نظر نہیں آئی۔ بلکہ بہت مجبور' معصوم اور ہمدردی کے قابل نظر آئی تھی۔ سجاد کو اس کی مخالفت میں صرف ایک پوائنٹ ملا۔ وہ یہ کہ چڑیلیں حسین عورت کے روپ میں سامنے آتی ہیں۔ اس نے اس پوائنٹ کو محفوظ رکھا۔ پھر سگریٹ کیس سے ایک سگریٹ نکال کر اس بوڑھی کے متعلق سوچنے لگا۔

سگریٹ اُس کے ہونٹوں میں دبا ہوا تھا۔ لائیٹر تپائی پر رکھا ہوا تھا اور وہ بوڑھی خیالوں میں اس کے سامنے چلی آئی تھی۔ اسے تصور میں دیکھتے ہی اس کی بہت سی باتیں یاد آئیں۔ اسے یاد آیا کہ جب تک وہ سونیا کے سامنے تھی اور اسے کھانا کھلا رہی تھی' اس وقت تک وہ سونیا کی حمایت میں اور ہمدردی میں باتیں کر رہی تھی۔ اس نے دو استخوانی ہاتھوں کا تذکرہ کرتے وقت یہ تمنا کی تھی کہ وہ ہاتھ اگر سونیا کو مل جاتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ وہ ہڈیوں والے ہاتھوں پر پلاسٹک سرجری کروا دیتی اور اس طرح اپنی پوتی کے حسن کو مکمل کر دیتی۔

اور ڈائننگ روم میں اس سے دُور ہوتے ہی اس نے اسے اپنی پوتی تسلیم کرنے

سے انکار کر دیا تھا۔ جسے مکمل طور پر حسین بنانا چاہتی تھی' اسے چڑیل کہہ رہی تھی۔ ایسی دو رخی باتیں کوئی چڑیل ہی کر سکتی ہے۔ اس طرح اس نے بڑھیا کی مخالفت میں ایک پوائنٹ نوٹ کر لیا۔ پھر اس کے دماغ میں دوسرا خیال یہ آیا کہ سونیا حویلی کی چاردیواری میں محدود زندگی گزار رہی ہے۔ اس حویلی سے باہر کیا ہو رہا ہے' وہ نہیں جانتی۔ وہ دو استخوانی ہاتھ باہر جو کچھ کر رہے تھے ان کی کہانی بڑھیا نے ہی سنائی تھی۔ ایسا سوچتے وقت خیالوں میں بیٹھی ہوئی بڑھیا کے دونوں استخوانی ہاتھ نظر آئے۔ سگریٹ اس کے ہونٹوں میں دبا ہوا تھا۔ ایک استخوانی ہاتھ نے آگے بڑھ کر لائیٹر اٹھایا اور سگریٹ کو سلگا دیا۔ سگریٹ سلگانے کے بعد اس ہاتھ نے لائیٹر کو پھر تپائی پر رکھ دیا۔ وہ سوچ میں اس قدر گم ہو گیا تھا کہ سگریٹ کے کش لگاتے وقت سوچنے میں اور لطف آ رہا تھا۔

اس نے بڑھیا کے خلاف دوسرا پوائنٹ نوٹ کیا کہ استخوانی ہاتھوں کے متعلق صرف بڑھیا ہی جانتی ہے اور ایک نوجوان مرد کو اپنی حسین پوتی سے دور رکھنے کے لئے ان استخوانی ہاتھوں کو اس کے مفلوج ہاتھوں سے وابستہ کر رہی ہے۔ بڑھیا ایسی باتیں کہہ کر صرف بارہ بجے تک اپنی پوتی سے دور رکھنا چاہتی ہے۔ کیونکہ بارہ بجے تک وہ محض ایک بوڑھی اور کمزور عورت ہے۔ بارہ بجے کے بعد وہ اپنا روپ بدلے گی۔

اچانک ہی اس کی سوچ کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ دیوار گھڑی کی ٹن ٹن پوری حویلی میں گونج رہی تھی۔ اس وقت پورے گیارہ بجے تھے۔ رات دو حصوں میں تقسیم ہونے کے لئے ایک گھنٹے کا انتظار کر رہی تھی۔ رات کے دوسرے حصے میں کیا ہونے والا ہے' اس کے متعلق وہ زیادہ سوچ نہ سکا۔ اچانک ہی اسے خیال آیا کہ وہ سگریٹ کے کش لگا رہا ہے۔ اس نے چونک کر لائیٹر کی طرف دیکھا جو تپائی پر رکھا ہوا تھا۔ پھر سگریٹ کو انگلیوں میں لے کر دیکھنے لگا۔

"میں نے سگریٹ کب سلگایا؟ مجھے یاد نہیں آ رہا ہے' کب میں نے تپائی پر سے لائیٹر اٹھایا؟ کب اسے سلگایا؟"

وہ پریشان ہو کر سوچنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس نے کس وقت لائیٹر اٹھا کر سگریٹ سلگایا ہے۔ وہ چاروں طرف وحشت زدہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس کی دانست میں یہ احمقانہ خیال تھا کہ بند کمرے میں آ کر کسی نے اس کا سگریٹ سلگایا ہو۔ اگر کوئی آتا تو وہ ضرور اس کی موجودگی سے چونک جاتا۔ پھر اس نے دل ہی دل میں کہا۔

"نان سینس۔ میں خواہ مخواہ الجھ جاتا ہوں۔ اپنا سگریٹ میں نے ہی سلگایا ہے۔"

بعض اوقات انسان سوچ میں اتنا محو ہو جاتا ہے کہ اس محویت میں اسے ضمنی حرکتیں یاد نہیں رہتیں۔ میں بھی سوچ میں اس قدر گم ہو گیا تھا کہ بے خیالی میں سگریٹ سلگانے کے بعد اپنے اس عمل کو بھول گیا۔ گھڑی کی ٹن ٹن نے میری سوچ میں گڑبڑ پیدا کر دی۔ ہاں' میں کیا سوچ رہا تھا؟"

وہ پھر دادی اور پوتی کے متعلق سوچنے لگا۔ اس بار دونوں اس کے سامنے تھیں۔ جب وہ ایک ساتھ سامنے آئیں تو اسے یاد آیا کہ دونوں ہی اس کی حفاظت کرنا چاہتی ہیں۔ دونوں نے ہی یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ رات کو اپنے کمرے سے باہر نہ نکلے۔ یہ چکر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ جب دونوں ہی اس کی حفاظت کرنا چاہتی تھیں تو پھر خطرہ کس سے تھا؟

وہ پریشان ہو کر اپنا سر کھجانے لگا۔ تب یہ بات سمجھ میں آئی کہ کمرے کے اندر رہ کر بھی وہ محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اس کی انگلیوں میں سلگتا ہوا سگریٹ یہی سمجھا رہا تھا۔ اس نے جھلا کر سگریٹ کو فرش پر پھینک دیا اور اسے جوتے سے مسلنے لگا۔ اس کے بعد وہ دروازے اور کھڑکیوں کے پاس جا کر ان کی مضبوطی کو آزمانے لگا۔ پھر وہ دیواروں پر ہاتھ مار مار کر چار دیواری کے چکر لگانے لگا۔ جس طرف پلنگ بچھا ہوا تھا اس کی پچھلی دیوار کے ایک طرف ایک اونچے سے لکڑی کے اسٹینڈ پر پھولوں سے بھرا ہوا گلدان رکھا تھا۔ دیوار اور پلنگ کے درمیان سے گزرنے کے لئے اس نے فلاور اسٹینڈ کو ایک طرف ہٹایا تو اچانک ہی ہلکی سی سرسراہٹ سنائی دی۔ پلنگ کے پیچھے کی دیوار آہستہ آہستہ سرک رہی تھی۔ وہ چند لمحوں تک دم بخود کھڑا رہا اور دیوار کے اس پار اندھیرے میں دیکھتا رہا جہاں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کچھ نظر نہ آنے کے باوجود اس کے خیالات اسے دور تک پہنچا رہے تھے۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ گئی تھی کہ اسے کمرے سے باہر نکلنے کے لئے کیوں منع کیا گیا تھا؟

دونوں ہی دادی پوتی نے اسے کمرے میں رہنے کے لئے کہا تھا۔ مگر دونوں کے مشوروں میں ذرا فرق تھا۔ سونیا نے اس سے کہا تھا کہ وہ صرف تین بجے تک وہاں رہے۔ تین بجے کے بعد اس نے اسے اپنے پاس بلایا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ تین بجے تک اس کا محبوب جاگتا رہے گا اور جب جاگتا رہے گا تو ہر خطرے سے نمٹنے کے لئے تیار بھی رہے گا۔ اس کمرے میں کوئی خطرہ کس چور دروازے سے آئے گا شاید وہ بھی نہیں جانتی تھی۔ اگر اسے چور دروازے کا علم ہوتا تو یہ بھی بتا دیتی۔ اس کا یہی احسان کیا کم تھا کہ اس نے تین بجے تک جاگ کر دوسرے لفظوں میں محتاط رہنے کا مشورہ دیا تھا۔

"اور وہ بڑھیا........." سجاد دانت پیستے ہوئے سوچنے لگا۔ "اسی بڑھیا نے میرے لئے اس کمرے کا انتخاب کیا ہے کیونکہ وہ روپ بدلنے کے بعد اسی چور دروازے سے آنا چاہتی تھی۔ اس چور دروازے کا یہ تاریک راستہ کہاں تک گیا ہے اور وہ کہاں سے روپ بدل کر آئے گی؟ میں اسی جگہ اس کا خاتمہ کر سکتا ہوں۔"

یہ سوچ کر اس نے ہولسٹر سے ریوالور نکال لیا۔ تپائی کے پاس آ کر اس نے سگریٹ کیس اور لائیٹر کو جیب میں رکھا۔ بائیں ہاتھ سے شمعدان کو اٹھایا اور دائیں ہاتھ سے ریوالور تھام کر چور دروازے پر پہنچ گیا۔ آگے جو چور راستہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا وہ ذرا دور تک روشن ہو گیا۔ اس کے آگے بدستور تاریکی تھی اور تنگ راہداری کے دونوں طرف سیاہ پتھریلی دیواریں تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ آگے آگے راستہ روشن ہوتا جا رہا تھا اور پیچھے پیچھے تاریکی اپنے سیاہ دانت نکالے اس کا تعاقب کر رہی تھی۔ چلتے وقت اس نے محسوس کیا کہ وہ راہداری نشیب کی طرف جا رہی ہے۔ شاید وہ حویلی کے تہہ خانے میں اتر رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کا اندازہ درست نکلا۔ شمع کی روشنی نے اسے راستہ دکھاتے دکھاتے ایک بڑے سے دروازے تک پہنچا دیا۔ دروازے کے پٹ لگے ہوئے تھے لیکن دوسری طرف سے بند نہیں تھے اور صاف پتہ چل رہا تھا کہ دروازے کے دوسری طرف اندھیرا نہیں ہے۔ وہاں بھی شمعیں روشن ہیں۔ اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی شمع بجھا دی۔ پھر اس شمعدان کو دروازے کے ایک طرف فرش پر چپکے سے رکھ دیا۔ اس کے بعد دروازے سے کان لگا کر سننے لگا۔ اندر سے باتیں کرنے کی بہت دھیمی دھیمی سی آوازیں آ رہی تھیں۔ کبھی ایک مردانہ بھاری بھرکم سی آواز سنائی دیتی تھی اور کبھی زنانہ آواز کی سرگوشیاں بھی دروازے سے آ کر ٹکراتی تھیں۔ وہ کیا باتیں کر رہے تھے' یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیونکہ الفاظ واضح نہیں تھے۔ مگر اس نے زنانہ آواز کو پہچان لیا۔ وہ بڑھیا کی آواز تھی۔

اس آواز کو پہچانتے ہی وہ غصے سے دانت پیسنے لگا۔ ریوالور اس کی مضبوط گرفت میں تھا۔ اب اس نے انگلی ٹرائیگر پر رکھ دی اور دوسرے ہاتھ سے دروازے کو بڑی آہستگی سے کھولنے لگا مگر دروازہ بہت مضبوط اور بھاری تھا۔ ہاتھ کا دباؤ پڑتے ہی وہ صرف ذرا سا کھلا لیکن کھلنے کی آواز رات کے سناٹے میں گونج گئی۔ وہ سمجھ گیا کہ اس آواز سے بڑھیا محتاط ہو گئی ہو گی۔ اس خیال سے اس نے دروازے پر ایک زور کی لات ماری۔ دروازہ ایک دھڑاکے سے کھل گیا۔ اسی وقت وہ بڑھیا بھاگتی ہوئی دوسرے دروازے سے باہر نکل

گئی۔ دروازے سے باہر نکلتے ہی دروازہ آپ ہی آپ بند ہو گیا اور اس دروازے کے سامنے ایک قد آور نوجوان تن کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کے کھڑے ہونے کا انداز سجاد کو للکار رہا تھا کہ اسے بڑھیا کا تعاقب کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

سجاد نے اسے ریوالور کی زد پر رکھتے ہوئے پوچھا۔ "کون ہو تم؟"

اس نوجوان نے اپنے دونوں ہاتھ کمر پر رکھتے ہوئے کہا۔ "میں وہی قاتل ہوں جسے تم گرفتار کرنے آئے ہو۔"

"اچھا تو تمہارا ہی نام گوپی ہے؟"

"ہاں میرا ہی نام گوپی ہے۔ یہ ریوالور جیب میں رکھ لو کیونکہ میری حفاظت ایک ایسی نادیدہ قوت کر رہی ہے کہ اس کے سامنے تمہارا یہ ریوالور کسی کام نہ آئے گا۔"

سجاد نے سخت لہجے میں کہا۔ "میں کسی نادیدہ قوت کو تسلیم نہیں کرتا۔ تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ تم خود کو چپ چاپ قانون کے حوالے کر دو۔ ورنہ میں تمہاری لاش کو یہاں سے گھسیٹتے ہوئے لے جاؤں گا۔"

اس کی بات سن کر گوپی قہقہہ لگانے لگا۔ سجاد نے گرجتے ہوئے کہا۔

"میں تین تک گنتا ہوں۔ گنتی ختم ہوتے ہی میں تمہاری ٹانگوں پر گولی چلا دوں گا۔ پھر تم بھاگنے کے قابل نہیں رہو گے۔ ایک .... دو .... تین.........."

اس نے گولی چلا دی مگر اس کا نشانہ بہک گیا۔ کیونکہ اچانک ہی اس کے ریوالور والے ہاتھ کی کلائی استخوانی ہاتھ کے پنجے میں آ گئی تھی۔ اگر کوئی مقابلے پر آ کر اس کی کلائی پکڑتا تو وہ یقیناً اس پر جوابی حملہ کرتا۔ مگر جس استخوانی ہاتھ کو وہ محض قصے کہانی کی بات سمجھ رہا تھا' سچ مچ خود کو اس ہاتھ کی گرفت میں دیکھتے ہی اس کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ گیا۔ اس استخوانی ہاتھ نے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ صرف اس ریوالور کو فرش پر سے اٹھا کر ایک طرف ہٹ گیا۔ سجاد بوکھلا کر اس ہاتھ کو دیکھ رہا تھا لیکن اس میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ آگے بڑھ کر اس ریوالور کو چھین لیتا۔ اسی وقت گوپی نے اس پر چھلانگ لگائی اور اسے رگیدتا ہوا اور اس پر گھونسے برساتا ہوا ایک طرف لے گیا۔ تھوڑی دیر تک سجاد کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ متواتر گھونسے کھانے کے بعد ہوش آیا کہ اس کے مقابلے پر اس کی طرح ایک زندہ انسان ہے پھر تو گوپی کی شامت آ گئی۔ جب اس کے منہ پر اور ناک پر گھونسے پڑنے لگے تو وہ بار بار گھبرا کر استخوانی ہاتھوں کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ ان سے مدد کی توقع کر رہا تھا۔ وہ ہاتھ کچھ دیر تک خاموش رہے پھر

ایک ہاتھ نے آگے بڑھ کر سجاد کے منہ پر طمانچہ رسید کیا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے چلا گیا۔ گوپی کو شہ ملی تو وہ پھر اس پر حملے کرنے لگا۔ سجاد نے پہلے دو چار گھونسے کھاتے ہوئے استخوانی ہاتھ کی طرف دیکھا جو اپنی جگہ واپس چلا گیا تھا۔ جیسے ہی وہ دور ہوا' اس نے پھر گوپی کی پٹائی شروع کر دی۔

گوپی کی آنکھوں کے سامنے پھر تارے ناچنے لگے۔ اس کی ناک سے اور باچھوں سے خون رسنے لگا۔ وہ چکرا کر فرش پر گرنے والا تھا اور سجاد اسے ٹھوکر مارنے کے لئے آگے بڑھ رہا تھا کہ اسی وقت استخوانی ہاتھ نے ریوالور کے دستے سے اس کے سر پر ایک زوردار ضرب لگائی۔ سجاد کے حلق سے ایک کراہ نکلی۔ پھر وہ دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام کر فرش پر گر پڑا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا اور وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے آخری بار آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے دشمن کو دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ ایسی حالت میں بھی دشمن کے مقابلے پر کمزور نہیں رہنا چاہتا تھا لیکن اس کی قوتِ برداشت جواب دے گئی اور وہ بے ہوش ہو گیا۔

☆======☆======☆

جب اسے ہوش آیا تو اس کے دماغ میں کھٹ کھٹ کی آواز گونج رہی تھی۔ اس نے سر کو جھٹک کر اس آواز کو سمجھنے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ کوئی دروازے کو پیٹ رہا ہے۔ اس نے فوراً ہی آنکھیں کھول دیں۔

وہ اسی کمرے میں تھا جہاں اس نے چور دروازہ دریافت کیا تھا۔ اس وقت وہ بستر پر پڑا ہوا تھا۔ وہ بستر سے اٹھنے لگا تو سر کے پچھلے حصے سے ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ دروازے کو اب تک کوئی پیٹ رہا تھا۔ اس نے دروازے کی جانب دیکھا۔ اسے کھولنے کا خیال آیا تو سب سے پہلے ریوالور کا بھی خیال آیا۔ پھر یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ریوالور اس کے ہولسٹر میں موجود تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے ساتھ کیسی دشمنی کی گئی ہے۔ وہ استخوانی ہاتھ اس کی جان بھی لے سکتا تھا لیکن اس ہاتھ نے اس کی جان لینے کے بجائے اس کا ریوالور واپس کر دیا تھا اور اسے بھی اس کے کمرے میں واپس پہنچا دیا تھا۔

اس نے ریوالور نکال کر اسے چیک کیا۔ اس میں پانچ گولیاں موجود تھیں۔ ایک گولی وہ تہہ خانے میں چلا چکا تھا۔ اس بار اس نے بڑے عزم سے سوچا کہ اب وہ استخوانی ہاتھ اسے خوفزدہ نہیں کر سکے گا۔ اب اگر اس نے کلائی پکڑی تو وہ بھی اس کی کلائی پکڑ کر مروڑے گا۔ مردہ ہاتھ زندہ انسان کے حوصلوں سے زیادہ مستحکم نہیں ہوتے۔ ابھی وہ دروازہ کھول کر باہر جائے گا اور سب سے پہلے اس بڑھیا کا گلا دبوچ لے گا۔

اس نے ریوالور کو مضبوطی سے تھام لیا۔ پھر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا۔ ”کون ہے؟“

اس کے جواب میں ”اُوں اُوں“ کی آواز سنائی دی۔ اس نے آواز کی نزاکت سے اندازہ لگایا کہ دروازے کے دوسری طرف سونیا ہے۔ اس کی ”اُوں اُوں“ سے پتہ چل رہا تھا کہ کسی نے اس کے منہ کو دبا رکھا ہے۔ شاید وہ اتنی دیر سے سجاد کو مدد کے لئے پکار رہی تھی۔ وہ دوڑتا ہوا دروازے کے پاس آیا۔ پھر فوراً ہی اس کی کنڈی گرا کر اسے

کھول دیا۔ اس کی انگلی ریوالور کے ٹرائیگر پر تیار تھی۔ خطرہ پیش آتے ہی وہ گولی چلا سکتا تھا۔

مگر کوئی خطرہ نہیں تھا کھلے ہوئے دروازے کے سامنے سونیا تنہا کھڑی تھی۔ اس کے دونوں مفلوج ہاتھ بدن کے اطراف جھول رہے تھے اور وہ دودھ سے بھرا ہوا جگ دانتوں سے پکڑے ہوئے تھی اور شاید پاؤں کی ٹھوکر سے دروازے پر دستک دے رہی تھی۔ سجاد نے دودھ سے بھرا ہوا جگ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ تب وہ پریشان ہو کر بولی۔

”صبح ہو چکی ہے۔ میں تین بجے سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ جب تم وعدے کے مطابق نہیں آئے تو میں پریشان ہو گئی۔ پہلے میں دادی اماں کے کمرے کی طرف گئی۔ ان کا کمرہ اندر سے بند ہے۔ مجھے اطمینان ہو گیا کہ وہ سو رہی ہیں۔ پھر میں کچن میں جا کر تمہارے لئے یہ دودھ لے کر آ رہی ہوں۔“

سجاد نے بہت سی محبوبانہ اداؤں کے متعلق سنا تھا اور پڑھا تھا لیکن دانتوں سے دودھ کا جگ پکڑ کر لانے والی محبوبانہ ادا پہلی بار دیکھی تھی۔ وہ اس کے ساتھ باتیں کرتا ہوا کمرے کے اندر آیا۔ سونیا پلنگ کے سرے پر بیٹھ کر اس واقعہ کو سن رہی تھی جو سجاد پر گزر چکا تھا۔ اس کے دونوں مفلوج ہاتھ اس کے زانوؤں پر رکھے ہوئے تھے اور وہ ایسی سہمی ہوئی نظروں سے سجاد کو دیکھ رہی تھی، جیسے وہ حادثہ سجاد کو نہیں بلکہ خود اس کو پیش آیا ہو۔ سجاد نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھیں بھیگ رہی ہیں۔ وہ انتظار کرتا رہا کہ اس کی آنکھ سے آنسو ٹپکے تو آگے بڑھ کر ان لرزتے ہوئے موتیوں کو اپنے رومال میں جذب کر لے۔ اس طرح اسے چھونے کا بہانہ مل جاتا۔ جب سے وہ یہاں آیا تھا اسے کسی بہانے سونیا کو چھونے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ پھول کی نازک پتی کو یا ریشم کی چکناہٹ کو بے اختیار ہاتھ بڑھا کر چھونے کے لئے دل مچلتا ہے لیکن سونیا کی شخصیت میں کچھ عجیب سی بات تھی۔ اس کا سانس لیتا ہوا بدن اسے پکارتا ضرور تھا مگر اس کے چہرے پر اتنی معصومیت تھی کہ کسی عہد و پیمان کے بغیر یا اس کی رضامندی کے بغیر اسے چھونے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔

اس کی آنکھیں صرف بھیگی ہوئی نظر آئیں۔ سجاد کی خواہش پوری کرنے کے لئے آنکھوں سے ایک قطرہ بھی باہر نہ آیا۔ وہ آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آواز میں بولی۔

”میں کتنی مجبور اور بے بس ہوں۔ تمہارے سر پر چوٹ آئی ہے اور میں اپنے ہاتھوں سے مرہم پٹی بھی نہیں کر سکتی۔“

سجاد نے مسکرا کر کہا۔ ”ہم پولیس والے آئے دن ایسے زخم کھاتے ہیں۔ آج پہلی بار تمہارے جیسی حسین لڑکی نے میرے زخم پر مرہم رکھنے کی بات کی ہے۔ یہ واقعی افسوس کی بات ہے کہ تم ہاتھ بڑھا کر مجھے چھو نہیں سکتیں لیکن میری خواہش ہے کہ میں آگے بڑھ کر تمہیں چھو لوں۔ تمہیں اپنے سینے سے لگا کر اپنے دل کی دھڑکنوں کو سکون پہنچاؤں۔“

یہ باتیں سن کر وہ شرم سے سمٹنے لگی۔ پھر آہستگی سے التجا آمیز لہجے میں بولی۔ ”سجاد صاحب! آپ ایسی باتیں نہ کریں۔ یہاں اب تک کتنے ہی نوجوان مسافر آ چکے ہیں لیکن میں نے کسی کو اتنا موقع نہیں دیا کہ وہ مجھے ہاتھ لگا سکے۔ میں نے اپنے آپ کو صرف اسی ہستی کے لئے سنبھال کر رکھا ہے جو میرا شوہر ہو گا اور میرے جسم و جان کا مالک ہو گا۔“

سجاد نے کہا۔ ”تمہارے یہ پاکیزہ خیالات سن کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ میں نے بھی ایک ایسی ہی شریف زادی کے انتظار میں اب تک شادی نہیں کی ہے۔ کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟“

اس کے لبوں پر شرمیلی سی مسکراہٹ آ گئی۔ وہ سر جھکا کر آہستگی سے بولی۔ ”میں برسوں سے یہ خواب دیکھتی آ رہی ہوں مگر اب تک اس خواب کی تعبیر نہیں ملی۔“

”تم یقین کرو۔ میں تمہارے خواب کی تعبیر بن کر آیا ہوں۔ میں تمہیں یہاں سے اپنی دلہن بنا کر لے جاؤں گا۔“

”جب تک دادی اماں زندہ ہیں یہ ممکن نہیں ہے۔“

سجاد نے طیش میں آ کر کہا۔ ”میں اس کا گلا گھونٹ دوں گا۔“

”وہ تمہارے ہاتھ نہیں آئیں گی۔“

”کیسے ہاتھ نہیں آئیں گی۔ ابھی وہ اپنے کمرے میں سو رہی ہیں۔ کیا میں وہاں پہنچ کر ان کا کام تمام نہیں کر سکتا؟“

”نہیں اس کمرے کے کھڑکیاں اور دروازے بہت مضبوط ہیں۔ تم انہیں توڑنے کی کوشش کرو گے تو وہ نیند سے بیدار ہو جائیں گی۔“

”پھر تم بتاؤ کہ ہم کس طرح اسے راستے سے ہٹا سکتے ہیں؟“

سونیا نے کہا۔ ”تم ان سے نفرت کرنے کی بجائے محبت سے پیش آ کر اسے ختم کر سکتے ہو۔ جب وہ سو کر اٹھے تو تم اس سے ہنس بول کر باتیں کرو اور اس سے درخواست کرو کہ تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ سجاد نے پوچھا۔ ”اس نے میرے سامنے تمہیں چڑیل کہا ہے۔ پھر وہ کس طرح مجھے تم سے شادی کرنے کی اجازت دے گی؟“

”تم ان کی چالبازیوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ یہاں جو بھی مسافر رات گزارنے کے لئے آتا ہے' وہ اس کے سامنے مجھے چڑیل کہتی ہیں۔ تم سے بھی یہی کہا۔ کیا تم نے یقین کر لیا؟“

”نہیں' تمہیں دیکھ کر کوئی ان کی بات پر یقین نہیں کر سکتا۔ البتہ ایک ہلکا سا تجسس پیدا ہوتا ہے کہ ایک دادی اپنی پوتی کے متعلق ایسی باتیں کیوں کرتی ہے؟“

”دراصل وہ اسی الجھن میں لوگوں کو مبتلا کر کے رکھتی ہے۔ ایک تو وہ خود چڑیل نظر آتی ہے۔ لوگ اس کے متعلق بھی سوچتے ہیں اور میرے بارے میں بھی الجھن میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ میری خوبصورتی کو چارہ بنا کر پیش کرتی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ نوجوان ضدی اور جذباتی ہوتے ہیں۔ مجھ جیسے حسین مجسمے کو حاصل کرنے کے لئے وہ ایک دو راتیں یہاں گزاریں گے اور اس کی خوراک بن جائیں گے۔“

سجاد نے کہا۔ ”پھر تو وہ میرے لئے بھی یہی چاہے گی کہ میں ایک دو راتیں یہاں گزاروں۔ اس کے لئے وہ تم سے شادی کرانے کا جھوٹا وعدہ بھی کر سکتی ہے۔“

”نہیں۔ جب شادی کی بات آئے گی تو وہ تم سے فریب نہیں کرے گی اور نہ ہی تمہیں نقصان پہنچائے گی کیونکہ کوئی ڈائن اپنے داماد کو نہیں کھاتی۔“

سجاد اس کی بات پر غور کرنے لگا۔ پھر اس نے پوچھا۔ ”اگر ایسی بات ہے تو مجھ سے پہلے بھی یہاں ٹھہرنے والے نوجوان مسافروں نے بڑھیا کے سامنے تم سے شادی کی درخواست کی ہو گی۔ پھر اس نے انہیں داماد کیوں نہیں بنایا؟“

سونیا نے جواب دیا۔ ”میں خود شادی سے انکار کرتی رہی ہوں اور تمہاری شریک حیات بننے سے پہلے بھی میں ایک شرط پیش کروں گی۔“

”وہ کیا شرط ہے؟“

وہ چند لمحوں تک ذرا شرماتی رہی پھر ہچکچاتی ہوئی بولی۔ ”شادی کے بعد میں کسی بچے کی ماں نہیں بنوں گی۔“

”یعنی ہم شادی کی پہلی ہی رات سے خاندانی منصوبہ بندی پر عمل کریں گے؟“

”ہاں' میں یہی چاہتی ہوں۔“

”آخر کیوں؟ اس کی کوئی خاص وجہ؟“

"ہاں' دادی اماں مجھے تنہائی میں کہہ چکی ہیں کہ میرے بطن سے جو پہلی لڑکی ہو گی' میں اس لڑکی کو ان کے حوالے کر دوں۔"

سجاد نے پوچھا۔ "کیا وہ میری بیٹی سے دشمنی کرے گی؟؟"

"یہ بات نہیں ہے۔ وہ میری طرح میری بیٹی کی بھی بڑی محبت سے پرورش کریں گی۔ وہ سمجھتی ہیں کہ میری طرح میری بیٹی بھی بے حد حسین ہو گی۔ پھر وہ مسافروں کو پھانسنے کے لئے میری بیٹی کے حسن و شباب کو چارہ بنائیں گی۔ اسی لئے میں چاہتی ہوں کہ شادی کے بعد ہماری کوئی اولاد نہ ہو۔"

"ایسا کب تک ہو گا۔ کیا ہم تمام عمر بے اولاد رہیں گے؟؟"

"مجبوری ہے۔ دادی اماں کو بڑی آسانی سے اور سہولت سے ختم کرنے کے لئے ہمیں یہی کرنا ہو گا۔ وہ باہر سے کسی لڑکی کو اٹھا کر اپنا آلۂ کار بنانے کے لئے یہاں نہیں لائیں گی۔ انہیں صرف اپنے خون پر اعتماد ہے۔ ان کا یہ اعتماد درست ہے۔ کیونکہ میں خونی رشتے کے تحت اب تک خاموش رہی۔ یہاں کتنے ہی نوجوان آئے اور مجھ پر دل و جان سے عاشق ہوتے رہے لیکن میں نے صرف تمہارے سامنے دادی اماں کی اصلیت بیان کی ہے۔ اگر تمہیں اولاد کی خواہش ہے تو میرا خیال چھوڑ دو اور یہاں سے چلے جاؤ اور یہ خیال دل سے نکال دو کہ تم کسی بھی طرح دادی اماں کو نقصان پہنچا سکو گے یا انہیں قانونی گرفت میں لے آؤ گے۔ تمہیں ان کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ملے گا۔"

سجاد سوچنے لگا۔ سوچنے اور غور کرنے کے لئے بہت سی باتیں تھیں۔ وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ اس بوڑھی چڑیل کو قانونی گرفت میں لانے کے لئے کوئی ثبوت حاصل نہیں کر سکے گا۔ فی الحال یہی دانشمندی نظر آ رہی تھی کہ وہ سونیا کو اس ڈائن کے پنجے سے نکال کر اپنے ساتھ لے جائے' اس سے شادی کر لے اور اس بڑھیا کو حسین آلۂ کار سے محروم کر دے۔ وہ اسی انتظار میں اپنا بڑھاپا گزار دے گی کہ سونیا کی لڑکی ہو گی تو اسے مزید شکار کھیلنے کے لئے ایک حسین آلۂ کار مل جائے گی۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"سونیا! میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ صرف تمہیں حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ میں اولاد کی خواہش نہیں کروں گا اور تمہیں اس ویران حویلی سے دلہن بنا کر لے جاؤں گا۔ مگر تمہیں دلہن بنانے سے پہلے کچھ اور معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

"میں جو کچھ جانتی ہوں تمہیں ضرور بتاؤں گی۔ تم کیا پوچھنا چاہتے ہو؟؟"

سجاد نے کہا۔ "شادی کرنے سے پہلے ایک دوسرے کے خاندانی حالات سے واقف ہونا بہت ضروری ہے۔ میں اپنے دوستوں اور عزیزوں کو کیا بتاؤں گا کہ میری دلہن کس خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔"

سونیا نے جواب دیا۔ "میں وہی بتا سکتی ہوں جو دادی اماں نے مجھے بتایا ہے۔ مگر وہ بہت سی باتیں غلط کہتی ہیں۔ ایک بار میں ان کی عدم موجودگی میں اپنے دادا جان کی لائبریری میں گئی تھی۔ وہاں میں نے دادا جان کی ڈائری کھول کر پڑھی۔ تم اُسے پڑھو گے تو بہت سی باتیں تمہارے علم میں آئیں گی۔"

سجاد نے پوچھا۔ "وہ ڈائری کہاں ہے؟؟"

سونیا اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ پھر دروازے کی طرف جاتے ہوئے بولی۔ "میرے ساتھ آؤ' میں تمہیں اس لائبریری میں لے چلتی ہوں۔"

وہ اس کے ساتھ کمرے سے باہر آ گیا۔ باہر دوسرے کمروں میں دن کا اجالا پھیلا ہوا تھا۔ مگر وہاں رات سے زیادہ سناٹا اور خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ وہ دونوں حویلی کے مختلف کمروں اور راہداریوں سے گزرتے ہوئے ایک کمرے کے دروازے کے سامنے پہنچ گئے۔ سونیا نے اسے دروازہ کھولنے کے لئے کہا۔ اس نے دروازہ کھولا تو اندر ایک بہت بڑا کمرہ نظر آیا۔ کتابوں کی بہت سی اونچی اونچی الماریاں چاروں طرف دیواروں سے لگی کھڑی تھیں۔ مطالعے کے لئے کمرے کے وسط میں ایک بڑی سی میز اور چند کرسیاں نظر آ رہی تھیں۔ کمرے کی ہر چیز گرد آلود تھی۔ مکڑیوں نے جا بجا جالے بن رکھے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ برسوں سے کسی نے اس کمرے میں قدم نہیں رکھا تھا۔ سونیا اندر پہنچ کر ایک الماری کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ پھر اس نے سجاد سے کہا۔

"اس الماری کو کھولو۔ اس کے دوسرے شیلف میں ایک سیاہ جلد والی ڈائری ہے' اسے نکال لو۔"

سجاد نے الماری کھول کر مختلف کتابوں کو ٹٹولنے کے بعد وہ سیاہ جلد والی ڈائری نکال لی۔ سونیا نے کہا۔

"یہ مطالعے کے لئے بہترین جگہ ہے۔ مگر میں اس قابل نہیں ہوں کہ اس کی صفائی کر سکوں۔ تم اپنے کمرے میں چل کر اسے پڑھو۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

وہ دونوں لائبریری سے باہر آئے۔ سونیا اپنے کمرے کی طرف چلی گئی اور وہ اپنے کمرے میں آ کر ایک ایزی چیئر پر بیٹھ گیا۔ پہلے اُس نے جگ اٹھا کر دودھ پیا پھر ایک

سگریٹ سلگا کر ڈائری کی ورق گردانی کرنا شروع کر دی۔

ڈائری پر نواب وجاہت علی کا نام لکھا ہوا تھا۔ اس کے اوراق بتا رہے تھے کہ ان دنوں انگریزوں کی حکومت تھی وجاہت علی نے جنگ آزادی کے وقت انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔ اس لئے فرنگی آقاؤں نے خوش ہو کر دریائے سیتا لکھا کے کنارے ایک بہت بڑی جاگیر انعام کے طور پر دی تھی۔ یہ موجودہ حویلی اسی وقت تعمیر کی گئی تھی۔ اس وقت سے وہ اپنے علاقے میں نواب وجاہت علی کے نام سے مشہور ہو گئے تھے۔ حویلی تعمیر کرنے کے بعد وہ ایک بہت ہی خوبصورت سی دلہن بیاہ کر لے آئے۔ اس حسین دلہن کا نام سادھنا تھا۔ وہ ایک غریب کسان کی لڑکی تھی۔ شادی سے پہلے اس نے سادھنا کو مسلمان بنا لیا تھا لیکن وہ نام اس کے حسن و جمال کے ساتھ ایسا چپکا تھا کہ انہوں نے مذہب تبدیل کرانے کے باوجود نام نہیں تبدیل کیا۔ سادھنا کے حسن و جمال کا چرچا دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ وہ اُسے پردوں میں چھپا کر رکھتے تھے کہ کہیں انگریز آقا اس پر عاشق نہ ہو جائیں۔ وہ اسے حویلی کی چاردیواری میں قید کر کے اس کے ساتھ جوانی کے دن اور رات گزارتے تھے۔ دو سال بعد سادھنا نے اُن کے لئے ایک چاند سے بیٹے کو جنم دیا۔ ایک بچے کو جنم دینے کے بعد بھی اس کے شباب کی چاردیواری میں ہلکی سی خراش نہیں آئی تھی۔ بلکہ وہ پہلے سے زیادہ نکھر گئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ابھی کلی سے پھول بنی ہو۔ اس کا حسن' اس کی ادائیں اور اس کی چال میں ایسا بانکپن تھا کہ اسے دیکھ دیکھ کر نواب صاحب کا دل دہلتا تھا۔ بے انتہا دولت اور بے پناہ حسین عورت کی حفاظت کرنا کتنا مشکل کام ہوتا ہے' یہ نواب وجاہت علی ہی جانتے تھے۔ وہ اکثر راتوں کو اس طرح چونک کر اٹھ جاتے تھے جیسے کوئی حسن و شباب کے اس خزانے کو ان کے پہلو سے چرا کر لے جا رہا ہو۔

ایک رات وہ چونک کر اٹھے تو پتہ چلا کہ اس خزانے کو کوئی لوٹ کر لے گیا ہے۔ وہ ہڑبڑا کر بستر سے اٹھ گئے۔ انہوں نے جلدی سے نائٹ گاؤن پہنا۔ پھر باہر آ کر سادھنا کو تلاش کرنے لگے۔ اسے تلاش کرتے ہوئے جب وہ ایک کمرے کے قریب سے گزرے تو انہیں سادھنا کی آواز سنائی دی۔ وہ کھڑکی سے جھانک کر دیکھنے لگے۔ کمرے میں ایک موی شمع روشن تھی۔ اس کی زرد روشنی میں انہوں نے اپنی حسین بیوی کو ایک نوجوان ملازم کی آغوش میں دیکھا۔ ملازم اسے چومتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"تم روزانہ ایک خواب آور گولی دودھ میں ملا کر نواب صاحب کو پلاتی ہو۔ گولی کی تعداد بڑھانی چاہئے کیونکہ ایک ہی گولی رفتہ رفتہ بے اثر ہو جاتی ہے۔ نواب صاحب اس

کے عادی ہو جائیں گے تو پھر گہری نیند نہیں سو سکیں گے۔"

انہیں سادھنا کا جواب سنائی دیا۔

"اچھی بات ہے۔ کل سے میں دو گولیاں دودھ میں ملا کر دیا کروں گی۔"

نواب صاحب اس سے آگے اور کچھ نہ سن سکے۔ وہ پلٹ کر اپنے کمرے میں گئے اور وہاں سے دو نالی بندوق لوڈ کر کے لے آئے۔ نواب صاحب کو دیکھتے ہی وہ دونوں سہم کر ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ انہوں نے ان سے کوئی سوال نہیں کیا۔ بڑی خاموشی سے ملازم کو نشانے پر رکھ کر گولی چلا دی۔ وہ فرش پر گر کر تڑپنے لگا۔ وہ سادھنا کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے اسے تہہ خانے میں لے گئے۔ وہاں انہوں نے اسے ایک کرسی پر بٹھا کر رسیوں سے باندھتے ہوئے کہا۔

"بے وفا عورت! تجھے اپنے حسن اور جوانی پر بڑا ناز ہے۔ میں اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ تیرے یہ حسین بازو صرف میری گردن کا ہار بننے کے لئے ہیں۔ میں تجھے جان سے نہیں ماروں گا۔ مگر تیرے ان بازوؤں کو اس قابل نہیں چھوڑوں گا کہ وہ آئندہ کسی کے گلے کا ہار بن سکیں۔"

یہ کہہ کر وہ لکڑی کے ایک صندوق کے پاس گئے اور اسے کھول کر انہوں نے تیزاب کی ایک بوتل نکالی۔ پھر اس کے قریب آ کر اس کے ایک ہاتھ کو کہنی سے پکڑا اور اس پر تیزاب کے قطرے ٹپکانے لگے۔ سادھنا تکلیف کی شدت سے چیخنے لگی۔ مگر وہ رسیوں سے بندھی ہوئی تھی۔ اس کا ہاتھ نواب صاحب کی مضبوط گرفت میں تھا اور تیزاب کے قطرے اس کے حسین ہاتھ کے گوشت کو گلا رہے تھے۔ انہوں نے اس کے دوسرے ہاتھ کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا۔ اس دوران وہ تکلیف کی شدت سے بے ہوش ہو گئی تھی۔

انہوں نے تیزاب کی بوتل واپس صندوق میں رکھ دی اور اسے تہہ خانے میں چھوڑ کر تنہا اپنے کمرے میں واپس آ گئے۔ اپنے بستر پر لیٹ کر وہ بہت دیر تک غصے میں پیچ و تاب کھاتے رہے۔ اپنے رقیب کو ہلاک کر کے اور اپنی بیوی کو اذیت ناک سزا دے کر بھی انہیں قرار نہیں آ رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ سادھنا کی بوٹی بوٹی نوچ لیں لیکن انتقام کی آگ اسی وقت بجھتی' جب وہ زندہ رہتی اور اپنے بدصورت ہاتھوں کو دیکھ دیکھ کر کڑھتی رہتی۔ انہوں نے کروٹیں بدل بدل کر صبح کر دی۔ بار بار ان کی نگاہوں کے سامنے سادھنا کا چہرہ آ کر انہیں پکارتا تھا۔ وہ اپنی خواب گاہ سے نکل کر پھر تہہ خانے میں آئے۔ سادھنا اسی

طرح رسی سے بندھی پڑی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ کرسی کے اطراف سے لٹکے ہوئے تھے۔ کہنیوں سے انگلیوں تک دونوں ہاتھوں کا گوشت گل چکا تھا۔ صرف ہڈیاں نظر آ رہی تھیں۔ کتنی عجیب سی لگ رہی تھی وہ' دو استخوانی ہاتھ تھے' باقی جسم گوشت پوست کا تھا۔ وہ ایزی چیئر پر بے حس و حرکت نظر آ رہی تھی۔ نواب صاحب نے آگے بڑھ کر غصے سے اس کے منہ پر طمانچہ مارا۔ مگر وہ طمانچہ بے اثر تھا۔ کیونکہ وہ مر چکی تھی۔

وہ تھوڑی دیر تک اسے غصے سے دیکھتے رہے۔ وہ جس انداز میں انتقام لینا چاہتے تھے اُن کی وہ خواہش پوری نہیں ہوئی تھی۔ اب اس پر کوئی ظلم کرنا بھی فضول تھا۔ وہ اس دنیا کے ہر درد و غم سے نجات پا چکی تھی۔ وہ غصے سے کرسی کو ٹھوکر مار کر واپس چلے آئے۔

سجاد ڈائری کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ ورق کے ساتھ ساتھ وقت بھی کروٹیں بدل رہا تھا۔ نواب وجاہت علی کا بیٹا جو سادھنا کے بطن سے ہوا تھا' وہ جوان ہو چکا تھا۔ اس کی شادی ہو چکی تھی۔ نواب وجاہت علی کی بہو نے ایک خوبصورت سی بیٹی کو جنم دیا تھا۔ ان کی ننھی سی پوتی کا حسن ہر اعتبار سے مکمل تھا مگر اس کے دونوں ہاتھ کہنیوں سے انگلیوں تک مفلوج تھے۔

اپنی پوتی کے ان ہاتھوں کو دیکھتے ہی نواب وجاہت علی کو سادھنا کے ہاتھ یاد آ گئے۔ ان کی بہو نے اپنی بیٹی کے مفلوج ہاتھوں کو دیکھا تو صدمے سے رونے لگی اور تب اس نے روتے روتے بتایا کہ جب وہ حاملہ تھی تو اسے اکثر دو استخوانی ہاتھ نظر آتے تھے اور اسے کسی عورت کی آواز سنائی دیتی تھی' وہ کہتی تھی۔

"اگر تُو نے بیٹی کو جنم دیا تو اس کے دونوں ہاتھ مفلوج ہوں گے اور تیری بیٹی کو میں اپنے پاس رکھوں گی۔"

نواب صاحب نے جب بہو کی یہ بات سنی تو صدمے سے نڈھال ہو گئے۔ ان کے بیٹے شفاعت علی نے اپنی بیوی کو سمجھایا کہ یہ سب اس کا وہم ہے۔ اگر اسے دو استخوانی ہاتھ نظر آتے تھے تو وہ محض فریبِ نظر تھا۔ وہ دو خیالی ہاتھوں کو دیکھ کر شاید یہ سوچتی تھی کہ کہیں اس کے ہونے والے بچے کے ہاتھ بھی ایسے نہ ہو جائیں۔ حاملہ رہنے کے دوران عورت جو کچھ سوچتی ہے' اس کا اثر بچے پر پڑتا ہے۔

لیکن اس کی بیوی بضد تھی کہ وہ محض خیالی ہاتھ نہیں تھے اور وہ صاف طور سے کسی عورت کی آواز سنتی رہی ہے۔ وجاہت علی نے اپنے بیٹے کو اپنے کمرے میں بلا کر

کہا۔

"بہو جو کچھ کہتی ہے' اس میں کہاں تک صداقت ہے' میں یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن ایسا ہو سکتا ہے۔ میں نے آج تک تمہیں یہ بات نہیں بتائی تھی۔ مگر آج بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔ بہت عرصہ پہلے جب تم ایک ننھے سے بچے تھے' میں نے تمہاری امی کو اس کی ایک بہت بڑی غلطی کی ایک بہت بڑی سزا دی تھی۔ میں نے اس کے دونوں ہاتھوں کو مفلوج کر دیا تھا۔ میں سوچتا تھا کہ تمہیں یہ بات معلوم ہو گی تو تم مجھ سے نفرت کرنے لگو گے کیونکہ بچپن سے تمہارے دماغ میں اپنی ماں کی ایک مقدس تصویر نقش ہے لیکن میں تمہیں بتاؤں کہ عورت کا تقدس صرف ممتا کی حد تک قائم رہتا ہے ورنہ وہ دوسرے روپ میں مکّار اور دغاباز ہوتی ہے۔"

شفاعت علی نے نواب صاحب کو ناگواری سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "ابا جان! میں نے اپنی امی کو نہیں دیکھا لیکن جس نے مجھے جنم دیا ہے میں اس کے خلاف ایک لفظ بھی سننا گوارہ نہیں کرتا۔ میں کیسے سمجھ لوں کہ جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں' وہ درست ہے۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا کہ میری امی سے اتنی بڑی غلطی ہوئی ہو گی اور آپ اتنی بھیانک سزا دیں گے۔"

"بیٹے! کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو باپ بیٹے ایک دوسرے کے روبرو نہیں کر سکتے۔ تم میری یہ ڈائری لے جا کر پڑھو۔ تمہیں تمام حقیقت معلوم ہو جائے گی۔"

انہوں نے اپنی الماری سے ایک ڈائری نکال کر دی۔ وہی ڈائری اس وقت سجاد کے ہاتھوں میں تھی۔ جس وقت اس ڈائری کو نواب صاحب کا بیٹا شفاعت علی پڑھنے کے لئے لے گیا تھا' اس وقت تک اور اس صفحے تک نواب وجاہت علی کی تحریر تھی۔ اس کے بعد صفحہ بدل گیا تھا تحریر بھی بدل گئی تھی۔ ان کا بیٹا شفاعت علی اپنی تحریر میں واقعات پیش کر رہا تھا۔

اب ڈائری کے اوراق کہہ رہے تھے۔

"میں نے ابا جان کو تہہ خانے میں لے جا کر قتل کر دیا ہے۔ میں نے ڈائری میں لکھے ہوئے واقعات پڑھ لئے تھے۔ میں نے ابا جان سے کہا۔

"آپ میری امی کو بے حیا اور بدچلن کہتے ہیں۔ مگر آپ یہ بھول گئے کہ کوئی اولاد اپنی ماں کو آپ کی نظر سے نہیں دیکھ سکتی۔ اگر آپ نے اپنے طور پر انہیں سزا دی تھی تو اس سے بھیانک سزا آپ کو ملنی چاہئے کیونکہ آپ کی حرم سرا میں بھی بے شمار کنیزیں ہیں'

آپ کے گناہوں کا حساب کون کرے گا؟ صرف میں ہی اپنی ماں کا انتقام لے سکتا ہوں۔"

یہ کہہ کر میں نے خنجر سے ان پر حملہ کر دیا۔ انہوں نے بچنے کی انتہائی کوشش کی لیکن وہ بوڑھے تھے اور میں جوان تھا' وہ کمزور تھے اور میں شہ زور تھا۔ میں نے اپنی ماں کا انتقام لے لیا اور انہیں ہمیشہ کے لئے موت کی نیند سلا دیا۔

میری بیوی نے اُن کی موت کی خبر سنی تو اسے افسوس نہیں ہوا کیونکہ اب ہم دونوں بہت بڑی جاگیر کے مالک بن گئے تھے لیکن وہ اپنی بیٹی کے لئے بہت اداس تھی اور چاہتی تھی کہ کسی طرح اس کے مفلوج ہاتھ کام کے قابل ہو جائیں۔ مجھے بھی اپنی حسین بیٹی سے بڑی محبت تھی۔ میں اس کا علاج کرانے کے لئے روپیہ پانی کی طرح بہا سکتا تھا لیکن اس رات میں نے ایک بہت ہی حسین عورت کو دیکھا' وہ کہہ رہی تھی۔

"بیٹا! میں تمہاری ماں ہوں۔ تم نے میرا انتقام لے کر مجھے خوش کر دیا ہے۔ تم اپنی بیٹی کے علاج میں اپنی دولت ضائع نہ کرو۔ اس کے ہاتھ بالکل ہی مفلوج نہیں ہیں۔ اس بچی کے ہاتھوں کا تعلق مجھ سے ہے۔ میں نے ان ہاتھوں کو اپنے مقصد کے لئے حاصل کیا ہے۔ جب تک میں جاگتی رہتی ہوں' تمہاری بیٹی کے ہاتھ بیکار ہو جاتے ہیں۔ جب میں گہری نیند سو جاتی ہوں تو ان مفلوج ہاتھوں کو زندگی مل جاتی ہے۔ ابھی وہ دو دن کی بچی ہے۔ تم نے ان ہاتھوں کو غور سے نہیں دیکھا ہے۔ وہ کبھی کبھی حرکت کرتے ہیں۔"

یہ باتیں سنتے ہی میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس وقت میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں واقعی سو رہا تھا یا جاگ رہا تھا۔ جو کچھ میں نے دیکھا اور سنا' وہ خواب تھا یا حقیقت؟ بستر پر لیٹنے کے بعد بعض اوقات ہم خیالوں میں اس طرح ڈوب جاتے ہیں کہ اپنے گردوپیش کی خبر نہیں رہتی۔ ایسے وقت خواب کی سی کیفیت طاری رہتی ہے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے سچ مچ کوئی عورت میری خوابگاہ میں آئی تھی اور مجھ سے وہ سب باتیں کہہ کر چلی گئی لیکن میں یہ تسلیم نہیں کر سکتا تھا کہ وہ میری ماں تھی۔ وہ تو مر چکی تھیں اور اس عورت کی باتوں سے پتہ چلتا تھا کہ وہ زندہ ہے اور زندہ انسانوں کی طرح سوتی ہے اور جاگتی ہے اور جب جاگتی ہے تو میری بیٹی کے ہاتھ مفلوج رہتے ہیں اور جب وہ گہری نیند سوتی ہے تو وہی مفلوج ہاتھ حرکت کرنے لگتے ہیں۔

دوسرے پلنگ پر میری بیوی سو رہی تھی۔ اس کے پہلو میں ننھی سونیا لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں لیکن عام بچوں کی طرح اس کے ہاتھ حرکت نہیں کر رہے تھے' اس کے بدن کے اطراف بے حس پڑے ہوئے تھے۔

مجھے وہ بے تکا سا خواب معلوم ہوا۔ اکثر خواب بے تکے ہوتے ہیں۔ بیدار ہونے کے بعد سمجھ میں نہیں آتے۔ اس وقت میری سمجھ میں بھی کچھ نہیں آیا اور میں خواب میں نظر آنے والی عورت پر لعنت بھیج کر سو گیا۔ کچھ دنوں بعد میری بیوی نے مجھے بتایا کہ سونیا کے ہاتھ کبھی کبھی حرکت کرتے ہیں۔ اگر باقاعدہ توجہ سے اس کا علاج کرایا جائے تو یہ اپاہج نہیں رہے گی۔ اس کی باتیں سن کر مجھے پھر وہ حسین عورت یاد آ گئی۔ ایک بار خود میں نے اپنی آنکھوں سے ننھی سونیا کو ہاتھ ہلا ہلا کر کھیلتے ہوئے دیکھا۔ اس حسین عورت نے کہا تھا کہ اس کے علاج پر پیسے ضائع نہ کئے جائیں لیکن میں مسلسل توجہ سے اس کا علاج کرانے لگا۔ اس سلسلے میں' میں اسے ملک سے باہر لے گیا۔ بڑے بڑے ڈاکٹروں نے ان ہاتھوں کا معائنہ کیا اور ان کا علاج کرتے رہے لیکن یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ ہاتھ کبھی زندہ اور کبھی مردہ کیوں ہو جاتے ہیں۔ علاج کراتے کراتے سونیا چودہ برس کی ہو گئی۔ تب مجھے تسلیم کرنا پڑا کہ اس عورت نے صحیح مشورہ دیا تھا۔ سونیا کے ہاتھ تمام عمر یونہی رہیں گے۔ میری بیوی نے بھی مایوس ہونے کے بعد مجھ سے کہا۔

"سونیا کا علاج کرانے کے دوران کئی بار وہ استخوانی ہاتھ میرے سامنے آئے اور مجھے اسی عورت کی آواز سنائی دی۔ وہ ہمیشہ مجھے یہی کہتی تھی کہ سونیا کا علاج نہ کرایا جائے۔ کوئی فائدہ حاصل نہ ہو گا۔ میں نے آپ کو یہ بات اس لئے نہیں بتائی تھی کہ آپ اسے میرا وہم کہتے۔ مگر آپ مانیں یا نہ مانیں' مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میری بیٹی پر کسی آسیب کا سایہ ہے۔"

میں نے اپنی بیوی کی باتوں کو دل ہی دل میں تسلیم کیا لیکن اس کا اعتراف نہیں کیا۔ یہ غم مجھے اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا کہ میری بیٹی دونوں ہاتھوں سے مجبور ہے۔ وہ بے حد حسین ہے' اب جوان ہو رہی ہے' اس کے پاس دولت کی کمی نہیں ہے۔ دنیا کی ساری نعمتیں میسر ہونے کے باوجود وہ خوش نہیں ہے۔ ہرے بھرے جنگل میں ناچتے ہوئے مور کی طرح وہ اپنے ہاتھوں کو دیکھ کر اداس ہو جاتی ہے۔ کاش! میں اس کے دکھ کا مداوا کر سکتا۔"

وہ ڈائری سجاد کے ہاتھوں میں تھی اور اس کے تصور میں سونیا کے خوبصورت ہاتھ تھے اور اس کے چہرے کی اداسی بتا رہی تھی کہ دنیا کی ساری خوشیاں حاصل ہونے کے باوجود وہ خوش نہیں ہے۔ اس نے سوچتے ہوئے ڈائری کا ایک ورق الٹ دیا۔ اب ڈائری کی تحریر پھر بدل گئی تھی۔ وہ تحریر کہہ رہی تھی۔

"میرا نام شہناز بیگم ہے۔ میں مرحوم شفاعت علی کی بیوہ اور سونیا کی ماں ہوں۔ جب سونیا پندرہ برس کی ہوئی تو شفاعت علی اس کے غم میں گھل گھل کر مر گئے۔ میں بھی اسی غم میں گھلتی جا رہی ہوں۔ سوچتی ہوں میں مر جاؤں گی تو میرے بعد میری اپاہج بیٹی کا کیا بنے گا؟ اس کی دیکھ بھال کے لئے ایک مستقل محافظ کی ضرورت ہے۔ اس کی مستقل حفاظت اس کا شوہر ہی کر سکتا ہے۔ ان دنوں جب میں اس فکر میں تھی کہ سونیا کی شادی کے لئے کہیں سے اچھا لڑکا مل جائے جو اس کے دونوں ہاتھ بن کر ساری زندگی اس کی حفاظت کرتا رہے۔ تو ایسے وقت ایک نہایت ہی حسین عورت اس حویلی میں آئی۔ وہ میرے سامنے اپنا دکھڑا رونے لگی کہ وہ بیوہ ہے اور دنیا والے اس کے حسن اور جوانی کو ہوس کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ اتنی بڑی دنیا میں کہیں بھی عزت و آبرو سے زندگی گزارنے کو جگہ نہیں ہے۔ میں نے اس پر ترس کھا کر اسے حویلی میں پناہ دے دی۔ اسے کئی بار سمجھایا کہ وہ دوسری شادی کر لے۔ مگر وہ کہتی تھی کہ اسے مردوں سے سخت نفرت ہے۔ اس کے خاوند نے اس پر ایسے ایسے ظلم ڈھائے ہیں کہ اب وہ کسی دوسرے مرد کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ اس پر ترس کھانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کا نام سادھنا تھا۔

یہ میری ساس کا نام بھی تھا۔ میرے مرحوم خاوند کو اس نام سے محبت بھی تھی اور عقیدت بھی۔ اسے پناہ دے کر میں نے ایسا اطمینان محسوس کیا جیسے میں نے اپنے خاوند اور اپنی ساس کی روح کو خوش کر دیا ہو۔ وہ میری سونیا کا بہت خیال رکھتی تھی۔ اسے اپنے ہاتھوں سے نہلاتی اور کپڑے پہناتی تھی۔ کھانے کے دوران جب سونیا کے ہاتھ مفلوج رہتے تو وہ اپنے ہاتھوں سے اسے کھلاتی تھی۔ سونیا کے ہاتھوں کا وہی حال تھا۔ وہ کبھی حرکت کرتے تھے اور پھر بیکار ہو جاتے تھے۔

میں نے اسی ڈائری میں اپنے مرحوم خاوند کی تحریر پڑھی ہے۔ اس سے پتہ چلا ہے کہ انہیں بھی کسی رات کسی عورت نے کہا تھا کہ سونیا کے ہاتھوں کا تعلق اس عورت سے ہے جب وہ جاگتی ہے تو سونیا کے دونوں ہاتھ کہنی سے مردہ ہو جاتے ہیں۔ جب وہ گہری نیند سوتی ہے' تو وہ ہاتھ زندہ ہو جاتے ہیں۔ قدرت کا عجب تماشہ تھا۔ یہ تماشہ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

ایک رات ایک عجیب انکشاف ہوا۔ مجھے ایک دوا کی ضرورت تھی۔ پتہ نہیں میں نے وہ دوا کی شیشی کہاں رکھ دی تھی۔ میں نے سوچا شاید سادھنا کو اس کا علم ہو گا' میں

اس سے پوچھنے کے لئے اس کے کمرے میں گئی۔ اس وقت رات کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔ سادھنا اپنے بستر پر گہری نیند سو رہی تھی۔ میں اسے جگانے کے لئے اس کے قریب گئی تو ایک دم سے ٹھٹک گئی۔ اس کا ایک ہاتھ چارپائی کے سرے پر تھا اور وہ ہاتھ کہنی کی طرف سے چارپائی کے نیچے جھول رہا تھا۔ صاف طور سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ ہاتھ مفلوج ہے۔ وہ کسی طرف بھی گھوم سکتا ہے' مڑ سکتا ہے۔ میں حیرانی سے دیدے پھاڑ پھاڑ کر سادھنا کو دیکھنے لگی۔ پھر میں نے قریب جا کر اس کے ہاتھ کو چھو کر دیکھا۔ اسے ذرا سا اٹھا کر پھر چھوڑ دیا۔ وہ ہاتھ دوبارہ کہنی کی طرف سے نیچے کی طرف جھولنے لگا۔ میرا تجسّس بڑھنے لگا تو میں چارپائی کے دوسری طرف گئی اور دوسرے ہاتھ کو اٹھا کر دیکھنے لگی۔ وہ بھی اسی طرح مردہ تھا۔ میں دہشت زدہ ہو کر اس حسین بلا کو دیکھنے لگی۔ مجھے اچانک ہی ڈائری میں لکھی ہوئی اپنے خاوند کی وہ تحریر یاد آ گئی۔ انہوں نے لکھا تھا کہ جو حسین عورت اس کے خواب میں آئی تھی' وہ خود کو ان کی مرحوم والدہ کہہ رہی تھی۔

ان کی والدہ کا نام بھی سادھنا تھا اور اس عورت کا نام بھی سادھنا ہے۔ وہ بھی حسین تھیں اور یہ بھی بلا کی حسین نظر آ رہی تھی۔ میرے سسر وجاہت علی دقیانوسی خیال کے تھے۔ اس لئے انہوں نے سادھنا کی کوئی تصویر نہیں اتروائی تھی۔ میں نے اپنی ساس کو نہیں دیکھا تھا۔ لہٰذا میرے سامنے جو عورت تھی میں یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ میری ساس تھی۔

بہرحال وہ جو کوئی بھی تھی میری بیٹی کی دشمن تھی۔ اس وقت گہری نیند سو رہی تھی اور ایسے وقت میں یقین سے کہہ سکتی تھی کہ میری بیٹی کے ہاتھ مفلوج نہیں ہوں گے۔ اگر میں اسے موت کی ابدی نیند سلا دوں تو میری سونیا کے ہاتھوں میں ہمیشہ کے لئے زندگی آ جائے گی۔ یہ سوچتے ہی میں اپنے کمرے میں گئی اور اپنے مرحوم خاوند کے صندوق سے ایک خنجر نکال کر لے آئی۔ وہ اپنے بستر پر ابھی تک گہری نیند سو رہی تھی۔ میں نے اس کے دل کا نشانہ لے کر خنجر کو فضا میں بلند کیا لیکن اسی وقت میری کلائی ایک ہاتھ کی گرفت میں آ گئی۔

میں نے پلٹ کر دیکھا تو پیچھے میری بیٹی سونیا کھڑی تھی۔ میری کلائی اس کے دائیں ہاتھ کی گرفت میں تھی اور وہ پوچھ رہی تھی۔

"امی! آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ آپ اسے ہلاک کیوں کرنا چاہتی ہیں؟"

میں نے کہا۔ "سونیا! یہ ڈائن ہے۔ اگر میں اسے ہلاک کر دوں گی تو تیرے ہاتھ ہمیشہ

کے لئے زندہ ہو جائیں گے۔ میرا ہاتھ چھوڑ دو۔"

سونیا نے پریشان ہو کر کہا۔ "میں کیسے چھوڑ دوں امی؟ میں نے اپنی مرضی سے آپ کا ہاتھ نہیں پکڑا ہے۔ میں سو رہی تھی۔ یک بیک اٹھ کر یہاں چلی آئی۔ میں اپنی مرضی سے نہیں آئی ہوں۔ یہ ہاتھ مجھے کھینچ کر لے آئے ہیں۔"

اپنی بیٹی کی باتیں سن کر میں اس کے پنجے سے اپنی کلائی چھڑانے لگی۔ ذرا سی جدوجد کے بعد اس کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے۔ میں نے حیرانی سے دیکھا۔ سونیا کے دونوں ہاتھ پھر بے حس و حرکت ہو کر اس کے بدن کے اطراف جھول رہے تھے۔ مجھے سادھنا کا قہقہہ سنائی دیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی تھی اور اپنے دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر بول رہی تھی۔

"تمہارے سسر نے ان ہاتھوں کو تیزاب سے گلا دیا تھا مگر میں نے اپنی پوتی کے ہاتھ اپنا لئے ہیں۔ میں جب چاہتی ہوں' اس کے ہاتھوں کو استعمال کرتی ہوں۔ پھر سوتے وقت انہیں واپس کر دیتی ہوں۔ یہ ہاتھ دادی کے بھی ہیں اور پوتی کے بھی۔ سونیا کے یہ ہاتھ جس طرح سونیا کی حفاظت کرتے ہیں' اسی طرح میری بھی حفاظت کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ میرے بھی ہاتھ ہیں۔"

اس کی بات سن کر سونیا نے نفرت سے کہا۔ "تم میری دادی نہیں ڈائن ہو۔ تم میرے ہاتھ مجھے واپس کر دو تو میں تمہارا گلا گھونٹ دوں گی۔"

سادھنا نے مسکرا کر کہا۔ "خونی رشتے ایک دوسرے کو نقصان نہیں پہنچاتے۔ میں نے بھی اب تک اپنے بیٹے' بہو اور پوتی کو نقصان نہیں پہنچایا۔ یہ ہاتھ جو میرے پاس ہیں' وہ تمہارے ہیں' تمہیں واپس مل جائیں گے تب بھی تم مجھے نقصان نہیں پہنچا سکو گی۔ یہ لو میں واپس کرتی ہوں۔ تم انہیں آزما لو.........."

یہ کہہ کر اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے زانوؤں پر رکھ لیا۔ اسی وقت سونیا نے محسوس کیا کہ اس کے دونوں ہاتھ زندہ ہو گئے ہیں۔ اس نے مٹھیاں بھینچ بھینچ کر اپنے ہاتھوں کو دیکھا پھر اپنی دادی کا گلا دبانے کا ارادہ کیا لیکن وہ ہاتھ آگے نہیں بڑھ رہے تھے۔ سادھنا نے ہنستے ہوئے کہا۔

"بیٹی سونیا! میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ یہ ہاتھ صرف تمہارے ہی نہیں' میرے بھی ہیں اور جب میرے ہیں تو میرا گلا کیسے گھونٹ سکتے ہیں؟"

اس دوران سونیا ہر ممکن کوشش کرتی رہی کہ اس کے ہاتھ اس کی دادی کے گلے

تک پہنچ جائیں لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکی۔ پھر اس کے دونوں ہاتھ بے حس ہو کر بدن کے اطراف جھولنے لگے۔ اس کے بعد میں سادھنا کے دونوں ہاتھوں کو حرکت کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ میں نے پریشان ہو کر اپنی بیٹی کا بازو تھام لیا اور اسے لے کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ وہاں ہم بہت دیر تک سادھنا کے متعلق گفتگو کرتے رہے۔ یہ درست ہے کہ وہ ہمیں نقصان نہیں پہنچا رہی تھی۔ ایک ساس کے رشتے سے مجھے اور دادی کے رشتے سے سونیا کو بے حد چاہتی تھی اور دن رات سونیا کے آرام کا خیال رکھتی تھی۔ اس کے باوجود ہم اس سے نجات حاصل کرنے کی تدبیریں سوچتے رہے۔ وہ ہم دونوں کی رشتے میں کچھ بھی لگتی ہو مگر اب چڑیل بن چکی تھی اور میں چڑیل سے کسی طرح کا رشتہ نہیں نبھاہ سکتی تھی۔ نجات کی تدبیریں سوچتے سوچتے صبح ہو گئی تو میں نے دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ سونیا کی بھی نیند پوری نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے وہ بھی میرے ساتھ سو گئی۔ نیند آنے تک میرے دماغ میں یہی بات پکتی رہی کہ ہر حال میں اس سے نجات حاصل کرنا ہے۔"

سجاد نے ڈائری کا ورق الٹ کر دیکھا تو اس کے بعد جتنے اوراق تھے سب سادہ تھے۔ سونیا کی ماں شہناز بیگم ان صفحات کی طرح زندگی سے خالی ہو چکی تھی۔ سجاد کا یہی اندازہ تھا کہ موت نے شہناز بیگم کو آگے کچھ لکھنے کی مہلت نہیں دی تھی۔ آگے کیا ہوا' یہ جاننے کے لئے وہ بے چین ہو گیا۔ ایک دلچسپ کہانی جو حقیقت سے بالکل قریب ہو اور جس کے بیشتر واقعات آنکھوں کے سامنے گزر رہے ہوں تو تجسّس بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ سجاد نے ڈائری بند کر کے دروازے کی جانب دیکھا۔ سونیا ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔

اس نے سگریٹ کیس سے ایک سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبایا پھر اسے سلگانے کے لئے لائیٹر تلاش کرنے لگا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اس نے لائیٹر کو تپائی پر رکھا تھا۔ پھر بھی اس نے اپنی جیبیں ٹٹولیں۔ مگر لائیٹر نہیں ملا۔ وہ کہاں جا سکتا تھا؟ کیا سونیا کے ساتھ لائبریری میں جا کر اس نے سگریٹ سلگایا تھا؟ ہو سکتا ہے کہ لائیٹر وہیں رہ گیا ہو۔ اس کی یادداشت اتنی کمزور نہیں تھی۔ اس کے باوجود وہ جھلا رہا تھا کہ لائیٹر کہاں رکھ کر بھول گیا تھا۔ جب اسے کچھ یاد نہ آیا تو وہ اپنے کمرے سے نکل کر سونیا کے کمرے کی طرف جانے لگا۔ سگریٹ ابھی تک اس کے ہونٹوں میں دبا ہوا تھا۔ اس نے سونیا کی خوابگاہ میں جا کر دیکھا تو وہ پلنگ پر نیم دراز تھی۔ اس کے ہونٹوں میں بھی سگریٹ دبا ہوا تھا اور

ایک استخوانی ہاتھ اس کے لائیٹر سے سونیا کا سگریٹ سلگا رہا تھا۔ سونیا نے سگریٹ کا ایک کش لے کر دھواں چھوڑتے ہوئے کہا۔

"میں اس انتظار میں تھی کہ تم ڈائری پڑھ لو گے تو میں تمہارے کمرے میں جاؤں گی۔ اگر تم نے وہ ڈائری پڑھ لی ہے تو اب یہ سمجھ گئے ہو گے کہ یہ استخوانی ہاتھ جو یہاں موجود ہے یہ دادی اماں کا ہے اور وہ ابھی جاگ رہی ہیں۔ میں نے انہیں بتا دیا ہے کہ تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو۔ اب دادی اماں کبھی تمہیں نقصان نہیں پہنچائیں گی۔ لو اپنا سگریٹ سلگا لو۔"

سونیا کی زبان سے یہ بات ادا ہوتے ہی وہ استخوانی ہاتھ لائیٹر اٹھائے سجاد کے پاس آیا اور اس کے ہونٹوں میں دبے ہوئے سگریٹ کو سلگانے لگا۔ تہ خانے میں وہی ہاتھ اس کا دشمن تھا مگر اب دوست بن گیا تھا بلکہ دادی ساس بن گیا تھا۔ سگریٹ سلگانے کے بعد وہ ہاتھ کمرے سے باہر چلا گیا۔ سجاد نے کہا۔

"ڈائری پڑھنے کے بعد مجھے تم سے اور زیادہ محبت پیدا ہو گئی ہے۔ میں تمہیں اس ویران حویلی میں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ آج ہی تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ ابھی میں تم سے یہ پوچھنے آیا ہوں کہ وہ ڈائری ادھوری کیوں رہ گئی؟ تمہاری امی نے اسے مکمل کیوں نہیں کیا؟ تمہاری امی تمہاری دادی اماں کو ہلاک کرنے کی تدبیر سوچ رہی تھیں کیا دادی اماں نے ان سے انتقام لیا ہے؟"

"نہیں' دادی اماں نے اپنے خاندان کے کسی فرد کو نقصان نہیں پہنچایا۔ ہوا یہ کہ امی نے ایک بہت ہی عمدہ تدبیر سوچ لی تھی۔ دوسری رات جب دادی اماں اپنے کمرے میں سونے کے لئے گئیں تو امی نے میرے بے حس ہاتھوں کو پشت کی طرف ایک مضبوط رسی سے باندھ دیا تاکہ دادی اماں گہری نیند سو جائیں اور مجھے میرے ہاتھ واپس مل جائیں تو وہ بدستور رسی سے بندھے رہیں اور جب وہ دادی اماں کو ہلاک کرنے جائیں تو یہ ہاتھ ان کی حفاظت نہ کر سکیں۔

ان کے منصوبے کے مطابق میرے دونوں ہاتھ بندھے رہے تقریباً ایک گھنٹے کے بعد جب میں نے امی کو بتایا کہ میرے ہاتھوں میں جان آ گئی ہے تو اس سے ظاہر ہو گیا کہ دادی اماں گہری نیند سو رہی ہیں۔ ہم دونوں ان کے کمرے میں گئے۔ میں ایک قیدی کی طرح امی کے ساتھ گئی اور انہیں بتاتی رہی کہ میرے دونوں ہاتھ رسی توڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ امی کی نیت کو سمجھ گئے تھے۔ دوسرے لفظوں میں' میں امی کے ارادے کو سمجھ

رہی تھی اس لئے میرے اور دادی اماں کے مشترکہ ہاتھ انہیں ان کے ارادے سے باز رکھنا چاہتے تھے مگر بے چارے بندھے ہوئے تھے۔ ہم دونوں دادی اماں کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ وہ اپنے بستر پر بے خبر سو رہی تھیں۔ میری امی کے ہاتھ میں وہی پچھلی رات والا خنجر تھا۔ انہوں نے وقت ضائع کئے بغیر خنجر کی نوک کو ان کے سینے میں اتار دیا مگر یوں لگا جیسے وہ خنجر گوشت پوست کے بدن میں اترنے کی بجائے صرف ہڈیوں سے ٹکرایا ہو۔ انہوں نے دوسری بار حملہ کرنے کے لئے اپنے بائیں ہاتھ کو دادی اماں کے گلے پر رکھ کر دائیں ہاتھ سے خنجر دادی اماں کے سینے سے نکالا مگر ان کے گلے پر ہاتھ رکھتے ہی امی کے حلق سے ایک دہشت ناک چیخ نکلی۔ وہ اک دم سے لڑکھڑا کر ذرا پیچھے گئیں اور فرش پر گرتے ہوئے بولیں۔

"یہ .... یہ تو ہڈیوں کا ڈھانچہ ہے.........."

میں امی کو بھول کر دادی اماں کو دیکھنے لگی۔ وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی تھیں پھر تلخی سے مسکرا کر بولیں۔

"میں تم دونوں کو دہشت زدہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اب تم دیکھ ہی چکی ہو تو یہ سن لو کہ میں صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ ہوں۔ یہ گوشت پوست کا بدن محض فریبِ نظر ہے۔ مجھے مرے ہوئے ایک مدت گزر گئی ہے۔ مرنے کے بعد انسانی بدن کی ہر چیز گل جاتی ہے۔ صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ جاتا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھیں اور میرے بندھے ہوئے ہاتھ کھول دیئے۔ اس کے بعد دادی اماں کے ہاتھ بے حس ہو گئے اور میرے ہاتھوں میں جان آ گئی۔ میں امی کی باتیں سن کر حیران تھی اور خود اس بات کا یقین کرنا چاہتی تھی کہ دادی اماں کا بدن گوشت پوست کا ہے یا نہیں؟ میں نے جھجکتے ہوئے اپنا ہاتھ بڑھا کر ان کے شانے پر رکھا تو فوراً ہی گھبرا کر اپنا ہاتھ اٹھا لیا۔ واقعی وہ اوپر سے مکمل عورت نظر آ رہی تھیں مگر چھونے سے پتہ چلتا تھا کہ وہ استخوانی ہاتھوں کی طرح سر سے پاؤں تک استخوانی ڈھانچہ ہیں۔

وہ ہنسنے لگیں اس وقت مجھے پتہ چلا کہ موت کس طرح دانت نکال کر ہنستی ہے مگر وہ ہمارے سامنے موت بن کر کبھی نہیں آئیں۔ وہ ہنستی ہوئی کہہ رہی تھیں۔

"سونیا میں تمہاری دادی ہوں۔ تمہیں اور تمہاری امی کو کبھی نقصان پہنچا نہیں سکتی۔ تمہاری امی بھی مجھے ہلاک نہیں کر سکتیں۔ مجھے زندہ رہنے کے لئے ہر رات انسانی لہو مل جاتا ہے۔ جب تک میں لہو پیتی رہوں گی' اس وقت تک اسی حالت میں زندہ رہوں

گی اس لئے نہ مجھے نقصان پہنچاؤ اور نہ ہی کبھی دل میں یہ خیال لاؤ کہ تم لوگوں کو مجھ سے کوئی نقصان پہنچے گا۔ جاؤ اپنی امی کو سنبھالو۔"

میں امی کو سنبھالنے کے لئے ان پر جھکی تو پتہ چلا کہ وہ مارے دہشت کے مر چکی ہیں۔ میں ان سے لپٹ کر رونے لگی۔ مجھے دادی اماں پر غصہ آ رہا تھا مگر میں انہیں الزام نہیں دے سکتی تھی کیونکہ انہوں نے امی کو ہلاک نہیں کیا تھا۔ انہوں نے تو ہماری بھلائی کے لئے یہ بات بھی چھپا رکھی تھی کہ وہ حقیقتاً ہڈیوں کا ڈھانچہ ہیں۔ صرف نگاہوں کو فریب دینے کے لئے وہ ایک عورت کے روپ میں نظر آتی ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔ سجاد بھی سر جھکائے خاموش رہا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اپنی ماں کی موت کا ذکر کرتے ہوئے سونیا کا دل رو رہا ہو گا۔ لہٰذا کچھ دیر خاموش رہنا چاہئے اور خاموش رہ کر وہ یہ بھی فیصلہ کر رہا تھا کہ جتنی جلد ممکن ہو سکے وہ سونیا کو دادی اماں سے دور لے جائے گا۔ اس نے سونیا سے پوچھا۔

"کیا آج ہی ہماری شادی نہیں ہو سکتی؟"

سونیا نے سر اٹھا کر اسے بڑی محبت سے دیکھا پھر جواب دیا۔

"شادی ہو یا نہ ہو' میں ہر حال میں تمہاری ہوں۔ تم سے پہلے وہ گوپی بھی مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔"

سجاد کو اچانک یاد آیا کہ گوپی تو اسی حویلی کے تہہ خانے میں موجود ہے اگر وہ اسے قانون کے حوالے کرے گا تو اس کی ترقی ہو جائے گی اور اس کی تنخواہ بڑھے گی۔ حالانکہ سونیا کے پاس اتنی دولت تھی کہ اب اسے ملازمت کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی لیکن وہ پولیس افسر نہ سہی ایک عام شہری کی حیثیت سے ہی قانون کا ساتھ دے سکتا تھا۔ اس نے کہا۔

"تم نے خوب یاد دلایا' قاتل تہہ خانے میں موجود ہے اور میرے ہاتھوں بری طرح زخمی بھی ہو چکا ہے۔ میں ابھی جا کر اسے ہتھکڑی لگاؤں گا۔"

سونیا نے کہا۔ "یہ پچھلی رات کی بات ہے تم نے اسے پچھلی رات تہہ خانے میں دیکھا تھا۔ تمہیں شاید وقت گزرنے کا احساس نہیں رہا۔ یہ حویلی ایسی ہے کہ دن رات کا پتہ نہیں چلتا۔ بہرحال میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ قاتل پچھلی رات دادی اماں کا شکار تھا۔ اس کی لاش حویلی سے دور ایک چٹان کے پیچھے پڑی ہوئی ہے اور اب اس کے بدن میں خون کا ایک قطرہ بھی نہیں ہے۔ دادی اماں نے لہو سے خالی لاش کو گھسیٹ کر وہاں پہنچا دیا

ہے۔"

سجاد نے سونیا کی جانب دیکھا وہ بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ لیٹنے کا انداز ایسا تھا کہ بدن کی شادابیاں جگہ جگہ سے اجاگر ہو رہی تھیں۔ تنہائی ہو اور ایک جوان عورت اپنے لیٹنے کے انداز سے قیامت جگا رہی ہو تو اس وقت دماغ کام نہیں کرتا صرف دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں۔ اس نے جذبات کی ہلچل میں کہا۔

"اس وقت مجھے جا کر قاتل کو اپنے قبضے میں لینا چاہئے لیکن تمہارے پاس سے جانے کو جی نہیں چاہتا۔ ایک طرف فرض ہے' دوسری طرف محبت۔ بولو میں کدھر جاؤں؟"

سونیا نے جواب میں نظریں جھکا لیں۔ اس کے چہرے پر بھی جذبات کی دھوپ چھاؤں تھی۔ اس کی شرمیلی ادائیں بتا رہی تھیں کہ وہ بھی سجاد کو اپنے سے دور جاتے نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

سجاد نے کہا۔ "تم نے جواب نہیں دیا کہ میں تمہارے پاس آؤں یا فرض پورا کرنے جاؤں۔ میرا خیال ہے چٹان کے پیچھے گوپی کی لاش محفوظ ہو گی۔ میں بعد میں بھی وہاں جا سکتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ سونیا کی طرف بڑھا۔ خوابگاہ کے باہر حویلی کے ایک بڑے ہال میں ایک بڑی سی میز پر ایک شمعدان رکھا ہوا تھا جس میں چار مومی شمعیں روشن تھیں۔ روشنی کے اس طرف ایک ایزی چیئر پر بوڑھی سادھنا بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ کرسی کے اطراف جھول رہے تھے۔ کبھی وہ بہت ہی حسین اور جوان تھی اب کتنی بوڑھی نظر آ رہی تھی۔ سجاد اسے دیکھتا تو اپنی معلومات کے مطابق یہی سوچتا کہ اس ایزی چیئر پر ہڈیوں کا ڈھانچہ بیٹھا ہوا ہے۔ وہ بوڑھی رات کی خاموشی میں زیرِ لب بڑبڑا رہی تھی۔

"سونیا بہت معصوم ہے اور بہت مظلوم ہے۔ اس نے اپنے دو ہاتھ مانگتے مانگتے اپنی عمر کا بہت سا حصہ گزار دیا ہے۔ اس نے اب تک اسی لئے شادی نہیں کی کہ وہ مکمل عورت نہیں تھی۔ وہ محبت سے اپنے شوہر کے گلے میں بانہیں نہیں ڈال سکتی تھی۔ وہ اپنے ہاتھوں سے ایک بیوی کے فرائض انجام نہیں دے سکتی تھی۔ حتیٰ کہ ایک بچہ پیدا کر کے اسے اپنے بازوؤں کے جھولے میں نہیں جھلا سکتی تھی۔ دو ہاتھوں کے سہارے اسے اپنے سینے سے لگا کر دودھ نہیں پلا سکتی تھی۔ پھر وہ کس لئے شادی کرتی؟"

اس کی آواز اس مکھی کی طرح بھنبھنا رہی تھی جو مکڑی کے جال میں پھنس گئی ہو۔ سونیا کا حسین وجود ایک چمکتے ہوئے جال کی طرح بستر پر بچھا ہوا تھا۔ بستر کے سرہانے ایک

شمع روشن تھی۔ سجاد اس کی طرف بڑھا۔ سونیا نے شرما کر ایک پھونک ماری اور شمع بجھا دی۔ خوابگاہ میں گہری تاریکی چھا گئی۔ سجاد بستر کے قریب جا کر اس پر جھکا تو اسے جوان سانسوں کی سرسراہٹ کے ساتھ سونیا کی آواز سنائی دی۔

”پچھلی رات تمہیں دیکھتے ہی تم سے محبت کرنے کے لئے دل مچل گیا تھا لیکن میرا پیٹ بھر چکا تھا کیونکہ پچھلی رات گوپی تھا۔ محبت کے لئے تمہیں دوسری رات تک روکنا ضروری تھا۔ آؤ اب میری بانہوں میں آ جاؤ..........“

بات ختم ہوتے ہی دو بانہیں اس کی گردن کا ہار بن گئیں۔ مگر وہ استخوانی بانہیں تھیں۔ سجاد ہڑبڑا کر اس کے بدن سے ٹکرا گیا۔ اس کا بدن بھی استخوانی تھا۔ خوابگاہ کے باہر بوڑھی عورت کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ روتی ہوئی کہہ رہی تھی۔

”دادی اماں! تم آخر مجھ پر کب تک ظلم کرو گی؟ کب تک میرے ہاتھ مجھے واپس نہیں کرو گی۔ میں بھی بہت ضدی ہوں۔ میں موقع پا کر مسافروں کو بتا دیتی ہوں کہ تم ایک حسین بلا ہو۔ میں نے تہہ خانے میں جا کر گوپی کو بھی سمجھایا۔ انسپکٹر کو بھی تمہارے شیطانی ارادوں سے آگاہ کیا مگر تمہارے حسن کی چکاچوند کے آگے میری کوئی نہیں سنتا اور تمہارے استخوانی شکنجے میں چلا جاتا ہے۔ آہ! تم مُردہ ہو کر زندہ ہو اور میں زندہ ہو کر بھی ہاتھوں کے بغیر مُردہ ہوں..........“

وہ معصوم اور مظلوم بوڑھی آواز اندھیرے میں سسک رہی تھی۔

☆======☆======☆

نیند کی چوری

بے خوابی کی ایک مریضہ کی انوکھی کہانی، کوئی اس کی نیند چرا لیتا تھا۔

دولت کسے اچھی نہیں لگتی، مگر اسے حاصل کرنے کے لئے

بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔

دولت کے حصول کے لئے کھیلے جانے والے

ایک خونی ڈرامے کی کہانی۔

ہم لکھنے والوں کی شان بھی عجیب ہوتی ہے۔ ہم کسی کو صورت شکل سے پہچانیں یا نہ پہچانیں مگر پڑھنے والے ہماری تحریر کی روشنی میں ہمیں خوب پہچانتے ہیں۔ ہمارے نام تعریفی خطوط آنا تو خیر ایک عام سا دستور ہو گیا ہے۔ اس سلسلے میں خاص بات یہ ہے کہ اب بعض قارئین کی طرف سے ہمارے نام دعوتی رقعے بھی آنے لگے ہیں۔ میں اس بار ایسے ہی ایک دعوتی کارڈ کی کہانی پیش کر رہا ہوں۔

کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ شکر خورے کو شکر ہی دیتا ہے اس لئے وہ تقدیروں کا مالک مجھ جیسے جرم و سزا کی کہانیاں لکھنے والے کو اکثر مجرموں کے کسی اکھاڑے میں لے جا کر پٹخ دیتا ہے۔ پہلی بار میرے نام جو دعوت نامہ آیا وہ دراصل موت کی گود میں پہنچانے والا پاسپورٹ تھا۔ مگر اس پاسپورٹ کی تحریر اتنی خوبصورت تھی کہ میں اس کے پیچھے انسانی لہو کی لکیریں نہ دیکھ سکا۔ آپ اس دعوت نامہ کو خود ہی ملاحظہ فرمائیں۔

"جناب ابنِ شہاب صاحب!

میں آپ کے لئے اجنبی ہوں لیکن آپ کو اپنوں کی طرح پہچانتی ہوں۔

عرصہ دو سال سے آپ کی کہانیاں پڑھتے پڑھتے یوں محسوس کرنے لگی ہوں جیسے آپ کہانیوں کے رومانی ماحول میں مجھ سے گفتگو کرتے رہتے ہیں۔ آپ اسے میری خوش فہمی سمجھ لیں۔ مگر ہر جوان لڑکی کی طرح مجھے بھی سہانے خواب دیکھنے کا حق ہے۔

میں ضد نہیں کروں گی کہ آپ اس خواب کی تعبیر بن جائیں لیکن ایک درخواست کروں گی کہ آپ ہمارے ہاں نئے سال کی تقریب میں ضرور تشریف لائیں۔ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں آپ کے رومانی ذوق کے مطابق بے حد خوبصورت پارٹی ہو گی۔ میری صرف اتنی سی آرزو ہے کہ یہ جشنِ نوروز آپ کے ساتھ مناؤں۔ کیا آپ اپنی کسی قدردان کی اتنی سی آرزو پوری نہیں کریں گے؟

مجھے یقین ہے کہ آپ سنگدل نہیں ہیں۔ گر آپ ایک شرط پر آئیں۔ شرط یہ ہے کہ پارٹی میں آ کر آپ کسی سے میرا نام نہ پوچھیں۔ بلکہ ایک جاسوس کی طرح مجھے وہاں تلاش کریں۔ آپ کی سہولت کے لئے اتنا لکھ دوں کہ میرا قد درمیانہ ہے۔ رنگ گورا اور گلابی مائل ہے۔ صحت اچھی ہے' صورت بُری نہیں ہے۔ ہزاروں میں پہچانی جا سکتی ہوں۔ آپ مجھے پہچان کر دکھائیں۔ جب میں دیکھوں گی کہ آپ ناکام ہو رہے ہیں تو خود ہی آپ کے سامنے چلی آؤں گی۔

فقط

آپ کی منتظر

جگنو شبانہ۔"

خط کی تحریر کیا تھی' میرے سامنے جیسے جگنوؤں کی کہکشاں تھی۔ اپنے رومانی ذوق کے مطابق سب سے پہلے جگنو رانی کی خیالی تصویر نگاہوں میں پھرنے لگی۔ درمیانے قد کی ایک دوشیزہ تصور میں مسکرانے لگی۔ اس کا گورا رنگ گلابی مائل تھا۔ صحت ایسی غضبناک تھی کہ لباس کے پیچ و خم میں جگہ جگہ سے ڈوبتی ابھرتی جا رہی تھی۔ اس نے لکھا تھا کہ صورت بُری نہیں ہے۔ ظاہر ہے جوانی میں گدھی بھی خوبصورت نظر آتی ہے اور جگنو تو پھر انسان کی بچی تھی۔ ذرا اچھا ہی رنگ روپ لے کر شباب کی پنکھڑیاں کھول رہی ہو گی۔

جو کچھ بھی ہو' کسی اجنبی دوشیزہ کے لگاوٹ بھرے بلاوے پر اس کے گھر جانا دانشمندی نہیں تھی۔ بعض احمق کبھی کبھی مجھے زنانہ نام سے خط لکھتے ہیں۔ اپنے خط کا جواب حاصل کرنے کے لئے خود کو نازک اندام دوشیزہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ یعنی مجھے احمق بنانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن میں ایسے خطوط کو ردی کی ٹوکری میں پھینک دیتا ہوں۔ شاید جگنو شبانہ کے خط کا بھی یہی انجام ہوتا۔ مگر اس خط کے نیچے اس کے باپ کا نام اور پتہ لکھا ہوا تھا اسے پڑھ کر میں سنجیدگی سے کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا۔

اس کے باپ کا نام وسیم درانی تھا۔ ہل پارک کے قریب اس کی ایک شاندار کوٹھی تھی۔ ان دنوں ہمارے ملک میں شراب ممنوع نہیں تھی۔ وہ ولایتی بیئر' وہسکی اور برانڈی کا لائسنس یافتہ امپورٹر تھا اور رفتہ رفتہ لکھ پتی سے کروڑ پتی بن رہا تھا۔ ایک ماہ پہلے کی بات ہے۔ میں دفتر میں صبح کے وقت چینی اور نکتہ چینی والے صاحب کے پاس بیٹھا ایک کہانی کے موضوع پر بحث کر رہا تھا۔ اچانک ہی وسیم درانی دندناتا ہوا دفتر میں داخل ہوا پھر ہمارے سامنے میز پر جاسوسی کا ایک پرچہ پھینکتے ہوئے پوچھا۔

"یہ سرورق کی آخری کہانی لکھنے والا ابنِ شہاب کون ہے؟"
چینی صاحب نے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
"یہ صاحب بیٹھے ہوئے ہیں مگر بات کیا ہے؟"
وسیم درانی نے میری طرف غراتے ہوئے کہا۔
"اچھا تو آپ ہم جیسے شریف آدمیوں پر کیچڑ اچھالتے ہیں۔"
میں نے کہا۔ "میں قلم کی روشنائی اچھالتا ہوں۔ اگر روشنائی کا کوئی دھبہ آپ کے دامن تک پہنچا ہو تو اس کی وضاحت فرمائیں۔"
وسیم درانی نے میز پر پڑے ہوئے ڈائجسٹ کو اٹھا کر کہا۔
"آپ نے مجھ پر اور میری بیٹی پر یہ سرورق کی کہانی لکھی ہے۔"
"تعجب ہے۔ میں نے آپ کو پہلی بار دیکھا ہے اور آپ کی بیٹی کو آج تک نہیں دیکھا۔ آپ لوگوں کے نام سے بھی واقف نہیں ہوں۔"
"آپ جھوٹ کہتے ہیں۔ آپ نے اس کہانی میں باقاعدہ میرا اور میری بیٹی کا نام لکھا ہے۔ میرا نام وسیم درانی ہے۔ میری بیٹی کا نام شبانہ ہے۔ آپ یہ کمزور سا عذر پیش نہ کریں کہ آج سے پہلے مجھے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ آپ جیسے لکھنے والوں کی معلومات بہت وسیع ہوتی ہیں۔ آپ جاسوسوں کی طرح دولت مند گھرانوں میں جھانکتے پھرتے ہیں۔ آپ نے اس کہانی میں لکھا ہے کہ میں شراب کا لائسنس یافتہ امپورٹر ہونے کے باوجود غیر قانونی طور سے زیرِ زمین شراب کشید کرتا ہوں اور میری بیٹی شبانہ فلرٹ قسم کی لڑکی ہے۔ آپ نے اس پر یہ شرمناک الزام لگایا ہے کہ اس نے کتنے ہی عاشق پال رکھے ہیں۔"
وسیم درانی کے ساتھ آنے والے ایک شخص نے کہا۔
"میں انسپکٹر رحمان علی ہوں' آپ ثبوت پیش کریں کہ درانی صاحب قانون کی آنکھوں میں دھول جھونک کر شراب کشید کرتے ہیں۔ ثبوت ملتے ہی میں انہیں گرفتار کر لوں گا۔ ورنہ آپ پر ہتک عزت کا دعویٰ کیا جائے گا کیونکہ آپ نے ان کی نیک سیرت صاحبزادی پر بھی کیچڑ اچھالی ہے۔"
میں نے کہا۔ "اگر میں نے سچی کہانی لکھی ہوتی تو ضرور ثبوت پیش کر دیتا۔ میری خیالی کہانی کے خیالی کرداروں کے نام محض اتفاقاً وسیم درانی صاحب اور ان کی صاحبزادی کے ناموں سے مطابقت رکھتے ہیں۔ آپ کے یہ درانی صاحب لائسنس یافتہ امپورٹر ہیں اور میری کہانی کا وسیم درانی غیر قانونی طور پر شراب کشید کرتا ہے۔ دونوں کے درمیان

بہت فرق ہے۔"
"کوئی فرق نہیں ہے۔" وسیم درانی نے گرج کر کہا۔ "آپ ذرا سی ہیرا پھیری سے بات بدل رہے ہیں۔ کیا آپ کے ڈائجسٹ میں کہیں بھی کسی بھی صفحہ پر یہ تحریری اعتراف کیا گیا ہے کہ اس میں شائع ہونے والی کہانیاں خیالی ہوتی ہیں۔ کسی کردار کے نام سے یا مقام سے مطابقت محض اتفاقیہ ہو گی؟ کیا آپ نے ایسا کہیں لکھا ہے؟"
میں چینی صاحب کا منہ دیکھنے لگا۔ ان کے چہرے کی چینی ذرا پھیکی پڑ گئی تھی۔ کیونکہ انہیں مٹھاس کا چسکا ایسا پڑا تھا کہ انہوں نے تحریری طور پر جھوٹی کہانیوں کا کڑوا اعتراف نہیں کیا تھا اور اب یہ بات قانون کی زد میں آ رہی تھی مگر قارئین کرام جو شخص ہر ماہ آپ کے بھیجے ہوئے سینکڑوں لفافوں میں سے چینی نکال نکال کر ہضم کر لیتا ہے' بھلا وہ کیسے پھیکا پڑ سکتا ہے۔ دوسرے ہی لمحہ چینی صاحب کے ہونٹوں پر میٹھی سی مسکراہٹ ابھری تو میری جان میں جان آئی کہ ضرور نکتہ چینی کا کوئی نکتہ ان کے ہاتھ آ گیا ہے۔ انہوں نے بڑے اطمینان سے کہا۔
"یہ جتنے مصنف حضرات ہیں' یہ ہر ماہ اتنی کہانیاں لکھتے ہیں کہ اپنی ہی لکھی ہوئی پچھلی کہانیوں کی تفصیلات انہیں یاد نہیں رہتیں' لیکن میں ایڈیٹر کی حیثیت سے ان کی کہانیوں کے ایک ایک فقرے کو اپنی یادداشت میں محفوظ رکھتا ہوں۔ میں آپ کی بات کا جواب دینے سے پہلے انسپکٹر صاحب سے پوچھوں گا۔ کیا انہوں نے ابنِ شہاب کی یہ کہانی خود پڑھی ہے؟"
"ہاں' میں نے خود پڑھی ہے۔" انسپکٹر رحمان علی نے کہا۔
"آپ غلط کہتے ہیں انسپکٹر صاحب! آپ صرف درانی صاحب کے بھڑکانے پر یہاں آ گئے ہیں۔ اگر آپ نے اسے پڑھا بھی ہے تو اس کے آخری پیراگراف پر توجہ نہیں دی ہے۔ لیجئے میں اسے پڑھ کر سناتا ہوں۔"
یہ کہہ کر چینی صاحب میری عتاب زدہ کہانی کا آخری پیراگراف سنانے لگے۔ آخر میں لکھا گیا تھا۔
"پھر اچانک ہی میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے وحشت زدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھا تو پتہ چلا کہ میں اپنی خوابگاہ میں زندہ سلامت ہوں اور شراب کشید کرنے والے کسی مجرم نے مجھے گولی کا نشانہ نہیں بنایا ہے جو کچھ کہ دیکھا خواب تھا' جو سنا افسانہ تھا۔"
میں اپنی ہی کہانی کا یہ پیراگراف سن کر خود کو کوسنے لگا کہ مجھے اپنی پچھلی کہانیاں کیوں

یاد نہیں رہتی ہیں۔ چینی صاحب نے فاتحانہ انداز میں کہا۔

"کیوں انسپکٹر صاحب! اب تو ثابت ہو گیا کہ وسیم درانی اور فلرٹ کرنے والی صاحبزادی شبانہ کا نہ تو حقیقتاً کوئی وجود ہے اور نہ ہی یہ کسی کہانی کے کردار ہیں۔ یہ محض ایک اُلجھے ہوئے خواب کی باتیں تھیں۔"

وسیم درانی نے جھنجلا کر گھونسہ دکھاتے ہوئے کہا۔

"میں سب سمجھتا ہوں۔ خواب دیکھنے کی آڑ لے کر مجھے مجرم ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے۔ تم شہاب کے بچے۔ تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور یاد رکھو اگر تم نے آئندہ کسی کہانی میں میری بیٹی شبانہ کا نام بھی لیا تو میں تمہیں شوٹ کر دوں گا۔"

میں نے غصے سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "تمہاری شبانہ ہے کس کھیت کی مولی؟ اگر تمہاری بیٹی بھول سے میری کسی کہانی میں آنا چاہے گی تو میں اس کا گلا گھونٹ دوں گا۔"

انسپکٹر رحمان علی نے گرج کر کہا۔ "مسٹر شہاب! آپ میرے سامنے شبانہ کا گلا گھونٹ کر اسے مارنے کی دھمکی دے رہے ہیں۔"

"آپ کے یہ درانی صاحب بھی مجھے شوٹ کرنے کی دھمکی دے چکے ہیں۔"

"درانی صاحب اس وقت نشے میں ہیں مگر آپ ہوش و حواس میں ایسا کہہ رہے ہیں۔ میں آپ سے بعد میں نمٹ لوں گا۔ چلئے درانی صاحب........"

چینی صاحب نے کہا۔ "جناب! ہمارے ہاں چینی کی افراط ہے ٹھنڈا پانی پی کر جائیں۔"

مگر وہ گرم ہو کر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد چینی صاحب نے مجھے سمجھایا۔

"شہاب صاحب! کسی کو اس طرح مار ڈالنے کی دھمکی نہیں دینا چاہئے۔ آپ کسی کہانی کے کردار نہیں ہیں۔ حقیقی زندگی میں ایسی دھمکیوں سے مجرمانہ خیالات کو پر لگ جاتے ہیں۔"

میں نے ناگواری سے کہا۔ "آپ صرف مجھے الزام دے رہے ہیں۔ کیا آپ نے نہیں سنا۔ وہ غصہ میں مجھے شہاب کا بچہ کہہ رہا تھا۔"

"اس نے ابنِ شہاب کا صحیح ترجمہ کیا ہے۔ عام فہم زبان میں آپ کو شہاب کا بچہ ہی کہا جائے گا۔"

مجھے ان کی بات پر ہنسی آ گئی۔ دوسرے دن وسیم درانی کا فون آیا میں نے ریسیور اٹھا کر "ہیلو" کہا تو وہ ندامت سے کہنے لگا۔

"مسٹر شہاب! میں اپنے پچھلے دن کے رویہ پر شرمندہ ہوں دراصل میں نے بہت زیادہ پی لی تھی۔ بعد میں، میں نے کہانی کا آخری پیراگراف پڑھا تو مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ میری بیٹی جگنو شبانہ ہر ماہ آپ کی کہانیاں پڑھتی ہے اس نے بھی آپ کی حمایت کی ہے۔"

میں نے کہا۔ "آپ نے اپنی غلطی کا اعتراف کر کے صحیح معنوں میں انسان ہونے کا ثبوت دیا ہے کیونکہ انسان ہی سے غلطی ہوتی ہے اس کا اعتراف کرنا بڑی بات ہے۔"

"میں چاہتا ہوں کہ آج شام کی چائے آپ میری فیملی کے ساتھ پئیں۔ شبانہ کو بہت خوشی ہو گی۔"

"مجھے بھی یقیناً خوشی ہو گی۔" میں نے کہا۔ "مگر افسوس کہ میں چند دنوں تک بہت مصروف رہوں گا۔ آپ کچھ خیال نہ کریں۔ جب بھی فرصت ملے گی میں آپ کو فون پر اطلاع دے کر حاضر ہو جاؤں گا۔"

میں نے اس کا فون نمبر پوچھ کر اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیا۔ یہ سب ایک ماہ پہلے کی باتیں تھیں۔ اب ایک ماہ بعد اس کی بیٹی جگنو شبانہ کا خط میرے نام آیا تھا۔ میں اسے دوبارہ پڑھنے لگا۔ اس نے بڑی بے باکی سے لکھا تھا۔

"آپ کی کہانیاں پڑھتے پڑھتے یوں محسوس کرنے لگی ہوں، جیسے آپ کہانیوں کے رومانی ماحول میں مجھ سے گفتگو کرتے رہتے ہیں۔ آپ اسے میری خوش فہمی سمجھ لیں۔ مگر ہر جوان لڑکی کی طرح مجھے بھی سہانے خواب دیکھنے کا حق ہے۔"

اس کی یہ بے باک تحریر بتا رہی تھی کہ واقعی وہ فلرٹ کرنے والی لڑکی ہے۔ تحریر کی نصف ملاقات میں اس حد تک آگے بڑھ آئی تھی۔ جشنِ نوروز میں نہ جانے اور کتنا آگے کھنچی چلی آتی۔ اگر کوئی خوش آمدید کہنے والی ہو اور اس نے اپنا جغرافیہ بھی بتا دیا ہو تو اپنا دل بھی اس طرف کھنچا چلا جاتا ہے وہاں اس لئے بھی جانا مناسب تھا کہ میں اس کے باپ سے بھی کسی دن آنے کا وعدہ کر چکا تھا۔ 31 دسمبر کی شام کو میں نے وسیم درانی کا فون نمبر ڈائل کیا دوسری طرف سے درانی نے ریسیور اٹھا کر جب میرا نام سنا تو خوشی سے چہک کر کہا۔

"ہیلو مسٹر شہاب! کیسے خوشی کے موقع پر آپ نے یاد کیا ہے۔ آج تو آپ کو ضرور آنا ہو گا۔ یہاں ڈنر پارٹی ہے۔ آج رات بھر جشن منایا جائے گا۔ آپ نہیں آئیں گے تو میں سمجھوں گا کہ آپ نے میری غلطی کو اب تک یاد رکھا ہے۔"

"نہیں درانی صاحب! اب آپ سے مجھے کوئی شکایت نہیں ہے' میں ڈنر کے وقت پہنچ جاؤں گا۔"

"اوہ' تھینکس اے لاٹ۔ میں یہ خوشخبری ابھی اپنے بچوں کو سناتا ہوں۔"

اس نے ریسیور رکھ دیا۔ میں سوچنے لگا کیا درانی کو یہ معلوم نہیں ہے کہ جگنو شبانہ مجھے دعوت نامہ عرف محبت نامہ بھیج چکی ہے؟ شاید یہی بات تھی۔ بیٹی نے باپ کے علم میں لائے بغیر مجھے مدعو کیا تھا۔ میں نے بھی فون پر اس لئے اس دعوت نامہ کا ذکر نہیں کیا کہ اس کی تحریر میں جوانی چٹخارے لے رہی تھی پھر اس نے شرط رکھی تھی کہ میں وہاں پہنچ کر بھی کسی سے اس کا نام نہ پوچھوں۔ خود ہی اسے ایک جاسوس کی طرح تلاش کروں۔ لہٰذا میں اسے تلاش کرنے کے لئے رات کے آٹھ بجے گھر سے نکلنا چاہتا تھا۔ مگر بھلا ہو چینی صاحب کا۔ عین وقت پر پہنچ کر فرمانے لگے۔

"ابھی آپ کہیں نہیں جاسکتے۔ آپ کی اس کہانی میں ایک زبردست غلطی نکل آئی ہے۔ آپ اسے فوراً درست کریں۔ ورنہ پرچہ لیٹ ہو جائے گا۔"

میں نے اس کہانی پر نظرثانی کی تو واقعی ایک جگہ ایسی غلطی کی تھی کہ اسے درست کرنے کے لئے مجھے کتنی ہی جگہ ترمیم و اضافے کرنے پڑے۔ اس کام میں اڑھائی گھنٹے صرف ہو گئے۔ جب میں ساڑھے دس بجے وہاں سے چلنے لگا تو چینی صاحب نے کہا۔

"آپ جشنِ نوروز میں کیسے شریک ہو رہے ہیں۔ آپ کو تو اندھیرے میں بڑا ڈر لگتا ہے۔"

میں بزدل نہیں ہوں۔ لڑنے مرنے کے معاملات میں پیش پیش رہتا ہوں۔ جوڈو کراٹے کے فن سے واقف ہوں کوئی دشمن مقابلے پر آ کر میرے نام شکست نہیں لکھ سکتا۔ مگر اندھیرے میں اس لئے گھبرا جاتا ہوں' بلکہ حواس باختہ ہو جاتا ہوں کہ پتہ نہیں موت کس طرف سے آ رہی ہے۔ بہرحال میں نے چینی صاحب سے پوچھا۔

"جشنِ نوروز میں بھلا اندھیرے کا کیا کام؟ آپ مجھے خواہ مخواہ ڈرا رہے ہیں۔"

"میں ڈرا نہیں رہا ہوں۔ آپ شاید بھول گئے ہیں کہ آج کی رات جہاں بھی جشن منایا جاتا ہے وہاں ٹھیک بارہ بجے رات کو تقریباً بارہ سیکنڈ کے لئے بالکل اندھیرا کر دیا جاتا ہے۔"

میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انہیں دیکھنے لگا۔ مجھے یاد آ گیا تھا کہ ہر سال 31 دسمبر کی رات کو جیسے ہی بارہ کا پہلا گھنٹہ بجتا ہے تمام سوئچ آف ہو جاتے ہیں۔ اس تاریکی میں پچھلا

سال رخصت ہو جاتا ہے پھر بارہواں گھنٹہ بجتے ہی روشنی ہو جاتی ہے۔ نئے سال کا آغاز ہو جاتا ہے۔ ایک ان دیکھی جگنو شبانہ کے تصور میں کھو کر میں نصف شب کے اندھیرے کو بھول گیا تھا۔ اب آزمائش کا وقت آ گیا تھا۔ بچپن سے مجھ میں اندھیرے کا خوف سمایا ہوا تھا مگر وہ اندھیرے میں جگنو کی طرح جلتی بجھتی ہوئی مجھے پیار کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی دکھا رہی تھی۔

"بارہ سیکنڈ کا اندھیرا مجھے ڈرا نہیں سکتا۔" میں چینی صاحب کو جواب دے کر وہاں سے چل پڑا۔ ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے وسیم درانی کی کوٹھی میں پہنچا تو وہاں بڑی چہل پہل نظر آئی۔ کوٹھی کے برآمدے میں وسیم درانی سے ملاقات ہو گئی۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی دیر سے آنے کی شکایت کی۔ میں نے شکایت کا جواب دینے کے بعد اس سے پوچھا۔

"سب سے پہلے آپ یہ بتائیں کہ آپ مسلمان ہو کر انگریزوں کے انداز میں نیو ایئرس ڈے کیوں منا رہے ہیں؟"

اس نے جواب دیا۔ "بھئی بات یہ ہے کہ میں نے اپنی بیگم کے مرنے کے بعد ایک انگریز عورت سے شادی کی تھی۔ وہ بھی مر چکی ہے۔ میری پہلی بیوی سے ایک بیٹی ہے جس کا نام شاہینہ ہے۔ دوسری انگریز بیوی سے ایک بیٹا ہے اور ایک بیٹی ہے۔ بیٹے کا نام نعیم درانی ہے اور بیٹی کا نام تو تم اپنی کہانی میں استعمال کر ہی چکے ہو۔ یعنی جگنو شبانہ۔ میں ابھی ان سے ملا دوں گا۔"

میں نے کہا۔ "آپ کسی کا تعارف مجھ سے نہ کرائیں۔ میں خود ہی ان کو پہچاننے کی کوشش کروں گا۔"

یہ بات میں نے اس لئے کہہ دی کہ مجھے جگنو شبانہ کی شرط پوری کرنا تھی۔ وسیم درانی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یہاں ابھی تم کسی کو نہیں پہچان سکو گے۔ کوٹھی کے اندر سب ہی فینسی ڈریس میں ہیں۔ وہ سب مختلف روپ بدلے ہوئے ہیں۔ کیا تم ایسی پارٹی میں پہلی بار شریک ہو رہے ہو؟ بھئی تم کسی کو نہیں پہچان سکو گے۔"

"میں پہچان لوں گا۔ میرا خیال ہے کہ آپ اپنی انگریز بیوی کی یاد تازہ کرنے کے لئے یہ جشن منا رہے ہیں؟"

"ہاں یہی سمجھ لو۔ دراصل شبانہ کو اپنی ممی سے بڑی محبت تھی میں اس کی دلجوئی کے لئے انگریزوں کے تہوار بھی منا لیتا ہوں۔ بہرحال تم اندر چلو۔ بارہ بجتے ہی والے

ہیں۔"

میں نے شرارت سے پوچھا۔ "کس کے بارہ بجنے والے ہیں؟"

"آنے والے وقت کو کون جانتا ہے؟ کون کہہ سکتا ہے کہ کس کے بارہ بجنے والے ہیں؟" اس نے بڑی گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے یہ بات کہی تھی۔ مجھے وہ تاریکی یاد آگئی جو ٹھیک بارہ بجے مسلط ہونے والی تھی۔ میں فوراً ہی کوٹھی کے اندر روشنی میں چلا آیا۔ وہاں عجوبے نظر آرہے تھے۔ کسی نے خرگوش کا ماسک چہرے پر چڑھا رکھا تھا۔ کوئی گھوڑا بنا ہوا تھا۔ کوئی شہزادی کے روپ میں تھی اور کوئی شیطان بن کر اپنے سر پر دو سینگ اگائے پیچھے سے اپنی دم ہلا رہا تھا۔ کسی نے ماسک چڑھا رکھا تھا اور کوئی نقاب پہنے ہوئے تھی' میں ہر ایک کو توجہ سے دیکھنے لگا کیونکہ مجھے جگنو کی تلاش تھی' مگر جگنو کو روشنی میں تلاش کرنا نادانی ہے شاید اسی لئے اچانک ہی بارہ کا پہلا گھنٹہ بج گیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے روشنیوں نے دم توڑ دیا اور چاروں طرف گہری تاریکی چھا گئی۔

میں ایک دم سے لڑکھڑا کر قریبی دیوار سے جا لگا۔ ہر سُو ایسا گھور اندھیارا تھا جیسے جیتے جی مجھے قبر میں اتار کر مٹی برابر کر دی گئی ہو اور اب انتظار تھا کہ منکر نکیر آنے ہی والے ہوں گے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کوئی دشمن اندھیرے میں کس طرف سے موت بن کر آئے گا؟ کچھ اسی طرح کے اندیشے مجھے خوفزدہ کر دیتے ہیں لیکن یہ خوف زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا اس بڑے سے کمرے میں مردوں اور عورتوں کے گیت گانے کی ملی جلی آوازیں آنے لگیں۔

ایک ایک کر کے بارہ گھنٹے بجتے جا رہے تھے۔ پچھلا سال ہر گھنٹے کی ضرب کھا کر پیچھے ہٹ رہا تھا۔ وہ گا رہے تھے کہ پرانے سال کی آخری رات دم توڑ رہی ہے اور نیا سال طلوع ہو رہا ہے۔ مجھے اپنے قریب کہیں کسی کے سسکنے کی آواز سنائی دی۔ وہ سسکی تھی' یا پرانے سال کی آخری ہچکی تھی۔ یہ بات گیت کے شور میں واضح نہ ہو سکی۔ گھڑی بھی بولتی جا رہی تھی۔ ٹن .... ٹن .... ٹن .... آٹھویں ٹن کی آواز پر کوئی اچانک ہی مجھ پر آگرا۔ میں نے فوراً ہی دونوں بازوؤں میں اسے سنبھال لیا۔ نویں ٹن کی آواز پر اس کے گداز بدن نے مجھے سمجھایا کہ ٹکرانے والی کوئی نوجوان دوشیزہ ہے۔

اندھیرے کا خوف دور ہو گیا۔ یہ سوچ کر خوشی ہوئی کہ تاریکی میں ایسے خوبصورت حادثے بھی ہو جاتے ہیں۔ ایک ہی سُر سنگیت میں نئے سال کی خوش آمدید کہا جا رہا ہے۔ دسویں ٹن کی آواز پر میں نے اس دوشیزہ کے سر کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کی۔

"ہیلو' کیا جگنو بھٹکتی ہوئی خود ہی میرے پاس آگئی ہے۔"

وہ میرے بازوؤں میں مجھ سے لگی کھڑی تھی۔ اس طرح میں اس کے خط کے مطابق اندازہ کر سکتا تھا کہ اس کا قد درمیانہ ہے۔ آغوش میں رکھ کر پتہ چلا کہ صحت بھی اچھی ہے۔ گیارہویں ٹن کی آواز پر میں نے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ چہرے سے نقاب اتار کر اندازہ کیا کہ صورت بھی بری نہیں ہے۔

"میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ تم جگنو شبانہ ہو۔ شرط ہار کر خاموش نہ رہو........."

اس وقت بارہ کا آخری گھنٹہ بجا۔ روشنی کا ایک جھماکا ہوا۔ پہلے چند ساعت کے لئے آنکھیں چندھیا گئیں۔ میں نے بازوؤں کی گرفت ذرا ڈھیلی کر دی۔ تاکہ کوئی ہمیں ہم آغوشی کی حالت میں نہ دیکھے۔ مگر گرفت ڈھیلی ہوتے ہی وہ ڈھیلی ہو کر فرش پر گر پڑی۔ میرے بارہ بج گئے۔

میں نے روشنی میں دیکھا' میرے قدموں کے پاس ایک حسین دوشیزہ بے حس و حرکت پڑی ہوئی ہے۔ اس کے دیدے پھیل کر ساکت ہو گئے تھے۔ پچھلے سال کے آخری ٹن کی آواز کے ساتھ وہ اندھیرے میں گزر گئی تھی اور اب نئے سال کی روشنی میں محض ایک لاش بن کر فرش پر پڑی ہوئی تھی۔

ابھی عورتیں گیت گا رہی تھیں۔ اب چیخ کر دور بھاگنے لگیں۔ مرد اس لاش کے قریب آنے لگے۔ ایک شخص نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ "ٹھہریئے' آپ میں سے کوئی جگنو کے قریب نہ جائے۔ میں یہاں کا فیملی ڈاکٹر ہوں۔ مجھے دیکھنے دیجئے۔"

ڈاکٹر قریب آکر جگنو پر جھک گیا۔ اب تمام لوگ مجھے گھور کر دیکھ رہے تھے۔ میں بھی پریشانی سے ایک ایک کا منہ تکنے لگا۔ اب سب ہی کے چہروں سے نقاب اتر گئی تھی اور اندھیرے میں جگنو کی نقاب کشائی میں نے کی تھی۔ آہ! میں جس حسینہ کی لو لگائے وہاں تک گیا تھا وہ موت سے لو لگا کر میرے بازوؤں میں آئی تھی۔ اس نے اپنا وعدہ نبھایا تھا کہ اگر میں اسے پہچاننے میں ناکام رہا تو وہ خود میرے پاس چلی آئے گی۔ واہ یوں بھی وعدہ نبھایا جاتا ہے۔

اتنے میں وسیم درانی مہمانوں کی بھیڑ کو چیرتا ہوا آنے لگا۔ "کہاں ہے میری بچی؟ کیا ہو گیا میری جگنو کو؟"

وہ بیٹی کی لاش کے سامنے آکر ٹھٹک گیا۔ چند ساعتوں تک وہ یوں ساکت ہو کر اسے

دیکھنے لگا جیسے اس کی موت کا یقین نہ آ رہا ہو۔ پھر چیخ مار کر فرش پر جھک گیا' شاید وہ بیٹی سے لپٹ کر رونا چاہتا تھا مگر ڈاکٹر نے فوراً ہی آگے بڑھ کر اسے دونوں ہاتھوں سے روکتے ہوئے کہا۔

"رک جائیے درانی صاحب! یہ قتل کا کیس ہے آپ اسے ہاتھ نہ لگائیں۔ کسی نے اسے گلا گھونٹ کر مارا ہے۔"

یہ سنتے ہی تمام لوگ پھر ایک بار مجھے گھور کر دیکھنے لگے۔ ایک نوجوان نے میری طرف انگلی اٹھا کر کہا۔

"میں نے روشنی ہوتے ہی اس شخص کو دیکھا' یہ جگنو کو فرش پر ڈال رہا تھا۔"

"یہ تو میں نے بھی دیکھا ہے۔" ایک ادھیڑ عمر کے آدمی نے کہا۔ "جگنو اس سے لگی ہوئی تھی۔ روشنی ہوتے ہی اس نے فوراً اسے فرش پر گرا دیا۔"

دو عورتیں بھی چشم دید گواہ بن گئیں۔ درانی نے لاش کے پاس سے اٹھ کر اچانک ہی میری گردن دونوں ہاتھوں سے دبوچ لی۔

"بدمعاش' کمینے' آخر تم نے اپنی دھمکی پوری کر دی۔ میری معصوم بچی کو گلا گھونٹ کر مار ڈالا' میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

میں نے اس کے دونوں ہاتھوں کو ایک معمولی سا جھٹکا دے کر اپنی گردن چھڑا لی۔

"ہوش میں آئیے درانی صاحب! آپ بغیر سوچے سمجھے مجھ پر الزام لگا رہے ہیں۔ اسے میں نے نہیں کسی اور نے ہلاک کیا ہے۔ دانشمندی یہ ہے کہ آپ فوراً اپنے مہمانوں کی گنتی کریں اور اس ہال کے تمام دروازے بند کرا دیں۔ اگر قاتل کو فرار ہونے کا موقع نہیں ملا ہے تو وہ یقیناً ابھی ہمارے درمیان موجود ہو گا۔"

کچھ لوگوں نے میری تائید کی' فوراً ہی دروازے بند ہونے لگے۔ ایک نوجوان نے درانی سے کہا۔

"ڈیڈی! آپ مہمانوں کی گنتی کریں' میں انسپکٹر رحمان علی کو فون کرتا ہوں۔"

درانی کو ڈیڈی کہنے والا اس کا بیٹا نعیم درانی ہی ہو سکتا تھا۔ میں نے اسے مخاطب کیا۔

"ٹھہریئے نعیم صاحب! آپ اس علاقے کے تھانے کے انچارج کو فون کریں۔ انسپکٹر رحمان علی کا اس علاقے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"مجھے تمہارے مشورے کی ضرورت نہیں ہے۔" نعیم نے غصہ سے کہا۔

"میں صحیح مشورہ دے رہا ہوں۔ اس وقت میری پوزیشن کمزور ہے اگر تمہارا

رشوت خور انسپکٹر آئے گا تو پھر میں بھی یہاں سے پولیس کے کسی دیانتدار آفیسر کو فون کروں گا۔ میں تمہیں سمجھا رہا ہوں کہ قانون کے کسی ذمہ دار افسر کے آنے تک آپس میں جھگڑا نہ بڑھاؤ۔"

ڈاکٹر نے میری تائید کی۔ "ٹھیک ہے نعیم! اصولاً اس شخص کی بات مان لینا چاہئے۔ تم اس علاقے کے تھانیدار کو فون کرو۔" پھر اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "مگر یہ ہے کون؟ اب سے پہلے میں نے اسے یہاں کی کسی پارٹی میں نہیں دیکھا۔"

وسیم درانی نے نفرت اور غصے سے کہا۔ "ایسے لوگوں کو اونچی سوسائٹی میں پوچھا نہیں جاتا یہ بن بلائے یہاں چلا آیا ہے۔"

"شیم' شیم.........." سب لوگ مجھے شرم دلانے لگے۔

میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "درانی صاحب! آپ کو جھوٹ بولتے ہوئے شرم آنا چاہئے۔ آج دوپہر کو آپ نے مجھے فون پر مدعو کیا تھا اور آپ نہیں جانتے' آپ سے پہلے جگنو نے بھی اس پارٹی میں آنے کے لئے مجھے ایک خط لکھا تھا۔"

درانی نے مجھے گھونسہ دکھاتے ہوئے کہا۔ "اب تم میری مظلوم اور مقتول بیٹی کو بدنام کر رہے ہو کہ وہ تمہیں خط بھی لکھا کرتی تھی۔"

"کہاں ہے وہ خط؟" ڈاکٹر نے گھور کر مجھے دیکھا تو میرے ذہن کو ہلکا سا جھٹکا لگا۔ اس کی آنکھوں میں جیسے بجلی بھری تھی۔ ہپناٹائز کرنے والوں کی آنکھیں اس طرح شاک پہنچاتی ہیں۔ مگر میں اپنی قوتِ ارادی سے سنبھل کر بولا۔

"وہ خط میرے پاس محفوظ ہے۔ میں اپنے قانونی مشیر کے ذریعہ اس تحریر کو عدالت تک پہنچاؤں گا۔"

"تم خود کو بہت بڑا قانون دان سمجھتے ہو؟" ڈاکٹر نے غرا کر پوچھا۔

درانی نے کہا۔ "یہ شخص جرم و سزا کی کہانیاں لکھتا ہے.........." وہ نفرت بھرے لہجے میں میرے نام اور میرے کام کے متعلق بتانے لگا۔

میں نے کہا۔ "درانی صاحب! آپ وقت ضائع کر رہے ہیں آپ کو سب سے پہلے مہمانوں کی گنتی کرنا چاہئے۔"

درانی نے کہا۔ "میں باتوں کے دوران ہر ایک کو دیکھتا جا رہا ہوں اور پہچانتا جا رہا ہوں۔ میرے تمام معزز مہمان یہاں موجود ہیں۔"

"کیا ایک بھی کم نہیں ہے؟" میں نے پوچھا۔

ڈاکٹر نے کہا۔ "صرف شاہینہ موجود نہیں ہے لیکن میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ اپنی خوابگاہ میں ہو گی۔ وہ میری مریضہ ہے۔ میں اسے اچھی طرح سمجھتا ہوں۔"

ایک مہمان عورت نے مداخلت کی۔ "لیکن میں نے شاہینہ کو یہاں کچھ دیر پہلے دیکھا تھا۔ اندھیرا ہونے سے چند سیکنڈ پہلے وہ میرے قریب سے گزرتی ہوئی جگنو کی طرف بڑھتی جارہی تھی۔ وہ چند قدم آگے بڑھی تھی کہ اندھیرا ہو گیا۔"

شاہینہ اور جگنو شبانہ آپس میں سوتیلی بہنیں تھیں۔ ٹھیک ایسے وقت جبکہ متوقع تاریکی پھیلنے والی تھی' وہ جگنو کی طرف کیوں جارہی تھی؟ میں نے اس مہمان عورت سے کہا۔

"معزز خاتون! میں آپ کا شکرگزار ہوں۔ یہاں جس ہستی کی کمی ہے' آپ نے اس کے متعلق چشم دید بات کہی ہے۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ ٹھیک تاریکی پھیلتے وقت مس شاہینہ اپنی سوتیلی بہن کی طرف کیوں بڑھ رہی تھیں؟"

اس وقت تک نعیم درانی فون کرنے کے بعد واپس آگیا تھا اور میری باتیں سن رہا تھا' اس نے جواباً کہا۔

"کیا تم اپنا الزام شاہینہ کے سر تھوپنا چاہتے ہو؟ پولیس والے اس بات کا یقین نہیں کریں گے کہ شاہینہ جیسی نازک سی لڑکی بارہ کا گھنٹہ بجنے کے دوران جگنو جیسی صحت مند لڑکی کا گلا آسانی سے گھونٹ سکتی ہے۔"

ڈاکٹر نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "یہ صاحب اپنی کہانیوں میں نازک لڑکیوں سے قتل کرواتے ہوں گے۔ اب شاہینہ کو بھی اپنی کہانی کا کردار بنانا چاہتے ہیں۔"

درانی نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "ٹھہرو' ٹھہرو۔ کسی بھی بات کو طنز میں یا مذاق میں نہ اڑاؤ۔ میں اپنی لاڈلی بیٹی کے قاتل تک پہنچنا چاہتا ہوں۔ اس کے لئے میں نے مسٹر شباب پر الزام لگایا ہے کیونکہ یہ میرے سامنے جگنو کا گلا گھونٹنے کی دھمکی دے چکے ہیں۔ اب ایک خاتون کی چشم دید گواہی سے پتہ چلتا ہے کہ شاہینہ بھی اندھیرے میں جگنو کے قریب موجود تھی' میں شاہینہ کا دشمن نہیں ہوں۔ وہ بھی میرا خون ہے۔ وہ بھی میری لاڈلی بیٹی ہے مگر میں اس پہلو کو نظرانداز نہیں کروں گا کہ وہ تاریکی میں اپنی سوتیلی بہن کے قریب کیوں گئی تھی؟"

پھر درانی نے اپنے بیٹے نعیم کو مخاطب کیا۔ "نعیم! تم جگنو کے سگے بھائی ہو لیکن تم اپنی سگی بہن کے بارے میں یہ غلط بات کہہ رہے ہو کہ وہ صحت مند تھی۔ یہ تو موت کے

بعد بھی بظاہر صحت مند نظر آرہی ہے لیکن یہ اختلاج قلب کی مریضہ تھی۔ کیوں ڈاکٹر کیا میں جھوٹ کہہ رہا ہوں۔"

"آپ درست کہہ رہے ہیں۔" ڈاکٹر نے اعتراف کیا۔

درانی نے کہا۔ "اس مرض نے میری جگنو کے دل کو بہت کمزور بنا دیا تھا۔ یہ بات ڈاکٹر کو معلوم ہے کہ وہ ایک بار خواب دیکھ کر ڈر گئی تھی اور دہشت زدہ ہو کر اس نے اپنی سانس روک لی تھی۔ بڑی مشکل سے اس کی سانسوں کو بحال کیا گیا........."

نعیم نے قطع کلامی کی۔ "ڈیڈی! آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جگنو اندر سے بہت کمزور تھی۔ اس کا گلا گھونٹنے کے لئے بہت زیادہ قوت کی ضرورت نہیں تھی۔ مرد ہو یا عورت کوئی بھی اسے گلا دبوچنے کی دہشت سے مار سکتا تھا اور وہ اسی طرح ماری گئی ہے۔"

ایک ادھیڑ عمر آدمی نے آگے بڑھ کر ناگواری سے وسیم درانی کو مخاطب کیا۔

"بھائی صاحب! کیا آپ میری بھانجی پر الزام لگا رہے ہیں؟ آپ کیسے باپ ہیں؟"

پتہ چلا کہ وہ ادھیڑ عمر کا آدمی شاہینہ کا ماموں تھا۔ اس کی صحت قابلِ رشک تھی اچھا خاصا باڈی بلڈر نظر آتا تھا اس کے چہرے سے اور آنکھوں سے ایسی درندگی نمایاں تھی جیسے وہ اپنی بھانجی شاہینہ کو الزام سے بچانے کے لئے ابھی اپنے بہنوئی وسیم درانی کا گلا گھونٹ دے گا۔ درانی نے اپنے سالے یعنی شاہینہ کے ماموں سے کہا۔

"سجاد! تم اس کے ماموں ہو۔ مگر میں اس کا باپ ہوں۔ تم جانتے ہو کہ میں شاہینہ اور جگنو دونوں کو دو آنکھوں کی طرح عزیز رکھتا آیا ہوں لیکن میں کہہ چکا ہوں کہ ایک خاتون کی چشم دید گواہی کو نظرانداز نہیں کروں گا۔ میں مسٹر شباب اور شاہینہ دونوں کا محاسبہ کروں گا۔"

سجاد ماموں نے کہا۔ "تو پھر ڈاکٹر جمشید اور نعیم کا بھی محاسبہ کرنا چاہئے۔ میں نے ان دونوں کو بھی جگنو کے قریب دیکھا ہے کیا میری چشم دید گواہی قابلِ قبول ہو گی؟"

"ضرور ہو گی۔" ڈاکٹر جمشید نے کہا۔ "سانچ کو کیا آنچ؟ میں اس وقت سے اب تک جگنو کے قریب ہوں۔"

نعیم نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "بے شک میں بھی جگنو سے زیادہ دور نہیں تھا لیکن میں اس کا سگا بھائی ہوں۔ میں اس کے لئے مر سکتا ہوں۔ اسے مارنے کا کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا۔"

سجاد ماموں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "برخوردار نعیم! سگے رشتوں میں ہی زیادہ دشمن نکل آتے ہیں۔ جب فیصلے کی گھڑی آئے گی تو قانون سگے بھائی کا لحاظ نہیں کرے گا۔"

میں بڑی خاموشی سے ان کی باتیں سن رہا تھا اور یہ سن کر ذرا اطمینان ہو رہا تھا کہ جگنو کی موت کے وقت صرف میں ہی نہیں بلکہ شاہینہ' ڈاکٹر جمشید اور نعیم درانی بھی .... آس پاس موجود تھے۔ میں تنہا معتوب نہیں تھا۔ اب اپنے طور پر بھی یہ کھوج لگا سکتا تھا کہ میری مردہ محبوبہ کا قاتل کون ہے؟ میں نے طویل خاموشی کے بعد سب سے پہلے سجاد ماموں کو مخاطب کیا۔

"سجاد صاحب! اس سلسلے میں یہ سوچنا ہو گا کہ جگنو کے قتل سے کس کو فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ درانی صاحب کروڑ پتی ہیں' اب جگنو کے حصے کی جائیداد بھی شاہینہ اور نعیم کے درمیان تقسیم ہو جائے گی۔ ان دونوں کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچے گا۔ جگنو کی موت سے ڈاکٹر جمشید کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ یہ ابھی میں نہیں کہہ سکتا۔ یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا لیکن آپ کی ساری محبت اور ہمدردیاں صرف اپنی بھانجی کے ساتھ ہیں۔ شاہینہ کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانے کے لئے آپ کے ہاتھ بھی جگنو کی گردن تک پہنچے ہوں گے۔ یہ ہال زیادہ بڑا نہیں ہے۔ جس وقت اندھیرا ہوا اس وقت آپ بھی جگنو سے زیادہ دور نہیں تھے۔"

سجاد ماموں نے بڑی فراخدلی سے مسکرا کر کہا۔ "اچھی بات ہے تمہاری الزام تراشی پر مجھے غصہ نہیں آئے گا۔ مفروضہ قاتلوں کی فہرست میں پانچواں نام میرا بھی لکھ لو۔"

اتنے میں انسپکٹر رحمان وہاں پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ انٹیلیجنس کے ایک نامور سراغرساں کمال کامرانی کو دیکھ کر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی' میں اس کی طرف بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ اس نے فوراً ایک اجنبی کے انداز میں کہا۔

"رحمان علی صاحب! کہاں ہے وہ کمبخت ابنِ شہاب؟ ذرا میں بھی تو اسے دیکھوں۔"

میں نے گھور کر اسے دیکھا۔ وہ میرا بہت ہی بے تکلف دوست تھا۔ اس کی اس ادا نے مجھے سمجھا دیا کہ وہ فی الحال اجنبی بن کر رہنا چاہتا ہے۔ میں نے نعیم درانی سے کہا۔

"تم نے مجھے دھوکہ دیا ہے۔ تمہیں قانون کے مطابق اس علاقے کے تھانیدار کو فون کرنا چاہئے تھا۔"

نعیم مسکرا کر انسپکٹر رحمان علی کو دیکھنے لگا۔ رحمان نے کمال کامرانی سے کہا۔

"یہی ہیں وہ حضرت ابنِ شہاب۔" پھر اس نے مجھے مخاطب کیا۔ "مسٹر شہاب! میں جانتا ہوں کہ جرم و سزا کی کہانیاں لکھنے والے قانون کو سمجھتے ہیں۔ آپ کے ساتھ اسی علاقے کا تھانیدار بھی میری آمد پر اعتراض کر سکتا ہے مگر یہ ناچیز بھی قانون کو کچھ سمجھتا ہے۔ لہٰذا میں نے پولیس کا جھگڑا ہی ختم کر دیا۔ انٹیلیجنس کے مسٹر کمال کامرانی کو ساتھ لے آیا ہوں' اب یہ کیس براہ راست انٹیلیجنس والوں کے ہاتھ میں رہے گا' اب فرمایئے کیا اعتراض کی کوئی گنجائش ہے؟"

میں نے کہا۔ "فی الحال تو نہیں ہے مگر میں گنجائش نکال لوں گا یہ بات سمجھ میں آ رہی ہے کہ مجھ پر ایک قتل کا الزام تھوپنے کے لئے آپ' نعیم اور درانی صاحب میرے خلاف محاذ بنا رہے ہیں۔ آپ پہلے ہی مجھے کہہ چکے تھے کہ آپ بعد میں مجھ سے نمٹ لیں گے اور آپ نمٹنے کے لئے بالکل تیار ہو کر آئے ہیں۔"

اس وقت کمال کامرانی جگنو کی لاش پر جھکا ہوا اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر جمشید نے اپنے طور پر جو معائنہ کیا تھا اس کے متعلق کامرانی کو بتا رہا تھا۔ کامرانی میں یوں تو بہت سی خوبیاں ہیں ان میں سے ایک خوبی یہ ہے کہ وہ ایک طرف دیکھتا ہے دوسری طرف باتیں کرتا ہے اور ساتھ ہی چاروں طرف کی باتیں بھی سنتا رہتا ہے۔ بہت کم لوگوں کا دماغ بیک وقت چاروں طرف متوجہ رہتا ہے' اس نے سر اٹھا کر پوچھا۔

"رحمان صاحب! کیا آپ نے مسٹر شہاب کو بعد میں نمٹنے کی دھمکی دی تھی؟"

انسپکٹر نے کہا۔ "مسٹر شہاب نے بھی جگنو کا گلا گھونٹنے کی دھمکی دی تھی اور یہ حضرت اپنی دھمکی پر عمل کر چکے ہیں۔"

"یہ جھوٹ ہے۔" میں نے کہا۔ "جگنو کی موت سے پہلے میں اسے صورت شکل سے نہیں پہچانتا تھا۔ ثبوت کے طور پر جگنو کا خط میرے پاس موجود ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ وہ میرے لئے اجنبی ہے چونکہ میری تحریری صلاحیتوں کی قدرداں ہے۔ اس لئے مجھے اس پارٹی میں مدعو کر رہی ہے۔ یہاں ہم پہلی بار ملنے والے تھے مگر اس سے پہلے ہی کوئی قاتل ہمارے درمیان آ گیا۔"

کامرانی نے مجھ سے کہا۔ "آپ وہ خط اپنے پاس محفوظ رکھیں میں بعد میں دیکھوں گا۔ ابھی یہ بتائیں کہ آپ نے جگنو کا گلا گھونٹنے کی دھمکی کیوں دی تھی؟"

میں نے جواب دیا۔ "مجھے درانی صاحب نے اشتعال دلایا تھا' انہوں نے دھمکی دی

تھی کہ اگر میں نے آئندہ کسی کہانی میں جگنو شبانہ کا نام استعمال کیا تو یہ مجھے شوٹ کر دیں گے۔"

کامرانی نے مسکرا کر کہا۔ "کمال ہے یہاں تو دھمکیوں کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ پہلے درانی صاحب نے مسٹر شباب کو شوٹ کرنے کی دھمکی دی' مسٹر شباب نے جگنو کو مار ڈالنے کی دھمکی دی۔ پھر رحمان صاحب' بعد میں نمٹنے کے لئے تیار ہو گئے۔ آپ تینوں حضرات کے تحریری بیان میں ان دھمکیوں کا ذکر ضرور ہونا چاہئے۔"

انسپکٹر رحمان علی نے چونک کر پوچھا۔ "کامرانی صاحب کیا آپ میرا بھی بیان لیں گے؟ میں تو قانون کا محافظ ہوں۔ اگر کوئی مجرمانہ انداز میں میرے سامنے کسی کو مارنے کی دھمکی دے تو میں اسے اس حرکت سے باز رکھنے کی دھمکی دے سکتا ہوں۔"

کامرانی نے کہا۔ "چلئے آپ اسی انداز میں اپنا بیان لکھ دیں اور یہ بھی لکھیں کہ آپ یہاں کیوں موجود ہیں۔ آپ کے جسم پر وردی نہیں ہے' آپ اس علاقے کے تھانیدار نہیں ہیں۔ آپ کو اس پارٹی میں مدعو بھی نہیں کیا گیا ہے' پھر آپ یہاں اچانک کیسے پہنچ گئے؟"

نعیم نے جلدی سے آگے بڑھ کر کہا۔ "میں نے رحمان صاحب کو مدعو کیا ہے۔ یہ ہمارے مہمان ہیں۔"

"شاباش!" کامرانی نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "مسٹر نعیم! آپ نے بارہ بج کر بیس منٹ پر رحمان صاحب کو پارٹی میں آنے کی دعوت دی تھی یا فون کے ذریعہ قتل کی اطلاع پہنچائی تھی؟"

نعیم فوراً ہی فیصلہ نہ کر سکا کہ کون سا جواب صحیح ہو سکتا ہے' رحمان علی نے جواب دیا۔

"نعیم نے مجھے دعوت بھی دی تھی اور قتل کی اطلاع بھی پہنچائی تھی۔ اس میں اعتراض کی کوئی بات ہے؟"

"ہاں' اب مسٹر نعیم اپنے بیان میں لکھیں گے کہ انہوں نے قریبی تھانیدار کو اطلاع کیوں نہیں دی اور ایسے وقت جبکہ سگی بہن قتل کر دی گئی ہے' انہوں نے آپ کو جشنِ نوروز کی دعوت دی ہے کیا ایسے وقت بھی یہ جشن منا رہے تھے؟ یا خاص طور پر مسٹر شباب کو قتل کے الزام میں پھانسنے کی کوشش کی جا رہی ہے؟"

رحمان علی نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا۔ کامرانی نے فوراً ہی ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"ٹھہریئے' میں اپنی باتوں کے دوران مداخلت پسند نہیں کرتا۔ مسٹر نعیم نے آپ تک قتل کی اطلاع پہنچائی اور آپ سیدھے میرے پاس پہنچ گئے اور میرے ساتھ یہاں پہنچنے تک یہ تاثر دیتے رہے کہ مسٹر شباب جیسے لوگ کہانیوں کی آڑ میں مجرمانہ زندگی گزارتے ہیں۔ میں نے اس وقت نہیں بتایا تھا۔ اب بتا رہا ہوں کہ یہ شباب کا بچہ میرے بچپن کا یار ہے۔"

میں اسے گھور کر دیکھنے لگا۔ وہ کمبخت بھی ابنِ شباب کا ترجمہ پیش کر رہا تھا۔ (مجھے اپنا نام بدلنا ہی پڑے گا) اس نے کہا۔

"رحمان صاحب! آپ نے مجھے یہاں لا کر غلطی کی ہے۔ آپ کا مقصد پورا نہیں ہو گا۔ جس طرح آپ کو یقین ہے کہ نعیم صاحب اپنی بہن کے قاتل نہیں ہو سکتے اسی طرح میں شباب کو بے گناہ سمجھتا ہوں اور میں یہ ثابت کر کے رہوں گا۔"

پھر اس نے میری طرف پلٹ کر کہا۔ "ہاں شباب! مجھے امید ہے کہ تم نے یہاں کچھ ابتدائی کارروائیاں کی ہوں گی؟"

میں نے جواب دیا۔ "ہاں' میں نے سب سے پہلے یہاں کے دروازے بند کرائے' پھر مہمانوں کی گنتی کرائی' باہر سے آنے والے تمام مہمان موجود ہیں۔ صرف درانی صاحب کی بڑی صاحبزادی شاہینہ اس قتل کے بعد ہی غائب ہو گئی۔ ڈاکٹر کا بیان ہے کہ شاہینہ ان کی مریضہ ہے اور اس وقت اپنی خوابگاہ میں موجود ہے۔"

میں نے یہ بھی بتایا کہ وہاں ہماری موجودہ معلومات کے مطابق مفروضہ قاتلوں کی فہرست میں پانچ نام ہیں۔ پہلا نام تو میرا اپنا ہے' دوسری شاہینہ ہے' تیسرا ڈاکٹر جمشید' چوتھا نعیم درانی اور پانچویں سجاد ماموں صاحب ہیں۔ کامرانی نے میری رپورٹ سننے کے بعد اپنے محکمہ کے فوٹوگرافر اور فنگر پرنٹ ایکسپرٹ کو فون کیا۔ اس کے بعد درانی کے ساتھ شاہینہ کی خوابگاہ کی طرف جانے لگا۔ ڈاکٹر جمشید نے پوچھا۔

"کیا میں شاہینہ کے ڈاکٹر کی حیثیت سے آپ کے ساتھ چل سکتا ہوں؟"

"شاہینہ آپ کی ضرورت محسوس کرے گی تو آپ کو بلا لیا جائے گا۔" کامرانی روکھا سا جواب دے کر چلا گیا۔

ڈاکٹر جمشید ناگواری سے زیرِ لب بڑبڑانے لگا۔ میں نے پوچھا۔

"ڈاکٹر! شاہینہ کا مرض کیا ہے؟"

"میں تمہارے سوال کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھتا۔"

ڈاکٹر کا جواب سن کر سجاد ماموں نے کہا۔ "میں بتاتا ہوں۔ میری بھانجی کو بے خوابی کا مرض ہے۔ پہلے اسے خواب آور گولیاں کھلائی جاتی تھیں مگر اس کی صحت گرنے لگی پھر بھائی صاحب (درانی) کو پتہ چلا کہ ڈاکٹر جمشید جدید سائنٹیفک طریقوں سے ہپناٹزم کے ذریعہ پرانے سے پرانے مرض کا کامیابی سے علاج کرتے ہیں۔ لہٰذا ان کی خدمات حاصل کی گئیں اب یہ تنویمی عمل کے ذریعہ شاہینہ کو بڑی آسانی سے سلا دیتے ہیں۔ صبح اس کے اٹھنے کا جو وقت مقرر کرتے ہیں اس وقت وہ بیدار ہو جاتی ہے۔"

میں بڑی دلچسپی سے ڈاکٹر جمشید کو دیکھنے لگا۔ ہپناٹزم کے متعلق مطالعہ کی حد تک میری معلومات بہت وسیع ہیں لیکن اس وقت میرے سامنے اس علم کا ایک تجربہ کار عامل کھڑا ہوا تھا۔ میں اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ مگر وہ مجھ سے بدظن تھا۔ میرے کسی سوال کا جواب نہیں دینا چاہتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد کامرانی نے واپس آ کر کہا۔

"شہاب! جو خط تمہیں جگنو نے لکھا تھا وہ مجھے دکھاؤ۔"

میں نے اپنی جیب سے وہ خط نکال کر اسے دے دیا۔ اس نے وہ خط لے کر دیکھا پھر کہا۔

"ڈاکٹر جمشید، مسٹر سجاد اور مسٹر نعیم! آپ سب یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایک انگریز ماں کی بیٹی جگنو شبانہ اردو بول سکتی تھی مگر اردو پڑھنا لکھنا نہیں جانتی تھی۔ یہ خط جگنو نے نہیں لکھا تھا۔ یہاں جب اس خط کا ذکر آیا تھا تو آپ لوگوں نے شہاب کی یہ غلط فہمی دور کیوں نہیں کی۔ جگنو نہ تو اردو زبان کے رائٹر کی کہانیاں پڑھ سکتی تھی اور نہ ہی اسے خط لکھ سکتی تھی۔"

نعیم نے جواب دیا۔ "میں اسی وقت کا انتظار کر رہا تھا۔ اب تو شہاب کی خوش فہمی ختم ہو گئی ہو گی۔"

ڈاکٹر جمشید نے کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ شہاب نے یہاں مہمان بن کر آنے کے لئے خود ہی یہ خط اپنے نام لکھا ہو۔"

"یا پھر کسی لڑکی سے لکھوایا ہو۔" سجاد نے کہا۔

"ابھی پتہ چل جاتا ہے۔" کامرانی نے خط کھول کر کہا۔ "آپ ایک ایک کر کے میرے پاس آئیں اور اس خط کو پڑھیں۔ ہو سکتا ہے کہ آپ میں سے کوئی اس تحریر کو پہچانتا ہو۔"

سب سے پہلے نعیم نے اس خط کو پڑھا پھر ناگواری سے واپس کرتے ہوئے بولا۔

"اونہہ' یہ تحریر تو ہزاروں میں پہچانی جا سکتی ہے۔ یہ خط شاہینہ نے لکھا ہے۔"

میں چونک کر نعیم کا منہ تکنے لگا۔ سجاد ماموں نے غصے سے کہا۔

"تم جھوٹ بولتے ہو۔ کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ شاہینہ نے جگنو کے نام سے خط لکھ کر شہاب کو یہاں پھانسنے کے لئے بلایا ہے؟ لاؤ' میں اس تحریر کو پہچان لوں گا۔"

اس نے کامرانی کے ہاتھ سے وہ خط لے کر دیکھا تو حیرت سے اس کا منہ کھل گیا۔ وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔

"یہ' یہ تحریر شاہینہ کی تحریر سے ملتی ہے مگر میری بھانجی ایسی بے غیرت نہیں ہے۔ وہ ایسا محبت نامہ کبھی نہیں لکھ سکتی۔"

کامرانی نے کہا۔ "مگر آپ کی شاہینہ میرے دوست سے دلچسپی رکھتی ہے۔ ابھی خوابگاہ میں شہاب کا نام سن کر بستر سے اٹھ گئی تھی۔ یہاں آ کر اسے دیکھنا چاہتی تھی۔ میں نے اسے یہ کہہ کر روک دیا کہ خود ہی شہاب کو بلا کر لے آتا ہوں۔ آؤ شہاب! اب ہم شاہینہ کو یہ خط دکھائیں گے اگر یہ اس کی تحریر ہے تو اسے اعتراف کر لینا چاہئے۔"

ہم وہاں سے جانا چاہتے تھے۔ اتنے میں شاہینہ خود ہی اپنے باپ کے ساتھ آ گئی۔ اس نے کامرانی سے کہا۔

"سوری' میں آپ کے مشورے کے مطابق خوابگاہ میں انتظار نہ کر سکی۔ مسٹر شہاب کہاں ہیں؟"

کامرانی نے میرا تعارف کرایا۔ وہ مجھ سے مل کر خوشی کا اظہار کرنے لگی۔ پھر وہ میری کہانیوں کے متعلق باتیں کرنا چاہتی تھی۔ مگر کامرانی نے کہا۔

"مس شاہینہ! آپ بعد میں شہاب سے باتیں کر لیجئے گا۔ ابھی یہ خط دیکھ کر بتائیں۔ کیا آپ نے اسے لکھا ہے؟"

وہ خط کھول کر پڑھنے لگی۔ پڑھنے کے دوران اس کی آنکھوں سے حیرانی ظاہر ہو رہی تھی۔ رخساروں پر ہلکی سی سرخی بھی جھلک رہی تھی کیونکہ رومانی انداز میں خط لکھا گیا تھا۔ اس نے ہچکچاتے اور شرماتے ہوئے انداز میں میری جانب دیکھا پھر کامرانی سے کہا۔

"یہ تحریر ہو بہو میری ہے مگر میں نے یہ خط نہیں لکھا ہے۔"

"آپ اسے دوبارہ پڑھیں۔" کامرانی نے کہا۔ "اس پر ذرا غور کریں اس کے بعد بھی انکار ہو تو ابھی میرے سامنے ایسا ہی ایک خط لکھیں میں دونوں خطوط اپنے محکمہ کے تحریر شناس کے پاس بھیجوں گا۔"

"میں اسے دس بار پڑھ کر بھی یہی کہوں گی کہ یہ میری تحریر کی کامیاب نقل ہے۔ میں ابھی اپنے بیڈ روم سے ایسا ہی ایک خط لے کر آتی ہوں۔"

"ڈاکٹر جمشید نے کہا۔ "شاہینہ میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "کامرانی یہ خط میرے نام آیا ہے اور یہ میرے ہی ہاتھ میں رہے گا۔ اگر مس شاہینہ کو اعتراض نہ ہو تو میں اسے ڈکٹیٹ کرا سکتا ہوں۔"

"مجھے خوشی ہو گی۔" شاہینہ نے خوش ہو کر کہا۔ "آیئے میرے ساتھ۔"

میں اس کے ساتھ خوابگاہ کی طرف جانے لگا۔ اس بھیڑ سے نکلنے کے بعد میں نے اسے توجہ سے دیکھا۔ خط کی تحریر کے مطابق وہ بھی درمیانے قد کی تھی۔ صحت تو بس اچھی ہی تھی مگر صورت بہت اچھی تھی۔ بار بار دیکھنے کو جی چاہتا تھا۔ وہ میری کہانیوں کی تعریف کر رہی تھی اور میں ایک شاعر کی طرح داد وصول کر رہا تھا۔ میں نے اس کے موضوع سے ہٹ کر سوال کیا۔

"جگنو کا دشمن کون ہو سکتا ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "آپ پولیس آفیسر نہیں ہیں۔ ایسی باتوں میں وقت ضائع نہ کریں۔ میں آپ سے اور بھی بہت سی باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

"میں بھی بہت سی باتیں کروں گا مگر اس وقت میرے سامنے پھانسی کا پھندہ ہے مجھے قتل کے الزام میں پھانسنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ آپ بھی مشکوک ہیں' اندھیرا ہونے سے چند سیکنڈ پہلے آپ کو جگنو کی طرف جاتے دیکھا گیا ہے۔"

"دیکھنے والے درست کہتے ہیں لیکن اندھیرا ہوتے ہی میں اپنی خوابگاہ میں واپس آ گئی تھی۔ سب لوگ مل کر ایسی بے سُری آواز میں گا رہے تھے کہ جی الجھنے لگا۔ میں وہاں ٹھہر نہ سکی۔ ویسے میں اس کی سوتیلی بہن ہوں۔ مجھ پر کتنے ہی الزامات تراشے جا سکتے ہیں۔ آپ پر شبہ کرنے والے احمق ہیں۔ اس خط سے ثابت ہو جائے گا کہ آپ کو دھوکے سے یہاں بلا کر پھانسنے کی کوشش کی گئی ہے۔"

"ہاں یہ خط مجھے بہت سہارا دے رہا ہے۔"

ہم خوابگاہ میں پہنچ گئے تھے۔ وہ میز کے سامنے ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ پھر کاغذ قلم نکال کر بولی۔

"اب آپ اس کیس کی باتیں نہ کریں مجھے الجھن ہوتی ہے' چلئے خط لکھوایئے۔"

میں نے خط کھول کر کہا۔ "اس خط میں مجھے "جناب ابنِ شباب صاحب" کہہ کر

مخاطب کیا گیا ہے۔ اگر آپ سچ مچ لکھتیں تو کس طرح مخاطب کرتیں۔"

وہ سر جھکا کر مسکراتی ہوئی بولی۔ "میں اپنے انداز میں مخاطب کروں گی لیکن شرط یہ ہے کہ میرے لکھنے کے دوران آپ یہ خط نہ پڑھیں ورنہ میں نہیں لکھ سکوں گی۔"

"اچھی بات ہے' میں نہیں پڑھوں گا۔ آپ لکھنا شروع کریں۔"

وہ قلم اٹھا کر کاغذ پر جھک گئی پھر کچھ لکھنے کے بعد کہا۔

"میں مخاطب کر چکی ہوں۔ اب آگے لکھایئے۔"

میں خط کا مضمون پڑھنے لگا۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر لکھنے لگی۔ میں اس سے کچھ فاصلے پر کھڑا ہوا تھا۔ جب خط مکمل ہو گیا تو وہ کاغذ قلم چھوڑ کر اٹھ گئی۔ اس نے کن انکھیوں سے مجھے مسکراتے ہوئے دیکھا پھر دوسری طرف منہ پھیر کر کھڑی ہو گئی۔ میں اس کا لکھا ہوا خط اٹھا کر پڑھنے لگا۔

"میرے اور صرف میرے شباب!

اب آپ میرے لئے اجنبی نہیں رہے۔ یوں تو آپ چند منٹ پہلے میرے سامنے آئے ہیں مگر کہانیوں کی صورت میں آپ ہمیشہ میرے ہاتھوں میں اور میری نگاہوں کے سامنے رہے۔ میں ایسے ماحول کی پروردہ ہوں جہاں لڑکیاں اپنے والدین کے سامنے بھی کھل کر اپنی پسند کا اظہار کرتی ہیں اسی لئے میں بغیر کسی ہچکچاہٹ کے یہ خط لکھ رہی ہوں اور میرا خیال ہے کہ بس اتنا ہی لکھنا کافی ہے۔

میں دوسرا خط تفتیش کے سلسلے میں کامرانی صاحب کے لئے لکھ رہی ہوں۔

فقط آپ کی اور صرف آپ کی شاہینہ درانی۔"

وہ خط پڑھتے وقت میرا دل خوشی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ حسینہ جو منہ پھیرے کھڑی ہوئی تھی وہ مختصر سے اعتراف نامہ کے بعد سر سے پاؤں تک میری بن گئی تھی۔ میں نے میز کی طرف دیکھا۔ وہاں ایک اور خط لیٹر پیڈ کے نیچے دبا ہوا نظر آیا۔ جو تحریر شناسی کے لئے لکھا گیا تھا۔ میں نے محبت نامہ کو تہہ کر کے جیب میں رکھ لیا پھر آگے بڑھ کر اپنے دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ دیئے۔ وہ میری قربت سے سمٹنے لگی تو میں نے اسے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

بھلا ہو مغربی تہذیب کا' جو ہمارے ہاں کی اونچی سوسائٹی میں رچ بس گئی ہے۔ اس سوسائٹی کی لڑکیاں پہلی ہی ملاقات میں گھل مل جاتی ہیں۔ وہ بھی پہلی ملاقات میں مل رہی

تھی اور گھل رہی تھی۔ ہم سے کچھ فاصلے پر دوسرے کمرے میں اس کی بہن کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ یہ غور کرنے کا مقام ہے کہ مُردہ تہذیب کے لوگ مُردوں کی موجودگی میں بھی رومانس کر لیتے ہیں۔ میں نے پوچھا۔

"پھر کب ملاقات ہو گی؟"

وہ میرے ہونٹوں کے سائے میں ہانپتی ہوئی بولی۔ "جب چاہو چلے آنا۔ میرے کمرے کا دروازہ پائیں باغ کی طرف کھلتا ہے۔ وہ ہمیشہ تمہارے انتظار میں کھلا رہے گا۔"

"اب ہمیں چلنا چاہئے کامرانی انتظار کر رہا ہو گا۔"

اس کی آنکھیں نشے سے بھیگ رہی تھیں۔ وہ واپس نہیں جانا چاہتی تھی۔ مگر حالات سے مجبور ہو کر خوابگاہ کی تنہائی سے نکلنا پڑا۔ اس سے ذرا الگ ہو کر چلتے وقت مجھے اس کی بے حسی سمجھ میں آئی۔ جگنو سے اس کا سوتیلا رشتہ تھا۔ تاہم دونوں ایک باپ کی اولاد تھیں۔ شاہینہ کا فرض تھا کہ وہ بہن کی موت پر افسوس کا اظہار کرتی مگر وہ میری محبت کے گن گا رہی تھی۔ وہ جگنو سے ایسی لاتعلق تھی جیسے جگنو کسی کہانی میں قتل کی گئی ہو جسے پڑھ کر بھلا دیا گیا ہو۔

بڑے ہال میں کامرانی ایک صوفے پر بیٹھا ہوا باری باری سب کے تحریری بیانات لے رہا تھا۔ فوٹوگرافر اور فنگر پرنٹ ایکسپرٹ اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ میں نے جگنو اور شاہینہ دونوں کے نام سے لکھے ہوئے خطوط کامرانی کے حوالے کر دیئے۔ پھر مجھے اور شاہینہ کو بھی اپنا اپنا بیان لکھنا پڑا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر جمشید کا بیان قابلِ ذکر تھا۔ کامرانی نے ڈاکٹر سے اپنے سوالات کے جواب لکھوائے۔

"اچھا ڈاکٹر! جیسا کہ شاہینہ کو بے خوابی کا مرض ہے آپ اسے کس طرح سلا دیتے ہیں؟"

"میں تنویمی عمل کے ذریعہ اسے ٹرانس میں لاتا ہوں۔ اسے آرام سے سونے کی ہدایت کرتا ہوں۔ یہ میری معمول بننے کے بعد میری ہدایات پر بلاچوں وچرا عمل کرتی ہے اور چپ چاپ سو جاتی ہے۔"

"پھر اسے بیدار کرنے کا عمل کیا ہوتا ہے؟"

ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "پہلے یوں ہوتا تھا کہ شاہینہ کو سلاتے وقت میں صبح اس کی بیداری کا وقت مقرر کر دیتا تھا' یہ ٹھیک اسی وقت بیدار ہو جاتی تھی۔ ایک ہفتہ پہلے گیارہ بجے رات کو شاہینہ کی آنٹی کی ٹرنک کال آئی۔ جسے شاہینہ نہ سن سکی کیونکہ اسے صرف

میں ہی ٹرانس کی حالت سے واپس لا سکتا تھا۔ میں نے سختی سے منع کیا تھا کہ کوئی میری غیر موجودگی میں اسے نیند سے نہ جگائے ورنہ اس کے ذہن پر بُرا اثر پڑے گا۔"

یہ کہہ کر وہ شاہینہ کو دیکھنے لگا۔ شاہینہ بھی اسے دیکھ رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ ان کی نظریں ملتے ہی شاہینہ کی آنکھیں خمار آلود ہو گئی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کی آنکھوں میں نیند کے سائے رینگنے لگے ہیں۔ ڈاکٹر نے اس پر سے اپنی نظریں ہٹاتے ہوئے کہا۔

"اس ٹرنک کال کے بعد شاہینہ نے کہا کہ آئندہ یہ اتنی گہری نیند نہیں سوئے گی اسے کچھ اس طرح سلایا جائے کہ اسے گھر کا کوئی فرد رات کے کسی حصے میں بیدار کرنا چاہے تو اس کے دماغ پر بُرا اثر نہ پڑے۔ مسٹر کامرانی آپ شاید نہیں جانتے کہ ہم کسی کو کس طرح ٹرانس میں لاتے ہیں۔ میں مثال کے طور پر آپ کو سمجھاتا ہوں۔"

وہ پھر ایک بار شاہینہ کو دیکھنے لگا۔ شاہینہ صوفہ کی پشت سے ٹیک لگا کر آرام سے بیٹھ گئی۔ ڈاکٹر نے کہا۔

"میں شاہینہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتا ہوں کہ تم میری طرف دیکھ رہی ہو۔ میری طرف دیکھ رہی ہو۔ تمہاری آنکھیں کسی دوسری طرف متوجہ نہیں ہوں گی۔ تمہارے کان صرف میری آواز سن رہے ہیں تم اس دنیا کی کوئی دوسری آواز نہیں سن رہی ہو۔ اب تمہاری آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہو رہی ہیں۔ تم اب سکون سے سوتی رہو گی۔ ٹھیک صبح چھ بجے تمہاری آنکھ کھل جائے گی۔ اگر صبح چھ بجے سے پہلے تمہارے سرہانے فون کی گھنٹی بجے گی تو تم نہایت سکون سے بیدار ہو جاؤ گی.........."

ڈاکٹر جمشید کی باتیں ختم ہونے سے پہلے ہی میں اپنی جگہ سے اچھل کر کھڑا ہو گیا اور شاہینہ کے قریب جا کر اسے غور سے دیکھنے لگا وہ صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے ڈاکٹر کی باتیں سنتے سنتے سو گئی تھی۔ میری طرح دوسرے بھی اس پر جھک کر اسے دیکھنے لگے۔ میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"کیا یہ ممکن ہے؟ کیا شاہینہ اتنی جلدی اتنی آسانی سے ٹرانس میں آ جاتی ہے؟"

تمام لوگ ڈاکٹر کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ وہ ایک ایزی چیئر پر اطمینان سے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"آپ لوگ میری معمولہ کے پاس سے ہٹ جائیں۔ ملازم سے کہئے کہ وہ ٹیلیفون شاہینہ کے قریب لا کر رکھ دے۔ مسٹر شہاب میں آپ کے سوال کا جواب دیتا ہوں۔ یہ

درست ہے کہ کسی کو ٹرانس میں لے آنا آسان سی بات نہیں ہے اس کے لئے باقاعدہ اہتمام کرنا پڑتا ہے کسی کو اپنا معمول بنانے کے لئے پہلے تو تنہائی لازمی ہے پھر یہ کہ اسے آرام سے کہیں لٹایا جاتا ہے لیکن شاہینہ پر یہ پہلا عمل نہیں ہے۔ اس کے لئے یہ .... معمول ہو گیا ہے۔ یہ میرے تنویمی عمل کے انداز سے اس قدر آشنا ہو چکی ہے اس طرح متاثر ہو چکی ہے کہ اب عام طور سے گفتگو کے دوران میں سونے کی بات کرتا ہوں تو میری وہی تنویمی عمل والی مخصوص آواز اور میرا مخصوص لہجہ اس کے ذہن پر مسلط ہو جاتا ہے اور یہ دیکھتے ہی دیکھتے سو جاتی ہے۔ جیساکہ اس وقت سو رہی ہے۔ اب کوئی صاحب یا صاحبہ اس کی خوابگاہ میں جا کر وہاں اس کے فون کا ریسیور اٹھائیں اور یہاں کے فون نمبر پر رِنگ کریں۔"

سجاد ماموں فوراً ہی اپنی بھانجی کی خوابگاہ کی طرف چلے گئے۔ ڈاکٹر جمشید نے کہا۔

"میں نے شاہینہ کی درخواست پر یہ فون کا سلسلہ شروع کیا ہے اب رات کے کسی حصہ میں کوئی کسی ضرورت کے تحت اسے اٹھانا چاہتا ہے تو اس کی خوابگاہ کا فون نمبر ڈائل کرتا ہے۔ فون کی گھنٹی بجتے ہی یہ بڑے سکون سے بیدار ہو جاتی ہے پھر فون پر باتیں کرتی ہے۔"

کامرانی نے پوچھا۔ "کیا فون پر باتیں کرنے کے بعد اسے دوبارہ نیند آتی ہے؟"

"نہیں۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "اس کے بعد یا تو یہ صبح تک جاگتی رہتی ہے یا پھر مجھ سے فون پر رابطہ قائم کرتی ہے۔ میں اسی فون پر اسے سونے کی ہدایت کرتا ہوں۔ یہ ریسیور کان سے لگائے میری آواز سنتے سنتے دوبارہ سو جاتی ہے۔"

اتنے میں فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ ہم سب شاہینہ کی طرف دیکھنے لگے۔ پہلے تو وہ نیند میں ذرا سا کسمسائی۔ پھر اس کی آنکھیں آہستہ آہستہ کھلنے لگیں۔ اس نے نیند کے خمار میں ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھایا۔ اس کے بعد بوجھل سی آواز میں بولی۔

"ہیلو .... کون؟ سجاد ماموں۔ اوہ' اچھا کیا میں ڈرائنگ روم میں ہوں؟"

وہ ایک دم سے چونک کر اپنے اطراف دیکھنے لگی۔ ڈاکٹر نے قریب آ کر اس کے ہاتھ سے ریسیور لیتے ہوئے کہا۔

"ڈونٹ بی وری۔ تم میری باتیں سن کر سو گئی تھیں' اب بیدار ہو گئی ہو۔"

ایسا کہتے وقت ڈاکٹر اسے گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا اور وہ نظریں چرا رہی تھی۔ ڈاکٹر کے دیکھنے کا انداز مجھے کچھ عجیب سا' بلکہ پُراسرار سا لگا۔ اس بات کو کامرانی نے بھی

نوٹ کیا' مگر اس وقت ہم خاموش رہے۔

☆======☆======☆

تیسرے دن میں دوپہر تک سوتا رہا۔ شام کو کامرانی کے پاس پہنچا تو اس نے بتایا کہ دونوں خطوط کی شناخت ہو چکی ہے۔ اس کے محکمہ کے تحریر شناس نے رپورٹ لکھی ہے کہ دونوں خطوط ایک ہی ہستی کے تحریر کردہ ہیں۔ یعنی جگنو شبانہ کے نام سے لکھا ہوا خط بھی شاہینہ نے ہی لکھا تھا۔ مگر وہ انکار کر رہی تھی۔ ہم دونوں وسیم درانی کے آفس میں پہنچے۔ وہ دفتر سے نکلنے ہی والا تھا۔ کامرانی نے کہا۔

"میرے چند سوالوں کا جواب دیتے جائیں۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے کہ شاہینہ نے جگنو کے نام سے شہاب کو خط کیوں لکھا؟ کیا آپ نے شاہینہ کے سامنے یہ ذکر چھیڑا تھا کہ شہاب نے جگنو کا گلا گھونٹنے کی دھمکی دی تھی؟"

"جی ہاں۔" درانی نے کہا۔ "میں جگنو کو شہاب کی یہ دھمکی سنا رہا تھا' اس وقت شاہینہ اور ڈاکٹر دونوں وہاں موجود تھے۔"

"یعنی آپ کے صاحبزادے نعیم اور آپ کے سالے سجاد صاحب نے گلا گھونٹنے کی بات نہیں سنی تھی۔"

درانی نے جواب دیا۔ "مجھ سے نہیں سنی تھی۔ مگر ہو سکتا ہے کہ شاہینہ نے اپنے سجاد ماموں کو اور جگنو نے اپنے بھائی نعیم کو یہ بات بتائی ہو۔ میں اپنی جگنو کے قاتل تک پہنچنے کے لئے شاہینہ اور نعیم کو بھی نظرانداز نہیں کروں گا۔"

"یقیناً آپ کو سختی سے اپنی دوسری اولاد کا بھی محاسبہ کرنا چاہئے۔ جگنو کا قاتل آپ کے گھر ہی میں ہے۔ کسی نے شہاب کی دھمکی سے فائدہ اٹھا کر جگنو کا گلا گھونٹا ہے۔ اس مقصد کے لئے اسے جگنو کے نام سے خط لکھ کر آپ کے ہاں آنے کی دعوت دی۔ اب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ خط لکھنے والی شاہینہ ہے۔"

میں نے کہا۔ "کامرانی! ہو سکتا ہے کہ شاہینہ نے دانستہ وہ خط نہ لکھا ہو بلکہ اسے ٹرانس میں لانے کے بعد وہ خط اس سے لکھوایا گیا ہو۔"

یہ نکتہ واقعی قابلِ غور تھا۔ شاہینہ کو ٹرانس میں لانے والا اپنی مرضی کے مطابق اس سے خط لکھوا سکتا تھا۔ ہپناٹائز کرنے والے مجرم پہلے اسی طرح کسی کو اپنا معمول اور تابع فرمان بناتے ہیں۔ پھر اس سے کہیں چوری کراتے ہیں یا کسی کو قتل کرا دیتے ہیں۔ بیچارہ معمول جب تنویمی عمل سے آزاد ہو کر نارمل ہو جاتا ہے تو اسے یہ یاد نہیں آتا کہ وہ کتنے

سنگین جرم کا مرتکب ہو چکا ہے۔

یہی بات شاہینہ پر صادق آ سکتی تھی۔ اسے ٹرانس میں لانے کے بعد اس سے خط لکھوایا گیا تھا۔ اب نارمل حالت میں اسے یاد نہیں آ رہا تھا اسی لئے وہ اس خط کی تحریر کو اپنی تحریر ماننے سے انکار کر رہی تھی۔ قسمیں کھا چکی تھی کہ وہ خط اس نے نہیں لکھا ہے۔

کامرانی نے کہا۔ "اس پہلو سے ڈاکٹر جمشید مجرم نظر آتا ہے لیکن اسے مجرم سمجھنے کے لئے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ جگنو کی موت سے اسے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟"

وسیم درانی چند لمحات تک کچھ سوچتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔ "مجھے اس سلسلے میں آپ سے کوئی بات نہیں چھپانا چاہئے۔ شاہینہ اور ڈاکٹر ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر نے مجھ سے شاہینہ کا رشتہ مانگا تھا۔ میں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ شادی ایک سال بعد ہو سکتی ہے۔ ٹالنے کی وجہ یہ ہے کہ شاہینہ مستقل مزاج لڑکی نہیں ہے اس کے فیصلے جلد ہی بدل جاتے ہیں۔ ڈاکٹر جمشید سے پہلے وہ ایک نوجوان کو چاہتی تھی۔ میں نے شاہینہ سے کہہ دیا کہ اگر وہ ایک سال تک اپنی پسند پر قائم رہے گی تو ڈاکٹر سے اس کی شادی کر دی جائے گی۔"

میں نے اپنا سر کھجاتے ہوئے سوچا۔ یہ لڑکی تو عجب تھالی کا بینگن ہے۔ بے چارے ڈاکٹر کو معلوم نہیں تھا کہ اب اس کی محبوبہ میری طرف جھک رہی ہے۔ درانی نے کہا۔

"میں چھ ماہ سے دیکھ رہا ہوں۔ شاہینہ سنجیدگی سے ڈاکٹر کو پسند کر رہی ہے۔ اب میں یہ بھی سوچ سکتا ہوں کہ ان دونوں کی محبت کے پیچھے جرم پرورش پا رہا ہے۔ اگر جگنو کے بعد نعیم بھی ان کے راستے سے ہٹ جائے تو میری تمام دولت اور جائداد شاہینہ کو ملے گی۔ شاہینہ کو ملنے کا مطلب یہ ہو گا کہ ڈاکٹر کو یہ سب کچھ ملے گا۔"

درانی کی بات سن کر مجھے دکھ پہنچا۔ کیونکہ وہ اپنی بیٹی کو یعنی میری نئی نویلی محبوبہ کو قانون کی نظر میں بہت زیادہ مشکوک بنا رہا تھا۔ میں نے ذرا ناگواری سے پوچھا۔

"درانی صاحب! اپنے صاحبزادے نعیم کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

"میں نعیم پر بھی شبہ کرتا ہوں۔" درانی نے کہا۔ "اس کی عادتیں بہت بگڑ گئی ہیں۔ شراب نوشی اور عیاشی میں مگن رہتا ہے۔ میرا دیا ہوا جیب خرچ اس کے لئے کافی نہیں ہوتا اس لئے اکثر ہیرا پھیری کرتا رہتا ہے۔ ایک بار جگنو کی ضرورتیں بتا کر مجھ سے بہت بڑی رقم لے گیا۔ ایک بار شاہینہ سے کہا کہ ڈاکٹر جمشید کو پانچ ہزار کی ضرورت ہے مگر وہ

اس سے مانگتے ہوئے اور اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے شرماتا ہے۔ یہ سن کر شاہینہ نے نعیم کو پانچ ہزار دے دیئے تاکہ وہ ڈاکٹر کے ہاتھوں میں پہنچ جائیں۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دوسروں کا نام لے کر اپنا مقصد پورا کرتا ہے۔ اس کی اس عادت کے پیش نظر یہ سوچا جا سکتا ہے کہ شہاب کو جو دعوتی خط بھیجا گیا تھا اس میں نعیم نے جگنو شبانہ کا نام لکھوایا تھا۔ تحریر شاہینہ کی، نام جگنو کا اور مفاد اپنا۔ نعیم ایسی ہی ہیرا پھیری کا عادی ہے۔"

یہ بات بھی دل کو لگ رہی تھی۔ نعیم جائیداد کا تنہا وارث بننے کے لئے اپنی سگی بہن جگنو کو ہلاک کر سکتا تھا اور شاہینہ کو بھی کسی وقت اپنے راستے سے ہٹا سکتا تھا۔ مگر کامرانی نے اعتراض کیا۔

"ہیرا پھیری کرنے والا نعیم وہ خط شاہینہ سے کیسے لکھوا سکتا ہے؟ وہ تو یہ عمل نہیں جانتا ہے۔"

درانی نے کہا۔ "ہاں وہ نہیں جانتا ہے، مگر میں کہہ چکا ہوں کہ اپنی معصوم بیٹی کے قاتل تک پہنچنے کے لئے میں اپنے خون کے رشتوں پر بھی شبہ کروں گا۔ سجاد بھی اپنی بھانجی شاہینہ کے مفاد کے لئے جگنو کو ہلاک کر سکتا ہے۔ شاہینہ اپنے سجاد ماموں کو بہت چاہتی ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ سجاد اسے بیوقوف بنا کر اس سے بڑی بڑی رقمیں وصول کرتا ہے۔ اگر تنہا شاہینہ کو میری دولت مل جائے گی تو وہ بہت زیادہ فائدہ میں رہے گا۔"

وسیم درانی اپنے شبہات کا اظہار کرنے کے بعد یہ کہہ کر رخصت ہو گیا کہ وہ بہت ضروری کام سے کہیں جا رہا ہے۔ میں اور کامرانی شاہینہ سے ملنے اس کی کوٹھی میں پہنچے تو پتہ چلا کہ وہ نعیم کے ساتھ کہیں گئی ہے۔ شاہینہ کا یہ رویہ سمجھ میں نہیں آیا کہ اس نے سوتیلی بہن کی موت پر ہمدردی کا اظہار تک نہیں کیا تھا مگر سوتیلے بھائی کے ساتھ تفریح کے لئے نکل گئی تھی۔ کامرانی نے مجھ پر چوٹ کی۔

"آج کل کی محبوبائیں اپنے عاشقوں کا انتظار نہیں کرتیں۔ تم افسوس نہ کرو۔"

میں نے کہا۔ "میں بحیثیت عاشق خود ہی لیٹ ہو گیا۔ کل کا تمام دن وکیل اور کورٹ کے چکر میں گزر گیا۔ تب جا کر اپنی ضمانت منظور ہوئی ہے۔ پچھلی رات کہانی لکھنے میں گزر گئی۔ آج کا دن تم نے لے لیا ورنہ شاہینہ بڑے پیار سے کہہ چکی تھی کہ میرے انتظار میں اس کی خوابگاہ کا دروازہ کھلا رہے گا۔"

"پھر تو تم نے بڑی غلطی کی ہے، تمہیں کل رات اس کے پاس جانا چاہئے تھا۔ تم محبوبانہ انداز میں اس سے بہت کچھ اگلوا سکتے ہو۔"

"کوئی بات نہیں' آج رات اس کی خوابگاہ میں ضرور جاؤں گا۔"

کامرانی نے اپنی جیب سے ایک پاکٹ کیسٹ ریکارڈر نکال کر مجھے دیتے ہوئے کہا۔

"اسے اپنی جیب میں رکھو' شاہینہ کی گفتگو کے وقت اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر اسے آن کر دینا۔ یہ بہت حساس ریکارڈر ہے۔ دو گز کی دوری سے بھی آواز کو واضح طور سے ریکارڈ کر لیتا ہے۔"

میں نے اسے لے کر جیب میں رکھ لیا۔ مگر اس رات بھی شاہینہ کی قربت نصیب نہ ہوئی۔ میں گیارہ بجے رات کو اس کی قربت کے لئے کوٹھی میں پہنچا تو وہاں کامرانی' ڈاکٹر جمشید' شاہینہ' سجاد اور نعیم موجود تھے۔ کامرانی نے یہ چونکا دینے والی خبر سنائی کہ وسیم درانی قتل کر دیا گیا ہے۔

وسیم درانی کی لاش سمندر کے ساحل پر اس طرح پائی گئی تھی کہ وہ ریت میں سینے تک دفن کیا گیا تھا۔ اس کے دونوں بازو ریت پر پھیلے ہوئے تھے اور سر ایک طرف ڈھلکا ہوا تھا۔ سمندر کی لہریں تیزی سے آتی تھیں اس پر سے گزرتی تھیں۔ پھر واپس چلی جاتی تھیں۔ وہ منظر بتا رہا تھا کہ وہ کس طرح بار بار سانسیں روک کر سمندر کا کھارا پانی پی پی کر مرا ہو گا۔ اسے اتنی اذیتیں دے کر کیوں مارا گیا تھا؟ کون ایسا سنگدل قاتل ہو سکتا ہے؟

میری نظریں ڈاکٹر جمشید' سجاد' نعیم اور شاہینہ پر پھسلنے لگیں۔ نعیم اس وقت کامرانی کے قریب بیٹھا اپنی صفائی پیش کر رہا تھا۔

"میں شاہینہ کے ساتھ سمندر کے ساحل تک گیا تھا۔ میں نے وہاں سی ویو کارنر میں چائے پینے کی خواہش ظاہر کی مگر شاہینہ خاموش تھی۔ تمام راستے اس پر عجیب سی خاموشی طاری تھی۔ میں نے سوچا کہ یہ چائے نہیں پینا چاہتی ہے۔ اس لئے میں نے اسے کار میں بیٹھ کر انتظار کرنے کے لئے کہا۔ پھر ہوٹل کے اندر چلا گیا۔ جب میں چائے پی کر باہر آیا تو وہاں کار نہیں تھی' شاہینہ بھی نظر نہیں آئی۔ میں بہت دیر تک اس کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ پھر ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر یہاں آ گیا۔"

کامرانی نے پوچھا۔ "تمہیں کس نے اطلاع دی کہ تمہارے ڈیڈی ہلاک کر دیئے گئے ہیں؟"

نعیم نے جواب دیا۔ "میں یہاں کوٹھی میں آ کر شاہینہ کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔ ایک گھنٹے بعد یہ واپس آ گئی۔ میں اس کی خوابگاہ میں بیٹھا ہوا تھا اس نے آتے ہی اپنے بستر کے سرے پر بیٹھ کر کہا۔

"سی ویو کارنر سے دس میل دور مشرق کی سمت سمندر کے ساحل پر ڈیڈی کی لاش پڑی ہے۔ پولیس کو فون کر دو۔ میرے سونے کا وقت ہو چکا ہے۔ مجھے ڈسٹرب نہ کرنا۔"

میں حیرانی سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بستر پر لیٹ گئی' میں نے اس سے پوچھا کہ یہ سی ویو کارنر سے دس میل دور کیوں گئی تھی؟ مگر جواب دینے کی بجائے اس کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہو گئیں۔ پھر یہ گہری نیند میں ڈوب گئی۔ تب میری سمجھ میں آیا کہ یہ تمام راستے خاموش کیوں تھی؟ اس پر گہری سنجیدگی کیوں طاری تھی؟ اس لئے کہ اس پر تنویمی عمل کا اثر تھا۔ یہ ڈاکٹر کی معمولہ بننے کے بعد میرے ساتھ ساحل پر گئی تھی اور مجھے چھوڑ کر وہاں سے دس میل دور چلی گئی تھی اور یہاں تنہا واپس آ کر ڈیڈی کی موت کی خبر سنانے کے بعد سو گئی تھی۔"

نعیم کا بیان سننے کے بعد کامرانی نے ڈاکٹر جمشید کو گھور کر دیکھا' ڈاکٹر نے پریشان ہو کر کہا۔

"شاہینہ کو کچھ یاد نہیں ہے کہ تنویمی اثر کے دوران اس پر کیا گزری ہے یہ نہیں جانتی کہ کب نعیم کے ساتھ گئی تھی؟ اور کہاں اپنے ڈیڈی کی لاش دیکھی تھی؟"

کامرانی نے پوچھا۔ "آپ نے کس مقصد کے تحت آج سہ پہر کو شاہینہ پر تنویمی عمل کیا تھا؟"

"میں نے نیک مقصد کے تحت ایسا کیا تھا کیونکہ یہ پچھلی رات جاگتی رہی تھی۔ میں اسے سلانا چاہتا تھا مگر اس نے یہ کہہ کر سونے سے انکار کر دیا کہ اسے ایک ٹرنک کال کا انتظار ہے۔"

شاہینہ میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کی نظریں کہہ رہی تھیں کہ اسے کسی ٹرنک کال کا نہیں بلکہ میرا انتظار تھا۔ میں نے وعدہ کیا تھا مگر مصروفیت کے باعث میرا وعدہ وفا نہ ہوا۔

ڈاکٹر کہہ رہا تھا۔

"آج سہ پہر کو میں پھر شاہینہ کے پاس آیا۔ یہ ایک ناول پڑھ رہی تھی۔ اسے ادھورا چھوڑ کر سونا نہیں چاہتی تھی۔ میں نے سمجھایا کہ اس طرح مسلسل جاگنے سے بے خوابی کا مرض اور بڑھ جائے گا۔ اسے اب ضرور سو جانا چاہئے۔ میرے ضد کرنے پر اس نے کہا۔

"ناول بہت دلچسپ ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تنویمی عمل کے بعد بھی میں اس ناول کو پڑھ سکوں۔" ہاں یہ تنویمی عمل کے بعد بھی پڑھ سکتی تھی۔ مگر اس عمل کے اثر

سے آزاد ہونے کے بعد ناول کا پڑھا ہوا باقی حصہ بھول جاتی۔ مگر میں نے یہ بات شاہینہ کو نہیں بتائی میں اس کی بھلائی کے لئے اسے سلانا چاہتا تھا۔ یہ بہت آہستہ آہستہ پڑھتی ہے۔ ادھورا ناول ختم کرنے کے لئے اسے تین گھنٹے لگ جاتے۔ میں اتنی دیر تک یہاں بیٹھ نہیں سکتا تھا لہٰذا میں نے تنویمی عمل کے دوران اسے ہدایت کی۔

"تم ابھی سو جاؤ گی۔ آدھ گھنٹے بعد تمہاری آنکھ کھلے گی۔ پھر تم سرہانے سے ناول اٹھا کر پڑھتی رہو گی۔ ٹھیک تین گھنٹے کے بعد ناول ختم ہو یا نہ ہو تم خود بخود سو جاؤ گی۔"

میری ہدایات کے مطابق جب یہ سو گئی تو میں مطمئن ہو کر یہاں سے چلا گیا۔ مجھے نہیں معلوم ہے کہ یہ آدھ گھنٹے بعد بیدار ہو کر ناول پڑھتی رہی یا تین گھنٹے کے لئے کسی کے ساتھ باہر چلی گئیں۔ کامرانی صاحب! میں تو ابھی آپ کی کال پر آیا ہوں اور یہ ساری باتیں سن رہا ہوں۔"

سجاد نے کہا۔ "میری بھانجی کے خلاف بہت بڑی سازش کی جا رہی ہے۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ اسے سلانے کے بعد اس کی نیند چرائی جاتی ہے۔ یہ بات کھلی کتاب کی طرح سامنے آ گئی ہے کہ اسے معمولہ بنا کر' اسے غافل بنا کر ڈاکٹر اس کی غفلت سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔"

"تم بکواس کر رہے ہو۔" ڈاکٹر جمشید نے غصے سے کہا۔ "میں شاہینہ کو دل و جان سے چاہتا ہوں۔ میں کبھی کسی غلط مقصد کے لئے اسے تنویمی عمل کے ذریعہ آلۂ کار نہیں بنا سکتا۔ کیوں شاہینہ! کیا تم میرے بارے میں ایسا سوچتی ہو؟"

"نہیں' کبھی نہیں.........." شاہینہ نے انکار میں سر ہلایا۔

سجاد نے کہا۔ "شاہینہ! تم اس کی محبت میں اندھی ہو گئی ہو۔ تم کیا جانو کہ تمہارے معمولہ بن جانے کے بعد کون تمہارا دوست ہوتا ہے اور کون دشمن؟"

میں نے تائید کی۔ "سجاد صاحب درست کہہ رہے ہیں۔ شاہینہ تم سے نیند کی حالت میں پہلے خط لکھوایا گیا۔ دوسری بار تمہارے ڈیڈی کی لاش کے پاس تمہیں ساحل پر پہنچایا گیا۔ اس طرح قاتل یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ اگر تم خود قاتلہ نہیں ہو تو کم از کم کسی قاتل کا ساتھ ضرور دے رہی ہو۔"

ڈاکٹر نے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "ٹھہریئے ذرا۔ آپ لوگوں کی باتوں سے صاف ظاہر ہے کہ مجھے قاتل سمجھا جا رہا ہے۔ کامرانی صاحب! اگر آپ اجازت دیں تو میں ابھی اپنی بے گناہی ثابت کر دوں۔"

"وہ کیسے؟" کامرانی نے پوچھا۔

"تنویمی عمل کے ذریعہ۔ اس علم کا ایک فائدہ یہ ہے کہ ہم اس کے ذریعہ اپنے معمول کے گمشدہ ماضی کو اس کے ذہن سے کرید لیتے ہیں۔ شاہینہ آج سہ پہر سے شام تک کی باتیں بھول گئی ہے۔ میں ابھی اسے ٹرانس میں لاتا ہوں اور بھولی ہوئی باتیں یاد دلا سکتا ہوں۔"

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ آپ ابھی یہ عمل کریں۔"

"مگر ایک شرط ہے کامرانی صاحب! مجھے اس عمل کے لئے تنہائی کی ضرورت ہے۔ شاہینہ کی باتیں سننے کے لئے صرف آپ یہاں موجود رہیں۔"

"میرے ساتھ یہاں شہاب بھی رہے گا۔" کامرانی نے اپنا فیصلہ سنایا۔ پھر سجاد اور نعیم کو کمرے سے باہر جانے کے لئے کہا۔ وہ تھوڑی سی بحث کے بعد چلے گئے۔ ہم نے کھڑکی اور دروازوں کو اندر سے بند کر دیا۔ کامرانی نے مجھ سے پاکٹ ریکارڈر لے کر اپنے ہاتھ میں رکھ لیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر جمشید نے تنویمی عمل کا آغاز کیا۔

میں تنویمی عمل کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ یہ بتا ہی چکا ہوں کہ شاہینہ کو ڈاکٹر کی آواز اور اس کا لہجہ فوراً ہی متاثر کرتا تھا اور وہ آسانی سے ٹرانس میں آ جاتی تھی۔ جب وہ اس کی معمولہ بن گئی تو کامرانی نے ریکارڈر کو آن کر دیا۔ ڈاکٹر شاہینہ سے کہہ رہا تھا۔

"تم سو چکی ہو مگر تمہارے کان صرف میری آواز سن رہے ہیں۔"

شاہینہ کی نیند میں ڈوبی ہوئی دھیمی سی آواز اس کے لبوں سے ابھری۔

"میں تمہاری آواز سن رہی ہوں۔"

"تم میرے سوالات کے جواب دو گی۔"

"میں تمہارے تمام سوالات کے جواب دوں گی۔"

"اس وقت رات کے بارہ بجے تم کہاں ہو اور کیا کر رہی ہو؟"

"میں اپنے بستر پر ہوں اور تمہارے سوال کا جواب دے رہی ہوں۔"

"تم سہ پہر کو ساڑھے تین بجے کہاں تھیں اور کیا کر رہی تھیں؟"

"میں سہ پہر کو ساڑھے تین بجے بستر پر تھی اور تمہارے تنویمی عمل سے سو رہی تھی۔"

"کیا تم آدھ گھنٹے بعد ناول پڑھنے کے لئے بیدار ہو گئی تھیں؟"

"ہاں' آدھ گھنٹے بعد بیدار ہو گئی تھی۔"

"بتاؤ کہ تنویمی بیداری کے بعد تم نے کیا کیا؟"

"میں ناول پڑھنے لگی۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا پڑھ رہی ہوں۔ تھوڑی دیر بعد میں نے کتاب بند کر دی۔ اب مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں بستر سے اٹھ گئی تھی۔ اس وقت نعیم نے آ کر مجھے باہر چلنے کے لئے کہا۔ میں اس کے ساتھ سی ویو کارنر تک گئی۔ جب وہ مجھے کار میں چھوڑ کر چائے پینے کے لئے چلا گیا تو ایک شخص آ کر میرے پاس ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے کار آگے بڑھا دی۔"

"کیا تم اس آدمی کو پہچانتی ہو؟"

"میں اسے نہیں پہچانتی۔"

"پھر تم ایک اجنبی کے ساتھ کیسے چلی گئیں؟"

"میں نہیں جانتی کہ میں کیوں اس کے ساتھ گئی اور میں کیوں نعیم کے ساتھ گئی۔ بس مجھے اچھا لگ رہا تھا۔ گھر سے باہر کا منظر اچھا تھا۔ پھر سمندر کا نظارہ اچھا لگ رہا تھا۔ میں جانے کہاں اڑتی پھر رہی تھی پھر ایک جگہ کار رک گئی۔ اس اجنبی نے مجھے کار سے باہر آنے کے لئے کہا۔ میں نے باہر آ کر دیکھا۔ تھوڑے فاصلے پر میرے ڈیڈی نظر آئے۔ وہاں تین آدمیوں نے انہیں ریت میں سینے تک دفن کر دیا تھا۔ ان میں سے ایک شخص کے چہرے پر نقاب تھی۔ ڈیڈی ہاتھ ہلا ہلا کر چیخ رہے تھے۔ نقاب پوش ایک کلپ بورڈ اور قلم پکڑے ہوئے تھا۔ وہ ڈیڈی سے کہہ رہا تھا۔

"اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو جو کچھ میں نے کہا ہے وہ اس کاغذ پر لکھ دو۔"

وہ بار بار کہتا رہا۔ ڈیڈی بار بار انکار کرتے رہے۔ آخر وہ تینوں جھنجلا کر ڈیڈی سے دور چلے گئے اور ان کے تڑپ تڑپ کر مرنے کا تماشہ دیکھنے لگے۔"

ڈاکٹر نے سوال کیا۔ "تم خاموش کیوں تھیں؟ تمہیں مدد کے لئے چیخنا چلانا چاہئے تھا۔"

اس نے جواب دیا۔ "میں نے ایسا نہیں کیا۔ ڈیڈی کو مرتے دیکھ کر بہت اچھا لگ رہا تھا۔ میری برسوں کی خواہش پوری ہو رہی تھی۔"

ہم سب حیرانی سے اس کے خوابیدہ چہرے کو تکنے لگے۔ ڈاکٹر نے پوچھا۔

"کیا تم اپنے ڈیڈی سے نفرت کرتی تھیں؟"

"ہاں ڈیڈی کے مرنے کے بعد بھی نفرت کرتی ہوں۔"

"نفرت کی وجہ بتاؤ؟"

"ڈیڈی بہت ظالم تھے۔ انہوں نے امی کی زندگی میں ایک انگریز عورت سے شادی کر لی تھی۔ میری امی کے ازدواجی حقوق چھین کر اسے دے دیئے۔ وہ اسی غم میں گھل گھل کر مر گئیں۔ میں چاہتی تھی کہ ڈیڈی بھی اسی طرح تڑپ تڑپ کر مر جائیں اور میں انہیں اسی طرح مرتے دیکھ رہی تھی۔ وہ سینے تک دفن تھے۔ اپنی آدھی قبر سے نکل نہیں سکتے تھے۔ سمندر کی نمکین لہریں تیزی سے آ کر ان پر سے گزرتی تھیں۔ چند لمحوں کے لئے انہیں چھپا دیتی تھیں۔ پھر جب واپس جاتیں تو ڈیڈی اُلجھی اُلجھی سی سانسیں لیتے ہوئے نظر آتے۔ کھارا پانی سانسوں کے ذریعہ ان کے حلق کے اندر خراش پیدا کر رہا ہو گا۔ لہریں ان پر سانپوں کی طرح چڑھتی اترتی جا رہی تھیں۔ ان کی ہانپتی اور ٹوٹتی ہوئی سانسیں لہروں کی طرح ابھرتی اور ڈوبتی جا رہی تھیں۔ وہ زیادہ دیر تک زندگی سے سانسوں کی بھیک نہ مانگ سکے آخر تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔"

چند لمحوں کے لئے گہری خاموشی چھا گئی۔ وہ آنکھیں بند کئے چت لیٹی ہوئی تھی۔ اس کا سانس لیتا ہوا سینہ لہر لہر ڈوبتا ابھرتا جا رہا تھا اس کے اندر حسن و شباب کی ہنگامہ خیزی کے علاوہ اور بھی ہنگامے تھے جو تنویمی اثر کے تحت زبان پر آ رہے تھے۔ ڈاکٹر نے سوال کیا۔

"کیا تم نے دانستہ اپنے ڈیڈی اور جگنو کے قتل میں حصہ لیا ہے؟"

"نہیں، میں چاہتی تھی کہ وہ دونوں مر جائیں۔ میں چاہتی ہوں کہ نعیم بھی مر جائے۔ مگر مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں ہے کہ میں کسی کو مار سکوں۔"

"تم اچھی طرح سوچو، یاد کرو، تمہیں ضرور یاد آئے گا کہ تم نے کسی قاتل کا ساتھ دیا ہے۔"

شاہینہ تھوڑی دیر تک خاموش رہی پھر کہنے لگی۔

"مجھے بس اتنا ہی یاد آتا ہے کہ میں گہری نیند سو رہی تھی۔ تم نے مجھے ٹرانس میں لانے کے دوران ہدایت کی تھی کہ رات کو میں صرف فون کی گھنٹی کی آواز پر اٹھ سکتی ہوں۔ بیس دسمبر کی رات کو میں فون کی گھنٹی سن کر بیدار ہو گئی۔ میں نے ریسیور اٹھایا تو کوئی مجھ سے کہہ رہا تھا۔ "تم نیم بیداری کی حالت میں ہو۔ اب تک تنویمی عمل کے تابع ہو۔ بستر سے اُٹھو، کاغذ قلم لاؤ۔ پھر دوبارہ لیٹ کر ریسیور کو کان سے لگاؤ۔ جو کچھ میں کہتا جاؤں تم اسے لکھتی جاؤ۔" میں اس کے حکم کی تعمیل کرنے لگی۔"

"تعجب ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "تم میرے ٹرانس میں آنے والی معمولہ ہو۔ مگر کوئی

دوسرا تمہیں ٹریپ کر رہا تھا۔ اس نے تم سے کیا لکھوایا۔"

"اس نے جگنو کے نام سے شہاب کو خط لکھوایا تھا۔"

"کیا اس کی آواز اور اس کا لہجہ میری طرح تھا؟"

"میں نہیں جانتی۔ ریسیور سے خارج ہونے والی آواز کچھ بدلی بدلی سی ہوتی ہے۔ میں فون پر اکثر اپنوں کی آوازیں نہیں پہچان سکتی ہوں۔"

"اچھا اب سمندر کے ساحل پر واپس آؤ اور یہ بتاؤ کہ تمہارے ڈیڈی کے مرنے کے بعد کیا ہوا؟"

"اس اجنبی نے پھر مجھے کار میں بیٹھنے کے لئے کہا۔ جب میں بیٹھ گئی تو اس نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھانے کے بعد کہا۔ "شاہینہ! تمہارا باپ یہاں ایک حسینہ کے ساتھ عیش کرنے آیا تھا۔ یوں سمجھ لو کہ وہ حسینہ ہمارے اشاروں پر اسے یہاں لائی تھی۔ ہم تمہیں دکھانا چاہتے تھے کہ تمہارا باپ اس عمر میں بھی عیاشی کرتا ہے۔ پہلے اس نے تمہاری امی کے حقوق چھینے۔ اب جو دولت تمہارے کام آنے والی ہے اسے دوسری عورتوں پر لٹا رہا ہے۔ ہم نے تمہاری بھلائی کے لئے اس عیاش بوڑھے کو ہمیشہ کی نیند سلا دیا ہے۔ اب تمہارے سونے کا وقت قریب آ رہا ہے۔ ڈاکٹر نے تمہیں ناول پڑھنے کے لئے پورے تین گھنٹے کی مہلت دی تھی۔ وہ تین گھنٹے اب پورے ہونے والے ہیں۔ تم کوٹھی میں پہنچ کر کسی کو اطلاع دے دینا کہ سی ویو کارنر سے دس میل دور مشرق کی سمت ایک ویران ساحل پر تمہارے باپ کی لاش پڑی ہوئی ہے۔

وہ مجھے کوٹھی کے احاطے میں چھوڑ کر چلا گیا۔ میں اپنی خوابگاہ میں آئی تو نعیم میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں اسے ڈیڈی کی موت کی اطلاع دے کر اپنے وقت کے مطابق سو گئی۔"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔ ڈاکٹر نے کہا۔

"شاہینہ! تم بہت اچھی لڑکی ہو۔ مگر نفرت کا زہر اچھے ذہن کو بھی جرم کی طرف مائل کر دیتا ہے۔ تم عہد کرو کہ اب نعیم سے نفرت نہیں کرو گی۔ اگر کوئی تمہیں نعیم کے خلاف آلۂ کار بنانا چاہے تو تم فوراً ہی تنویمی اثر سے آزاد ہو جاؤ گی اور فون پر آئندہ اس اجنبی کی آواز کو پہچاننے کی کوشش کرو گی۔"

"میں نعیم سے نفرت نہیں کروں گی۔ فون پر اس اجنبی کی آواز کو ضرور پہچانوں گی اور ایسے وقت تمہاری ہدایت کے مطابق فوراً ہی تنویمی اثر سے آزاد ہو جاؤں گی۔"

"بس، اب تم سکون سے سو جاؤ۔ صبح چھ بجے تمہاری آنکھ کھل جائے گی۔"

وہ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق خاموش ہو گئی۔ اپنے آس پاس کی دنیا سے بے خبر گہری نیند میں ڈوب گئی۔ کامرانی نے ریکارڈر کو آف کرتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر! آپ کے تنویمی عمل کے ذریعہ بہت سی معلومات حاصل ہو گئیں لیکن اب بھی آپ کی پوزیشن صاف نہیں ہوئی۔ فون پر سنائی دینے والی آواز اور ساحل پر نظر آنے والا نقاب پوش دونوں ہی پردۂ راز میں ہیں۔ اس پردے کے پیچھے وہی شخص ہے جو تنویمی عمل جانتا ہے۔"

میں سگریٹ سلگاتے ہوئے ڈاکٹر کے چہرے کو پڑھنے لگا۔ وہ اپنی گھبراہٹ کو چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کامرانی نے کہا۔

"شاہینہ کے بیان سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ کوئی فون کے ذریعہ ہپناٹزم کے عامل کی طرح اس سے اپنے حکم کی تعمیل کراتا ہے۔ آپ اسے ٹرانس میں لانے کے بعد بھی اسے ناول پڑھنے کے لئے مصنوعی بیداری کا موقع دے چکے ہیں۔ اس بیداری کے دوران وہ سمندر کے ساحل تک سفر کر چکی ہے۔ یہ مصنوعی بیداری اسے فون کے ذریعہ بھی مل چکی ہے یا تو آپ اسے نیند دے کر خود اس کی نیند چراتے ہیں۔ یا پھر کوئی دوسرا آپ کی معمولہ کو چرا لیتا ہے۔"

ہم شاہینہ کی خوابگاہ سے باہر آ گئے۔ ڈرائنگ روم میں سجاد اور نعیم یہ جاننے کے لئے بے چین تھے کہ شاہینہ نے ٹرانس میں آنے کے بعد کیا بیان دیا ہے۔ ہم نے پہلی بار سجاد اور نعیم کی آنکھوں کو غور سے دیکھا کیونکہ ہپناٹزم کا علم جاننے والے کسی حد تک آنکھوں سے پہچانے جا سکتے ہیں۔ اُن دونوں کی بڑی بڑی آنکھوں میں گہرائی تھی۔ شاید کمزور دل کے لوگ ان آنکھوں سے مرعوب ہو جاتے ہوں گے۔ اب ان سے یہ پوچھنا مناسب نہیں تھا کہ ان میں سے کون تنویمی عمل جانتا ہے۔ جاننے والا کبھی اس کا اعتراف نہ کرتا۔

کامرانی نے ان کی کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ میرے ساتھ باہر آ گیا۔ ہم دونوں خاموش تھے۔ کار میں بیٹھ کر بھی ہم نے ایک دوسرے کو مخاطب نہیں کیا۔ کامرانی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں بھی دو عدد قتل کی گتھیوں کو سلجھانے کے دوران بار بار شاہینہ کی طرف بھٹک جاتا تھا۔ میں کسی قاتل تک پہنچنا چاہتا تھا لیکن میرے آوارہ جذبات مجھے شاہینہ تک پہنچا دیتے تھے۔ تنویمی عمل کے دوران اس کے لیٹنے کا انداز لبھا رہا تھا۔

تب میرے دل نے کہا کہ میں چھلکتے ہوئے جام سے منہ موڑ کر جا رہا ہوں۔ کیسا مے خوار ہوں میں؟ مجھے کسی بہانے سے پھر اس کی خوابگاہ میں پہنچنا چاہئے۔ یہ خیال آتے ہی میں نے کامرانی سے کہا۔

"یار! گاڑی روکو۔ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ ہمیں آگے بڑھنے کی بجائے پھر واپس جانا پڑے۔"

اس نے گاڑی روک کر پوچھا۔ "کوئی نکتہ دماغ میں آیا ہے؟"

"ہاں' میں سمجھتا ہوں کہ قاتل کچھ بوکھلایا ہوا ہے۔ جگنو کو قتل کرنے کے بعد اسے کچھ عرصہ تک خاموش رہنا چاہئے تھا۔ مگر آج اس نے تیسرے ہی دن وسیم درانی کا بھی کام تمام کر دیا۔ اگر نعیم اپنے باپ کی جائیداد کا تنہا وارث بننا چاہتا ہے تو پھر شاہینہ کی شامت آگئی ہے اور اگر شاہینہ کو فائدہ پہنچانے کے لئے سجاد یا ڈاکٹر جمشید میں سے کوئی قاتل کا کردار ادا کر رہا ہے تو نعیم کا جلد ہی خاتمہ ہو گا۔ ہو سکتا ہے کہ بوکھلایا ہوا قاتل آج رات ہی کچھ کر بیٹھے۔"

کامرانی نے تائید کی۔ "ہاں یہ تو میں بھی سمجھ رہا ہوں کہ قاتل بڑی تیزی دکھا رہا ہے۔"

"تو پھر شاہینہ کی حفاظت کے لئے ہمیں واپس جانا چاہئے۔"

"تم یہ بھی تو کہہ سکتے ہو کہ نعیم کی حفاظت کے لئے ہمیں واپس جانا چاہئے۔ مگر بیٹے! میں تمہیں خوب سمجھتا ہوں اس وقت تمہاری کھوپڑی میں شاہینہ سمائی ہوئی ہے۔"

میں نے جبراً سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "مذاق نہ کرو۔ میں نے شاہینہ کا نام اس لئے لیا ہے کہ اس کی خوابگاہ کا پچھلا دروازہ اب بھی میرے لئے کھلا ہو گا۔ میں اسی راستے سے چپ چاپ کوٹھی میں داخل ہو سکتا ہوں۔ وہاں چھپ کر میں نعیم پر نظر رکھوں گا اور شاید یہ بھی دیکھنے کا موقع مل جائے کہ کوئی قاتل شاہینہ کی نیند کیسے چراتا ہے۔"

"ہاں' تمہاری بات دل کو لگتی ہے۔ آج رات ہمیں ایکٹو رہنا چاہئے۔" کامرانی نے جیب سے ریکارڈر نکال کر اس میں سے وہ کیسٹ نکال لیا جس میں پندرہ منٹ پہلے شاہینہ کا بیان ریکارڈ کیا گیا تھا۔ اس نے دوسرا کیسٹ لگا کر وہ ریکارڈر مجھے دے دیا۔ پھر کار کو واپس موڑتے ہوئے کہا۔

"میں کوٹھی سے ذرا دور کار میں بیٹھا تمہارا انتظار کروں گا تم کب تک واپس آؤ گے؟"

"تقریباً ایک گھنٹے کے بعد۔"

کامرانی نے کوٹھی کے پیچھے سو گز کے فاصلہ پر کار روک دی پھر کار سے اترتا ہوا بولا۔

"تم یہاں ٹھہرو' میں کوٹھی کا ایک چکر لگا کر آتا ہوں۔"

وہ چلا گیا۔ میں وقت گزارنے کے لئے کیسٹ ریکارڈر میں آزمائشی طور پر اپنی آواز ریکارڈ کرنے لگا۔ ریکارڈر اچھی طرح کام کر رہا تھا۔ پھر میں نے کیسٹ کو ریوائنڈ کر دیا۔ بیس منٹ کے بعد کامرانی نے آ کر کہا۔

"ڈاکٹر جمشید اور سجاد کی گاڑیاں کوٹھی کے احاطہ میں نہیں ہیں' اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دونوں وہاں سے جا چکے ہیں۔ احاطے کا آہنی دروازہ بند ہو چکا ہے۔ تمہیں پچھلی دیوار پھاند کر جانا ہو گا۔"

"تم فکر نہ کرو' میں کوٹھی میں پہنچ جاؤں گا۔"

میں اس سے رخصت ہو کر کوٹھی کی پچھلی دیوار کے پاس پہنچا۔ دیوار اونچی تھی۔ مگر ہمارے ملک کے نوے فیصد نوجوان درجنوں عشق کرنے کے دوران اونچی اونچی دیواریں پھاندنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ یہ عادت میرے بھی کام آگئی۔ میں دیوار کے اِس پار سے اُس پار پہنچ گیا۔ پائیں باغ میں اندھیرا تھا لیکن پچھلے برآمدے کی روشنی مجھے سہارا دے رہی تھی۔ شاہینہ اور نعیم کو کتے پالنے کا شوق نہیں تھا۔ اس لئے میں بخیریت خوابگاہ کے پچھلے دروازے تک پہنچ گیا۔ میں نے محتاط نظروں سے آس پاس دیکھنے کے بعد دروازے کو ہولے سے دھکا دیا تو وہ شاہینہ کے وعدے کی طرح کھلتا چلا گیا۔

میں نے اندر پہنچ کر دروازے کے پٹ لگا دیئے۔ پھر پردہ ہٹا کر دیکھا۔ وہ بستر پر محو خواب تھی۔ وہ' جس کے لئے میں کامرانی کو الٹی سیدھی باتیں سمجھا کر وہاں تک پہنچا تھا۔ ورنہ مجھے یقین نہیں تھا کہ کوئی قاتل اس قدر بوکھلایا ہوا ہو گا کہ پھر شاہینہ یا نعیم کو اپنا نشانہ بنائے گا۔ قاتل کی ایسی کی تیسی' قتل و غارت گری کی کہانیاں لکھتے لکھتے یا جیتے جاگتے قاتلوں کی تلاش کرتے کرتے کبھی زلفوں کی چھاؤں بھی ملنی چاہئے۔ مگر اس کی زلفیں تراشیدہ تھیں۔ یعنی چھاؤں گھنی نہیں تھی۔ البتہ شباب کی دھوپ بہت تیز تھی۔ خوابگاہ کا دوسرا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس دروازے سے کوئی بھی وہاں آ سکتا تھا۔ میں اسے بند کرنے کے لیے آگے بڑھ گیا۔ پھر میرے دماغ نے سمجھایا کہ محبت کرنے آئے ہو تو ذرا جاسوسی بھی کر لو۔ نعیم کی خبر لینا بھی ضروری ہے۔ لوگ جورو کے پاس آ کر سالے کو بھول جاتے

ہیں۔ میں شاہینہ کی قربت میں نعیم کو بھول گیا تھا۔ اب اس کی یاد آتے ہی میں کوٹھی کے اندر دبے پاؤں چلتے ہوئے مختلف کمروں میں جھانکنے لگا۔ تمام کمرے ویران اور خاموش تھے۔ نعیم اپنی خوابگاہ میں نہیں تھا۔ مینٹل پیس پر رکھی ہوئی نعیم کی تصویر اور بستر کے سرہانے رکھی ہوئی شراب کی بوتل سے میں نے سمجھ لیا کہ وہ نعیم کی خوابگاہ ہے۔ مگر اس کا پتہ نہیں تھا کہ وہ کہاں چلا گیا ہے؟

میں شاہینہ کی خوابگاہ میں واپس آ گیا۔ میری ساری دلچسپیاں اسی خوابگاہ کے اندر تھیں۔ اب میں اس کے سرہانے آ کر کھڑا ہو گیا اور دوسرے زاویے سے لباس کے جام میں چھلکتی ہوئی جوانی کو دیکھنے لگا۔ نصیب میں صرف دیکھنا ہی لکھا تھا۔ سامنے دیوار گھڑی نے مجھے بتایا کہ وقت بڑی تیزی سے گزرتا جا رہا ہے۔ میں نے کامرانی سے ایک گھنٹے کا وعدہ کیا تھا۔ اب مجھے پندرہ منٹ کے اندر وہاں سے چلا جانا چاہئے تھا۔

میں نے آخری بار شاہینہ پر حسرت بھری نظر ڈالی۔ پھر وہاں سے جانے لگا۔ اچانک ہی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میرے قدم رک گئے۔ میں شاہینہ کے سرہانے والی میز پر رکھے ہوئے ٹیلی فون کو دیکھنے لگا۔ شاہینہ نیند میں کسمسا رہی تھی۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق فون کی گھنٹی سن کر وہ بیدار ہو سکتی تھی اور وہ بیدار ہو رہی تھی۔ میں فوراً ہی جیب سے ریکارڈر نکال کر پلنگ کے سرہانے گیا اور وہاں چھپ کر بیٹھ گیا۔ شاہینہ کا ہاتھ نیند کی حالت میں ریسیور تک گیا۔ پھر اس ریسیور کو اٹھا کر اس نے جیسے ہی کان سے لگاتے ہوئے "ہیلو۔" کہا۔ میں ریکارڈر کو آن کر کے اس کے سر کے قریب لے آیا۔

ریسیور سے آواز آئی۔ "تم بہت گہری نیند سوتی ہو۔ چلو اب اٹھو اور کمرے سے نکل کر دیکھو۔ نعیم اپنی خوابگاہ میں موجود ہے یا نہیں؟ میں تمہارے جواب کا انتظار کر رہا ہوں۔"

وہ ریسیور کو تکیہ پر رکھ کر بستر سے اٹھ گئی۔ میں پلنگ کے پیچھے ذرا اور جھک گیا تاکہ وہ دیکھ نہ سکے۔ اس طرح میں بھی اسے جاتے ہوئے نہ دیکھ سکا۔ بستر اور کمرہ اس کے وجود سے خالی ہو گیا تھا۔ میں تکیہ پر رکھے ہوئے ریسیور کو دیکھنے لگا۔ شاہینہ کی نیند چرانے والے کو میں نے ریسیور سے نکال کر ریکارڈر کے کیسٹ میں قید کر لیا تھا اور یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔

دس منٹ کے بعد وہ واپس آ گئی۔ میں پھر جھک کر بیٹھ گیا۔ شاہینہ نے پہلے کی طرح پلنگ پر لیٹ کر ریسیور کو کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

"ہیلو' وہ اپنی خوابگاہ میں نہیں ہے۔ کوٹھی کا بیرونی دروازہ اندر سے بند نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کہیں باہر گیا ہے۔"

میں دوبارہ ریکارڈر کو آن کر چکا تھا۔ ریسیور سے آواز آ رہی تھی۔

"کوئی بات نہیں۔ وہ ضرور واپس آئے گا۔ تم جاگتی رہو۔"

"پتہ نہیں وہ کب آئے گا۔ میں سونا چاہتی ہوں۔"

"دیکھو شاہینہ! ہم آج ہی رات نعیم کو بھی ہمیشہ کی نیند سلا دیں گے۔ ورنہ جتنی دیر ہو گی پولیس والے اتنے ہی زیادہ محتاط ہوتے جائیں گے۔"

"مگر مجھے نیند آ رہی ہے۔"

"میری سرپرستی میں تمہیں کانٹوں کے بستر پر بھی نیند آ جاتی ہے۔ اچھا ڈارلنگ سو جاؤ۔ میں ایک گھنٹے کے بعد تمہیں پھر فون کروں گا۔ سو جاؤ۔ تمہیں نیند آ رہی ہے۔"

شاہینہ نے ریسیور کو کریڈل پر رکھ دیا۔ پھر بستر پر سیدھی ہو کر لیٹ گئی۔ میں ریکارڈر کو آف کر کے تھوڑی دیر تک انتظار کرتا رہا۔ پھر اٹھ کر دیکھا تو وہ پھر نیند میں ڈوب گئی تھی۔ عجب سوتا جاگتا ہوا شباب تھا۔ میں دبے قدموں چلتا ہوا پچھلے دروازے سے باہر آ گیا۔ ایک گھنٹے سے زیادہ وقت گزر چکا تھا۔ کامرانی میری واپسی کا انتظار نہ کر سکا۔ میں نے برآمدے کی روشنی میں دیکھا وہ بھی دیوار پھاند کر آ رہا تھا۔ میں تیزی سے بڑھتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔ پھر میں نے مختصر الفاظ میں بتایا کہ میں نے کیا کارنامہ انجام دیا ہے۔

ہم دونوں پائیں باغ کے ایک گوشے میں آ گئے۔ وہاں کامرانی نے ریکارڈر کے کیسٹ کو ریوائنڈ کیا۔ پھر شاہینہ سے ٹیلی فون پر ہونے والی باتیں سننے لگا۔ پھر اسے آف کرنے کے بعد مجھے دیتے ہوئے کہا۔

"تم نے تو واقعی کمال کر دیا۔ اب اس قاتل کو رنگے ہاتھوں پکڑنا ہو گا۔"

"سوچ سمجھ کر پلاننگ کرو ورنہ وہ ہاتھ سے پھسل جائے گا۔"

"ایسا نہیں ہو گا۔ اگر تم میری ایک بات مان لو۔"

"وہ بات کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

کامرانی نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔ "بھئی شباب! تم شاہینہ کے بستر پر تو نہ سو سکے۔ اس کے بھائی کے بستر پر جا کر سو جاؤ۔"

"کک' کیا مطلب۔ یعنی کہ نعیم کے بستر پر سو جاؤں' تم ہوش میں تو ہو۔"

"میں ہوش میں ہوں' ہمیں نعیم کی جان بچانا ہو گی۔"

"اس کے لئے تم مجھے قربانی کا بکرا بناؤ گے۔ عشق میں لیلیٰ کے کتے سے محبت کی جاتی ہے۔ مگر لیلیٰ کے بھائی پر آج تک کوئی مجنوں قربان نہیں ہوا۔"

"کیا تم اپنی حفاظت نہیں کر سکو گے؟ کیوں بزدلوں کی طرح باتیں کر رہے ہو؟"

میری غیرت جاگ گئی۔ میں نے اپنے سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔ "میں بزدل نہیں ہوں۔ میں نعیم کی خوابگاہ میں جاؤں گا۔ مگر یہ بتاؤ' تم کیا کرو گے؟"

"میں کوٹھی کے سامنے والے حصے میں جاتا ہوں۔ نعیم واپس آئے گا تو میں اسے وہیں روک لوں گا۔ تم اس کی خوابگاہ کی ایک کھڑکی کھول دینا تاکہ میں بوقتِ ضرورت تمہاری مدد کے لئے پہنچ سکوں۔"

ہم دونوں پائیں باغ کے گوشہ سے نکلے۔ وہ کوٹھی کے اگلے حصے کی طرف چلا گیا اور میں پھر شاہینہ کی خوابگاہ میں پہنچ گیا۔ وہ بدستور گہری نیند سو رہی تھی۔ کاش کہ میں اس کی نیند چرا سکتا۔ وہ کم بخت نیند چرانے والا مجھ سے زیادہ خوش نصیب تھا۔ میں اس کی طرف ایک ہوائی بوسہ اچھال کر کمرے سے نکل گیا۔ سب سے پہلے میں نے کوٹھی کے بیرونی دروازے کو اندر سے بند کیا تاکہ شاہینہ مصنوعی بیداری کی حالت میں وہاں آ کر بند دروازے کو دیکھے تو سمجھ لے کہ نعیم واپس آ گیا ہے۔ اس کے بعد میں نعیم کی خوابگاہ میں پہنچ گیا۔

خوابگاہ میں پہلے جیسی ویرانی اور خاموشی تھی لیکن مجھے وہاں کچھ تبدیلی کا احساس ہوا۔ میں نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ بستر کے سرہانے والی میز پر جو شراب کی بوتل رکھی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر خیال آیا کہ اس میں سے شراب کچھ کم ہو گئی ہے۔ میری یادداشت اچھی ہے۔ میں نے بھری ہوئی بوتل دیکھی تھی۔ پھر اس میں سے کون تھوڑی سی چرا کر پی سکتا تھا؟

میں بوتل کے قریب آیا اور اسے جھک کر دیکھنے لگا۔ میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے بعد دوبارہ اس خوابگاہ میں آیا تھا۔ اتنی سی دیر میں کسی نے اس بوتل سے چند پیگ پی لئے تھے۔ مجھے خطرے کا احساس ہوا کہ اس کمرے میں ضرور کوئی موجود ہے۔ ہو سکتا تھا کہ کوئی پلنگ کے نیچے چھپا ہو۔ یہ معلوم کرنے کے لئے میں نے فرش پر گھٹنے ٹیک دیئے پھر سجدے کی صورت میں جھک کر پلنگ کے نیچے جھانکنا چاہتا تھا۔ اچانک ہی وہاں سے ایک ڈنڈا نکلا اور میرے سر پر بج گیا۔ ایسے وقت آنکھوں کے سامنے ستارے ضرور ناچتے ہیں اور کھوپڑی بھی گھوم جاتی ہے۔ میں خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے فرش سے

اٹھنے لگا۔ پلنگ کے نیچے سے نعیم لڑھکتا ہوا باہر آیا۔

"شہاب کے بچے! میں سمجھ گیا شاہینہ نے تمہارے سامنے بھی اپنی جوانی کا چارہ ڈالا ہے۔ تم اس کی طرف سے مجھے دیکھنے آئے ہو کہ میں یہاں موجود ہوں یا نہیں؟ اب میرے بستر پر تم لیٹے رہو گے اور قاتل کا نشانہ بنو گے۔"

یہ کہتے ہی اس نے مجھے فرش سے پوری طرح اٹھنے کا موقع بھی نہیں دیا۔ ڈنڈے کا دوسرا ہاتھ میرے سر پر جما دیا۔ ایک دم سے یوں لگا جیسے میرے جسم سے روح پھڑپھڑا کر نکل گئی ہے۔ روح کے بغیر یہ دنیا سمجھ میں نہیں آتی۔ تھوڑی دیر کے لئے میری بھی سمجھنے کی صلاحیتیں مر گئیں۔

☆======☆======☆

پتہ نہیں کتنا وقت گزر گیا۔ جب میری آنکھ کھلی تو کمرے میں اندھیرا تھا۔ دروازے سے آنے والی روشنی اس بستر تک نہیں آ رہی تھی جو میری قربان گاہ بنا ہوا تھا۔ میں چاروں شانے چت لیٹا ہوا تھا۔ مجھ میں ہلنے جلنے کی بھی سکت نہیں تھی۔ میرا سر پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ اسی وقت دروازے پر موت کھڑی ہوئی نظر آئی۔ شاید موت بہت خوبصورت ہوتی ہے۔ اسی لئے شاہینہ کے روپ میں دروازے پر کھڑی ہوئی تھی۔

اس کے ہاتھ میں خنجر تھا۔ وہ روشنی میں تھی اور میں اندھیرے بستر پر تھا۔ اس لئے وہ مجھے نعیم سمجھ رہی تھی اور اب آہستہ آہستہ قدم بڑھاتی ہوئی میری طرف آ رہی تھی۔ دلربا کے معنی ہیں دل لے جانے والی' وہ خنجر کی نوک سے میرا کلیجہ نکال کر لے جانے آ رہی تھی۔ میں نے ایسی خوفناک محبت کی آرزو نہیں کی تھی۔ میں نے کامرانی سے بھی اس لئے دوستی نہیں کی تھی کہ وہ قاتل کو پکڑنے کے لئے مجھے موت کے بستر پر سلا دے۔ اِن کم بختوں کو اتنی بڑی دنیا میں' میں ہی ایک احمق مل گیا تھا۔

ویسے مجھ سے ایک حماقت ہو گئی تھی۔ میں اس کوٹھی کا بیرونی دروازہ اندر سے بند کر چکا تھا اور کامرانی کی ہدایت کے مطابق خوابگاہ کی کھڑکی کھولنا بھول گیا تھا۔ بلکہ نعیم کے ڈنڈے نے مجھے کھڑکی تک پہنچنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا یعنی اب مجھ تک بیرونی امداد نہیں پہنچ سکتی تھی۔ اندر وہ سہم سہم کر ایک ایک قدم بڑھتی آ رہی تھی۔ میرا سر تکلیف کی شدت سے پھٹا جا رہا تھا۔ بے بسی اور نقاہت کے باعث جی چاہتا تھا کہ چپ چاپ اس حسینہ کے ہاتھوں جان دے دوں کہ لو یہ جان تمہارے لئے رکھی تھی۔

وہ قریب پہنچ گئی۔ اس کا خنجر والا ہاتھ فضا میں بلند ہوا۔ ٹھیک میرے دل کی طرف

نشانہ تھا۔ مگر نشانہ بازی سے پہلے ہی میں نے کروٹ بدل لی۔ خنجر فوم کے بستر میں پیوست ہو گیا۔ اسی وقت شاہینہ کی پشت پر ایک ڈنڈا پڑا۔ پتہ چلا کہ وہ کم بخت نعیم بدستور پلنگ کے نیچے چھپا ہوا تھا۔ جیسے ہی اس نے نیچے سے نکل کر شاہینہ پر حملہ کیا میں نے لیٹے ہی لیٹے اچھل کر اس کے سینے پر لات جمادی۔ وہ شاید سمجھ رہا تھا کہ میں خنجر کی زد میں آچکا ہوں۔ اسی لئے غیر متوقع حملہ سے وہ بوکھلا گیا۔ اس کے ہاتھ سے ڈنڈا چھوٹ گیا۔ میں نے پلنگ پر سے چھلانگ لگا کر فرش پر پہنچتے ہی اسے گھونسوں پر رکھ لیا۔ میز پر رکھی ہوئی شراب کی بوتل خالی ہو چکی تھی۔ یعنی میری بے ہوشی کے دوران وہ کافی پی چکا تھا۔ اسی لئے جلد ہی ناک آؤٹ ہو گیا۔

شاہینہ اپنی پشت پر ایک ہاتھ رکھے کراہ رہی تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ سے خنجر لے کر پلنگ کے نیچے پھینکتے ہوئے کہا۔

"خنجر کے ہاتھ میں خنجر کی کیا ضرورت ہے۔ آؤ مجھے اپنی اداؤں سے مار دو۔"

میں اسے بازوؤں میں دبوچ کر بستر پر لیٹ گیا۔ وہ سہمی سہمی سی مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے کہا۔

"بس کرو۔ تمہاری تو یہ نیند ختم ہو چکی ہے۔ اب اداکاری نہ دکھاؤ۔ تم پورے ہوش و حواس میں رہ کر نعیم کو قتل کرنے آئی تھیں۔"

ایسا کہتے وقت میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ریکارڈر کو آن کیا پھر شاہینہ کے لبوں پر اپنے ہونٹ جما کر دوسرے لفظوں میں اپنے چہرے سے اس کا چہرہ چھپا کر ریکارڈر کو اس کے سرہانے رکھ دیا۔ اس طرح وہ دیکھ نہ سکی۔ بڑی خوشی سے ایک طویل بوسے کی رشوت دینے کے بعد بولی۔

"میں چاہوں تو اس بات سے انکار کر سکتی ہوں کہ میں نعیم کو قتل کرنے نہیں آئی تھی۔ مگر تمہارے سامنے اقرار کرتی ہوں کیونکہ تمہاری گواہی سے میرا کچھ نہیں بگڑے گا۔ تم رات کے تین بجے چوروں کی طرح اس کوٹھی میں داخل ہوئے ہو۔ ابھی جو خنجر تم نے مجھ سے چھین کر پلنگ کے نیچے پھینکا ہے اب اس کے دستے پر تمہاری انگلیوں کے نشانات ہوں گے۔ تم پر جگنو کے قتل کا الزام ہے۔ اب اس وقت تم میرا گلا بھی گھونٹ کر مارنا چاہتے ہو۔"

میں نے پوچھا۔ "تمہیں اور جگنو کو مارنے کی کوئی وجہ تو ہو گی؟"

اس نے جواب دیا۔ "میں بیان دوں گی کہ تمہیں نعیم کی طرف سے بڑی بڑی

رقمیں ملتی ہیں۔ وہ ہم دونوں کو ختم کر کے تنہا جائیداد کا مالک بننا چاہتا ہے۔ میرے شباب! تم کہانیوں میں خوبصورتی سے ہیرا پھیری دکھاتے ہو۔ میں ایسی ہیرا پھیری حقیقی زندگی میں کرتی ہوں۔ اب تمہیں دانشمندی سے کام لے کر میرا ساتھ دینا ہو گا۔ ورنہ بری طرح پھنسو گے۔"

میں نے پریشان ہو کر کہا۔ "واقعی میں بری طرح پھنس گیا ہوں۔ جگنو کے قتل کا الزام بھی مجھ پر ہے۔"

"تم میرا ساتھ دو گے تو میں ہمیشہ کے لئے تمہاری بن جاؤں گی۔ ڈاکٹر جمشید سے شادی نہیں کروں گی۔ وہ لالچی ہے مجھ سے شادی کر کے میری دولت سے عیش کرنا چاہتا ہے۔ اسی لالچ میں اس نے جگنو کا گلا گھونٹ دیا اور میرے ڈیڈی کو سمندر کے ساحل پر ریت میں دفن کر دیا۔"

میں نے پوچھا۔ "وہ اس طرح دفن کر کے تمہارے ڈیڈی کو ایک کاغذ پر کچھ لکھنے کے لئے مجبور کر رہا تھا۔ وہ کیا لکھوانا چاہتا تھا؟"

"وہ ڈیڈی سے ان کے وکیل کے نام ایک خط لکھوا رہا تھا۔ اس خط میں یہ لکھوایا جاتا کہ نعیم میرے ڈیڈی کا لڑکا نہیں ہے۔ جب انہوں نے اس انگریز عورت سے شادی کی تو نعیم اس عورت کی گود میں تھا' یعنی وہ اس کے پہلے خاوند کی اولاد ہے۔ وکیل کے نام ڈیڈی کا وہ خط ایسا ہوتا کہ نعیم قانونی طور سے جائیداد سے محروم ہو جاتا مگر ڈیڈی بہت ضدی ثابت ہوئے۔ انہوں نے جان دے دی مگر ہماری خواہش کے مطابق خط نہیں لکھا۔"

"شاہینہ میں تمہارا رازدار بن کر رہوں گا۔ مگر تم مجھ سے حقیقت چھپا رہی ہو۔ اب سے ڈیڑھ گھنٹہ پہلے فون پر جس نے تمہاری نیند چرائی تھی میں نے اس کی آواز سن لی۔ اس وقت میں تمہارے سرہانے پلنگ کے پیچھے چھپا ہوا ریسیور سے ابھرنے والی آواز سن رہا تھا۔ تمہارے سجاد ماموں تم سے کہہ رہے تھے کہ آج ہی رات نعیم کا خاتمہ ہو جانا چاہئے۔ میری جان! ڈاکٹر جمشید قاتل نہیں ہے۔ تمہارے ماموں سجاد نے جگنو کا گلا گھونٹا۔ تمہارے ڈیڈی کو سمندر کے کنارے ہلاک کیا جب تم مجھے رازدار بنا رہی ہو تو پھر اس سچائی کا اعتراف بھی کر لو۔"

شاہینہ نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "جب تم نے فون کال سن ہی لی ہے تو میں سچائی کا اعتراف کر لیتی ہوں۔ مجھے اپنی ماں کے بعد ماموں سے زیادہ محبت ہے۔ انہوں نے

مجھے ڈیڈی کی دولت کا تنہا وارث بنانے کے لئے دو قتل کئے ہیں۔ ان کی محبت اور ان کا احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔ اس بار میں نے سجاد ماموں سے کہا کہ نعیم کے سینے میں میں خنجر اتاروں گی۔ اس کم بخت کو خنجر سے ہلاک کرنا بہت آسان ہے اس لئے کہ یہ ہمیشہ پینے کے بعد مدہوش ہو کر سو جاتا ہے۔"

"ڈاکٹر جمشید تمہیں ٹرانس میں لانے کے بعد تم سے سوالات کر رہا تھا۔ مگر تم غلط جواب دے رہی تھیں کہ سمندر کے ساحل پر کسی نقاب پوش کو دیکھا تھا۔ تم نے اپنے سجاد ماموں کا نام نہیں لیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم ٹرانس میں نہیں آئی تھیں۔ ہم سب کو بیوقوف بنا رہی تھیں۔"

"مجھے بے خوابی کا مرض نہیں ہے۔ میں تو بہت گہری نیند سوتی ہوں۔ ڈاکٹر جمشید مجھ پر عاشق ہو گیا تھا۔ سجاد ماموں نے مشورہ دیا کہ میں اس کی معمولہ بن جایا کروں۔ اگر میں معمولہ بن کر تمہیں جگنو کے نام سے خط لکھوں گی' سمندر کے ساحل پر باپ کی موت کا تماشہ دیکھوں گی اور نعیم کی ہونے والی موت سے اگر میرا کوئی تعلق پیدا ہو گا تو سارا الزام ڈاکٹر کے سر پر آئے گا۔

ڈاکٹر نے مجھے معمولہ بنانے کے بعد کہا تھا کہ آئندہ فون پر کوئی میری نیند چرا کر مجھے آلۂ کار بنانا چاہے تو میں اس کی آواز پہچان لوں۔ اب نعیم کو ختم کرنے کے بعد تم کامرانی کو مشورہ دینا کہ شاہینہ کو پھر ٹرانس میں لا کر اس کا بیان لیا جائے۔ جب ڈاکٹر مجھے اپنی معمولہ بنا کر پوچھے گا تو میں کہہ دوں گی کہ فون پر میں نے ڈاکٹر کی ہی آواز سنی ہے۔ میرے اس بیان سے پچھلے دو قتل کی کڑیاں مل کر ڈاکٹر کے پاؤں کی زنجیر بن جائیں گی۔ وہ اب تک اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ میں ٹرانس میں آ جاتی ہوں۔ مگر اس کا تنویمی عمل اسے لے ڈوبے گا۔"

وہ ڈاکٹر کی طرف سے لڑھک کر میری طرف آ گئی تھی۔ تھالی کے بیگن کو لڑھکنے سے روکا جا سکتا ہے۔ عورت کو روکنا بہت مشکل ہے۔ ویسے میں نے بازوؤں میں اسے روک رکھا تھا۔ نعیم فرش پر خراٹے لے رہا تھا۔ کامرانی باہر میرا انتظار کر رہا ہو گا۔ اسے فوراً ہی بلا لینا چاہئے تھا مگر ایسی جلدی بھی کیا تھی۔ قاتل کہیں بھاگا تو نہیں جا رہا تھا۔ وہ کیسٹ میں بند ہو چکا تھا۔ میں تجربہ کرنا چاہتا تھا کہ نیند کیسے چرائی جاتی ہے۔ اور میں نیند چرا رہا تھا۔

☆------☆------☆

پیمانۂ عمر

عورتوں کو اپنی عمر چھپانے کا جنون ہوتا ہے۔ جدید میک اپ کے ذریعے بڑھیا بھی گڑیا نظر آتی ہے۔

ایک ڈاکٹر کا عبرت ناک قصہ، اس نے عورتوں کی صحیح عمر بتانے والا آلہ ایجاد کر کے تمام عورتوں کو اپنا دشمن بنا لیا تھا۔

عورتوں کے لئے وہ قیامت کا دن تھا۔ ڈاکٹر جبار یوسفی کی شاندار لیبارٹری کے اطراف مردوں سے زیادہ عورتوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی اور وہ سب کی سب یوں پریشان نظر آ رہی تھیں جیسے میدانِ حشر میں ان کا نامۂ اعمال کھل رہا ہو۔

لیبارٹری کے برآمدے اور لان میں ہر سائز اور ڈیزائن کی عورتیں تھیں۔ دبلی بھی تھیں' موٹی بھی تھیں' بوڑھی بھی تھیں اور جوان بھی تھیں۔ ویسے عورتوں کا ہمیشہ سے یہ خیال رہا ہے کہ عورتیں کبھی بوڑھی نہیں ہوتیں۔ کم از کم عمر کے حساب سے خوش نصیب ہوتی ہیں۔ سولہ برس میں جوان ہوتی ہیں اور ساری زندگی گزارنے کے بعد بمشکل ستر برس کی عمر میں وفات پاتی ہیں۔

اس وقت وہاں جتنی حسینائیں تھیں ان کے چہروں سے اداسی اور پریشانی جھلک رہی تھی۔ وہ ڈوبتے ہوئے دل اور بجھتی ہوئی نظروں سے لیبارٹری کے بند دروازے کو دیکھ رہی تھیں جس کے پیچھے تین مختلف عورتیں تھیں اور ڈاکٹر جبار یوسفی ان تین عدد کچی پکی عورتوں کے ساتھ کسی تجربہ سے گزر رہا تھا۔

باہر لان میں کھڑی ہوئی ایک عورت نے دوسری عورت سے پوچھا۔

"کیا یہ ممکن ہے؟ کیا ڈاکٹر اپنے تجربے میں کامیاب ہو جائے گا؟"

"ناممکن!" دوسری نے جواباً کہا۔ "مجھے یقین نہیں آتا۔ آج تک کوئی ایسا میزان ایجاد نہیں ہوا جو عورت کے جھوٹ اور سچ کو الگ الگ تول سکے۔"

"ہاں!" تیسری عورت ان کی گفتگو میں شریک ہو گئی۔ "ہم عورتیں جب سے پیدا ہوئی ہیں صرف ایک ہی جھوٹ کو سینے سے لگائے چلی آ رہی ہیں اور رہتی دنیا تک اس اکلوتے جھوٹ کو نبھاتی رہیں گی۔ ڈاکٹر یوسفی جیسے ہزاروں عالم الابدان پیدا ہو جائیں تب بھی ہمارے جھوٹ کو ننگا کرنے کا کوئی آلہ ایجاد نہیں کر سکتے۔"

یہ باتیں سن کر دوسری عورتوں کے دلوں میں امیدیں روشن ہو گئیں۔ سب یہی سوچ کر خود کو تسلیاں دینے لگیں کہ ڈاکٹر کا تجربہ ناکام رہے گا۔ ان کی امیدوں کے برعکس

وہاں جتنے مرد تھے وہ ڈاکٹر یوسفی کی اس حیرت انگیز ایجاد پر انہیں دلی مبارکباد دینے آئے تھے۔ ان میں کچھ سائنسدان تھے' کچھ حکومت کے اعلیٰ افسران تھے اور کچھ پریس رپورٹرز اور فوٹوگرافرز اپنے شانوں سے کیمرے اور فلیش گن لٹکائے ڈاکٹر یوسفی کے منتظر تھے۔

یہ ظاہر تھا کہ ڈاکٹر کی شان میں اور ایجاد کی تعریف میں جو بڑے بڑے کالم لکھے جانے والے تھے ان میں عورتوں کے ازلی جھوٹ کا کس طرح مذاق اڑایا جائے گا۔ اس لحاظ سے وہاں جتنے مرد تھے وہ عورتوں کے دشمن تھے اور ان کی انائیت کو ٹھیس پہنچانا چاہتے تھے۔ اس کے باوجود عورتیں مردوں سے اور مرد عورتوں سے مسکرا کر باتیں کر رہے تھے۔ لان میں میزیں اور کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ہلکے پھلکے ناشتے اور مشروبات کا انتظام کیا گیا تھا۔ عورتیں زیادہ تر پریس رپورٹروں کے قریب بیٹھے رہنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اس طرح وہ معلوم کرنا چاہتی تھیں کہ کل صبح کے اخبارات میں وہ عورتوں کے متعلق کیا لکھنا چاہتے ہیں۔ ویسے جب تک ڈاکٹر جبار یوسفی ان تین عورتوں کے ساتھ لیبارٹری سے باہر نہ آتا اس وقت تک پریس رپورٹرز بھی یہ یقین سے نہیں کہہ سکتے تھے کہ ڈاکٹر کا تجربہ کس حد تک کامیاب ہے اور عورتیں کتنے فیصد کے حساب سے جھوٹ بولتی ہیں۔

وہ سب انتظار کرتے رہے۔ ایک گھنٹے کے بعد ڈاکٹر تو نہیں آیا' البتہ اس کا نوعمر بیٹا انصار یوسفی لیبارٹری کے پچھلے حصے سے ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ باتیں کرتا ہوا وہاں آ گیا۔ اسے دیکھتے ہی پریس رپورٹروں نے اسے گھیر لیا۔ ان کے ساتھ عورتیں بھی کھنچی چلی آئیں۔ پھر چاروں طرف سے سوالات کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔

"آپ ڈاکٹر کے صاحبزادے ہیں۔" ایک نے کہا۔ "اور لیبارٹری میں انہیں اسسٹ کرتے ہیں۔ آپ اُس ایجاد کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کریں۔"

وہ کس قسم کا آلہ ہے؟" ایک عورت نے پوچھا۔

"اُس آلے کا نام کیا ہے؟" ایک اور نے سوال کیا۔

"ڈاکٹر یوسفی لیبارٹری میں کیا کر رہے ہیں۔ وہ عورتیں بھی اندر ہیں۔ آخر وہ کتنی دیر تک اس ایجاد کو آزماتے رہیں گے؟"

انصار یوسفی نے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"لیڈیز اینڈ جنٹلمین! آپ سب سوال پر سوال کئے جا رہے ہیں۔ اس طرح میں کسی کے سوال کا جواب نہیں دے سکوں گا۔ آپ اطمینان سے اپنی اپنی جگہ بیٹھ جائیں۔ میں اپنے ڈیڈی کی اس ایجاد کے متعلق جہاں تک جانتا ہوں وہاں تک بیان کر دیتا ہوں اس

کے بعد ڈیڈی آکر اپنے طور پر بتائیں گے۔"

اس کی باتیں سن کر سب اپنی اپنی جگہ آکر بیٹھ گئے۔ ان میں مکمل خاموشی چھا گئی۔
انصار یوسفی برآمدے سے اتر کر لان میں آیا۔ پھر میزوں کے درمیان پہنچ کر اپنی رسٹ واچ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"یہ گھڑی ہے۔ یہ صرف وقت نہیں بتاتی' دن اور تاریخ بھی بتاتی ہے جب تک یہ چلتی رہے گی' ہمیں معلوم ہوتا رہے گا کہ ہم حضرت عیسیٰ مسیح کی وفات سے اب تک کتنا وقت گزارتے آ رہے ہیں۔ ہم اس گھڑی کو ٹائم میٹر بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ یہ گزرتے ہوئے وقت کا حساب کرتی رہتی ہے۔"

ایک عورت نے بے چینی سے پوچھا۔

"آپ کے ڈیڈی کی ایجاد سے اس گھڑی کا کیا تعلق ہے؟ آپ برائے مہربانی ایجاد کے متعلق بتائیں۔"

انصار یوسفی نے مسکرا کر اس عورت کی جانب دیکھا اور کہا۔

"میں آپ کی بے چینی کو سمجھتا ہوں' لیکن محترمہ! اپنے ڈیڈی کی ایجاد کو تفصیل سے سمجھانے کے لئے اس گھڑی کا ذکر ضروری ہے۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں' یہ ٹائم میٹر ہے۔ اسی طرح رکشے اور ٹیکسی کے میٹر ہوتے ہیں۔ یہ میٹر بتاتے ہیں کہ کتنے میل کا فاصلہ طے ہوتا جا رہا ہے۔ انسانی دماغ نے ایسے ایسے میٹر ایجاد کئے ہیں جو وقت اور فاصلوں کا حساب کرتے ہیں۔ ایک تھرما میٹر بھی ہے جو ہمارے جسم کے صحیح درجۂ حرارت کو ظاہر کرتا ہے تو پھر ہم ایسا میٹر کیوں نہیں بنا سکتے جو انسان کی صحیح عمر بتاتا ہو۔ اسی خیال کے تحت ڈیڈی نے ایک ایسا ہی آلہ ایجاد کیا ہے جس کا نام ایج میٹر رکھا گیا ہے۔

ایج میٹر کسی کی بھی صحیح عمر بتا سکتا ہے خواہ وہ مرد ہو یا عورت' بوڑھا ہو یا بچہ۔ جس کے پاس برتھ سرٹیفکیٹ نہ ہو اور جسے اپنی تاریخ پیدائش معلوم نہ ہو اسے ایج میٹر کے ذریعہ اپنی پیدائش کا سال' مہینہ' دن اور تاریخ معلوم ہو جائے گی۔"

تمام عورتوں کے شگفتہ شگفتہ چہرے یوں مرجھا گئے جیسے بیٹھے بیٹھے ان کی جوانی رخصت ہو گئی ہو۔ ان کے چشمِ تصور میں وہ ایج میٹر نظر آ رہا تھا اور ان کی عمر کا صحیح حساب بتا کر انہیں اختلاجِ قلب میں مبتلا کر رہا تھا۔

ایک پریس رپورٹر نے اپنی جگہ سے اٹھ کر پوچھا۔

"کیا وہ ایج میٹر بتا سکتا ہے کہ اس وقت ہماری صحیح عمر کیا ہے؟"

"جی ہاں۔" انصار یوسفی نے پوچھا۔ "کیا آپ اپنی عمر معلوم کرنا چاہتے ہیں؟"

"میں اپنی نہیں' اپنی بیوی کی صحیح عمر معلوم کرنا چاہتا ہوں۔"

اس بات پر تمام مرد قہقہے لگانے لگے۔ عورتیں ناگواری سے منہ بنانے لگیں۔ ایک پریس رپورٹر نے مسکرا کر پوچھا۔

"مسٹر انصار یوسفی! آپ کے کہنے کے مطابق وہ میٹر مردوں کی بھی عمر بتا سکتا ہے۔ پھر آپ کے ڈیڈی صرف تین عورتوں کو لیبارٹری میں کیوں لے گئے ہیں۔ کیا وہ ہم پر تجربہ نہیں کر سکتے تھے؟"

"بے شک آپ پر بھی تجربہ کیا جا سکتا ہے۔" انصار یوسفی نے جواب دیا۔ "لیکن ابھی آپ سے آپ کی عمر پوچھی جائے تو آپ اپنی عمر بتا دیں گے۔ آپ کی طرح ہر مرد اپنی صحیح عمر بتا دیتا ہے۔ اسی لئے ڈیڈی ایج میٹر کو کسی مرد پر آزما کر وقت ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے۔"

ایک عورت نے غصے سے اٹھ کر کہا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم عورتیں اپنی عمر غلط بتاتی ہیں۔ آپ کو یہ کہنے کی جرأت کیسے ہوئی؟"

"یہ کہنے کی جرأت کیسے ہوئی' اس کا جواب سننا چاہتی ہیں تو پہلے میری ایک بات کا جواب دے دیجئے۔ کیا آپ اپنی عمر بتا سکتی ہیں؟"

"کیوں نہیں بتا سکتی۔ ضرور بتا سکتی ہوں۔ میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ اس وقت میری عمر.........."

انصار یوسفی نے ہاتھ اٹھا کر قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھہریئے۔ قسم کھا کر عمر بتانے سے پہلے یہ سوچ لیجئے کہ آپ کی صحیح عمر کا حساب کرنے کے لئے اس لیبارٹری میں ایج میٹر موجود ہے۔"

وہ حسینہ ایک دم سے گھبرا گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے اپنی عمر بتانا چاہئے یا نہیں۔ اس کی خاموشی کے باعث تمام عورتوں کے متعلق یہ رائے قائم ہو رہی تھی کہ سب ہی اپنی صحیح عمر چھپاتی ہیں۔ بھلا یہ الزام وہ کیسے برداشت کر سکتی تھیں؟ ایک عورت نے اس کی حمایت میں فوراً ہی اٹھ کر کہا۔

"مسٹر انصار یوسفی! آپ کو پرائی عورتوں کی عمر نہیں پوچھنا چاہئے۔ آخر یہ ایج میٹر ایجاد کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی ہے؟ معلوم ہوتا ہے آپ کو اور آپ کے ڈیڈی کو

خصوصاً عورتوں سے کوئی دشمنی ہے۔"

"مجھے اور میرے ڈیڈی کو عورتوں سے دشمنی نہیں ہے۔ صرف ان کی خودنمائی سے شکایت ہے۔ ہمارا مشاہدہ اور تاریخ کا مطالعہ یہ ثابت کرتا ہے کہ عورتیں مرد کے مقابلہ میں جلد ہی بوڑھی ہو جاتی ہیں۔ یہاں بڑھاپے سے مراد یہ ہے کہ حسن و شباب کی چمک دمک ماند پڑ جاتی ہے۔ مہنگا سنگار' عمدہ لباس اور نت نئے فیشن کا سہارا لینے کے باوجود ایسی لگتی ہیں جیسے باسی مٹھائی پر چاندی کا ورق چڑھایا گیا ہو۔

ایسی صورت میں اپنی عمر کو کم سے کم ظاہر کر کے ہی وہ سدا بہار بن کر رہ سکتی ہیں۔ ایسے وقت یہی سننے میں آتا ہے کہ آئے دن کی بیماریوں نے مجھے لاغر بنا دیا ہے۔ ذرا چہرہ مرجھا گیا ہے۔ ذرا آنکھیں اندر دھنس گئی ہیں۔ اس وجہ سے عمر کچھ زیادہ لگتی ہے۔ ورنہ میں تو پورے سولہ برس چھ مہینے کی ہوں۔ جو ذرا صحتمند ہیں وہ صحت کی روشنی میں اپنی عمر کے اندھیرے کو چھپالیتی ہیں۔ عام طور سے یہ رائے قائم کی گئی ہے کہ دنیا کی نوے فیصد عورتیں سولہ برس سے بیس برس تک ہوتی ہیں۔ کوئی عورت شاذ و نادر ہی بیس برس کے بعد دیکھی گئی ہے جو عورتیں نمائش کی عادی نہیں ہوتیں اور اماں جان' دادی جان اور نانی جان بن کر زندگی گزارتی ہیں ان کا شمار دس فیصد میں ہوتا ہے۔

لہٰذا میں اس وقت نوے فیصد عورتوں کا ذکر کر رہا ہوں' ہر مرد اور ہر عورت کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنی کمزوری چھپائے۔ اگر اپنی عمر چھپا کر عورتوں کا غرور قائم رہتا اور مرد کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا تو ہم ان کے غرور اور انانیت کو کبھی ٹھیس نہ پہنچاتے لیکن ان کے بے جا اور بے وقت کے غرور نے اس معاشرے کی صورت بگاڑ دی ہے۔

مثال کے طور پر میرے ایک دوست نے ایک محترمہ سے شادی رچائی ہے۔ محترمہ ماشاء اللہ صحت مند ہیں۔ شادی سے پہلے انہوں نے اپنی عمر سویٹ سکسٹین بتائی تھی۔ عمر اور صحت کا اشتہار اتنا خوبصورت تھا کہ میں نے بھی یہی سمجھا کہ برس پندرہ کا یا کہ سولہ کا سن' جوانی کی راتیں مرادوں کے دن۔ شادی کے بعد میرے مظلوم دوست پر یہ عقدہ کھلا کہ وہ سمندر تھیں اور خود کو عمر کے کوزے میں بند کر رکھا تھا۔ اب وہ بیچارہ اسے طلاق نہیں دے سکتا تھا کیونکہ مہر کی رقم پچاس ہزار ہے اور اس کی ماہانہ آمدنی صرف ایک ہزار روپے ہے۔ ننگا کیا نہائے گا اور کیا نچوڑے گا؟

دوسری مثال میرے ڈیڈی کی ہے۔ ہوا یوں کہ میری والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ جب میں دس برس کا ہوا تو میرے ڈیڈی نے دوسری شادی کی۔ ان دنوں میری سوتیلی والدہ کی

عمر بیس برس تھی۔ شادی کے بعد وہ میرے ڈیڈی کی بیوی تو بن گئیں لیکن انہوں نے میری ماں بننے سے انکار کر دیا۔ کہنے لگیں۔ اگر میں دس برس کے بچے کی ماں بنوں گی تو لوگ میری عمر میں اور دس برس جوڑ کر مجھے تیس برس کی عورت سمجھنے لگیں گے۔ میں کتنوں کو یقین دلاتی پھروں گی کہ میں نے اسے جنم نہیں دیا ہے۔ ابھی میں خود نو شگفتہ ہوں۔

میری سوتیلی امی صرف اس وجہ سے ماں بننے سے انکار کر رہی تھیں کہ ان کی عمر کو ٹھیس پہنچ رہی تھی۔ انہوں نے میرے ڈیڈی کو مشورہ دیا کہ وہ مجھے کسی دوسرے شہر کی بورڈنگ میں پرورش اور تعلیم کے لئے چھوڑ دیں۔ میرے ڈیڈی مجھے بہت چاہتے ہیں۔ انہوں نے یہ مشورہ قبول نہیں کیا۔ اس پر دونوں کے درمیان جھگڑے ہونے لگے۔ آخر ڈیڈی نے تنگ آ کر دوسرے شہر میں میری سوتیلی امی کی رہائش کے لئے کوٹھی خرید کر دے دی۔ تب سے وہ وہیں رہتی ہیں۔ ڈیڈی اکثر وہاں جاتے ہیں لیکن مجھے وہاں جانے کی اجازت نہیں ہے۔ وہ میرا نام سن کر ہی یوں خوفزدہ ہو جاتی ہیں جیسے بوڑھی ہو گئی ہوں۔

اب میں پچیس برس کا نوجوان ہوں اور وہ پینتیس برس کی ہو چکی ہیں۔ میں نے آج تک ان کی صورت نہیں دیکھی ہے۔ ڈیڈی نے پھر انہیں سمجھایا کہ بیگم اب تمہاری اتنی عمر ہو چکی ہے۔ اب تو اپنے اندر ممتا پیدا کرو اور انصار کو بیٹا کہہ کر گلے لگا لو۔ وہ گھبرا کر کہنے لگیں۔

"آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ وہ پچیس برس کا ہو چکا ہے اب میں اسے بیٹا کہوں گی تو لوگ میرے پینتیس برس میں انصار کے پچیس برس کو جوڑ کر مجھے ساٹھ برس کی بڑھیا سمجھنے لگیں گے۔"

"عورتوں کو عمر میں جمع تفریق میں کمال حاصل ہوتا ہے۔" میرے ڈیڈی نے چڑ کر پوچھا۔

"آخر تم کب تک اولاد سے محروم رہ کر جوان رہنا پسند کرو گی؟"

"اس میں پسند کا کیا سوال ہے؟ کیا میں جوان نہیں ہوں؟ کیا میرے چہرے پر جھریاں پڑ گئی ہیں؟ آج بھی میں ایسی ہوں کہ جو دیکھتا ہے' مجھے بیس سے کچھ کم ہی سمجھتا ہے۔ کتنے ہی نوجوان مجھے کنواری لڑکی سمجھتے ہیں۔ عورت کی عمر کو وہیں ٹھہر جانا چاہئے' جہاں تک دوسرے سمجھ کر یقین کر لیتے ہیں۔ آخر آپ کو مجھ سے کیا دشمنی ہے۔ دنیا مجھے بیس برس کی سمجھتی ہے آپ مجھے ساٹھ برس کی بنانا چاہتے ہیں۔"

ڈیڈی ان سے بحث نہ کر سکے غصہ سے یہ کہہ کر چلے آئے کہ تم عورتوں کے لئے ایسا ایکسرے ایجاد ہونا چاہئے جو تمہارے اندر کی چھپی ہوئی عمر کو اسکرین پر لے آئے۔ کہنے کو تو انہوں نے غصے سے کہا تھا لیکن اس کے بعد وہ سنجیدگی سے سوچنے لگے کہ عورت کی اس کمزوری کو دور کرنے کے لئے کچھ کرنا چاہئے۔

ایک دن انہوں نے اپنی کلائی کی گھڑی کو دیکھ کر سوچا کہ یہ وقت کے ایک ایک لمحے کا حساب بتاتی ہے۔ گھڑی سے خیال آگے بڑھتا ہوا رکشے اور ٹیکسی کے میٹر تک گیا لیکن ان میٹروں کا تعلق انسانی جسم سے نہیں تھا۔ لہٰذا تھرما میٹر سے ان کے نظریئے کو تقویت حاصل ہوئی۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں تھرما میٹر کے پارے اور انسانی جسم کی حرارت کی کمی بیشی کے عمل اور ردعمل سے ہمیں درجۂ حرارت یا درجۂ انجماد کا پتہ چلتا ہے۔ اس حقیقت کو سامنے رکھ کر ڈیڈی نے جوانی کی حرارت اور بڑھاپے کی سرد مہری کو دو حصوں میں تقسیم کیا پھر یہ دونوں حصے مزید چھوٹے چھوٹے نقطوں میں تقسیم ہوتے گئے۔ انہوں نے اس فارمولے کو ابھی راز میں رکھا ہے کہ وہ چھوٹے چھوٹے نقطے کس طرح گزری ہوئی عمر اور گزرنے والی عمر کو سال' مہینے' دن اور گھنٹوں میں ظاہر کرتے ہیں۔ ابھی جو تین عورتیں لیبارٹری میں گئی ہیں وہ یہاں آکر بتائیں گی کہ ڈیڈی اپنے تجربے میں کس حد تک کامیاب........"

انصار یوسفی کی بات ادھوری رہ گئی۔ اسی وقت لیبارٹری کے اندر سے شیشوں کے آلات ٹوٹنے کی آوازیں سنائی دیں۔ پھر ڈاکٹر جبار یوسفی کی چیخ سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی بھاگ دوڑ شروع ہو گئی۔ لان میں بیٹھے ہوئے تمام مرد دوڑتے ہوئے لیبارٹری کے دروازے پر آئے اور دروازے کو دونوں ہاتھوں سے پیٹ پیٹ کر ڈاکٹر کو آوازیں دینے لگے۔ عورتیں اپنی جگہ جوں کی توں بیٹھی ہوئی تھیں۔ شاید ان کی دعائیں پوری ہو رہی تھیں کہ ڈاکٹر مر جائے یا وہ ایج میٹر ٹوٹ پھوٹ کر تباہ ہو جائے اس کے بعد ڈاکٹر کو ایسا ذہنی صدمہ پہنچے کہ وہ ایج میٹر دوبارہ نہ بنا سکے۔ وہ سر اٹھا اٹھا کر دیکھ رہی تھیں کہ ان کی دعاؤں کو شرفِ قبولیت حاصل ہو چکی ہے یا نہیں۔

ذرا دیر بعد لیبارٹری کے اندر سے ایک عورت نے دروازے کو کھول دیا۔ وہ اور اس کے پیچھے کھڑی ہوئی نوجوان لڑکی سہمی ہوئی تھی۔ فرش پر شیشے کی کرچیوں کے درمیان ڈاکٹر اوندھا پڑا ہوا تھا اور اس کے سر کے پچھلے حصے سے خون بہتا ہوا فرش کو بھگو رہا تھا۔

پھر لیبارٹری میں لوگوں کی ملی جلی آوازیں گونجنے لگیں۔

"ڈاکٹر کیسے زخمی ہو گئے؟ کس نے زخمی کیا؟"

جواب دینے کے لئے ڈاکٹر ہوش میں نہیں تھا۔ کسی نے دروازہ کھولنے والی عورت سے پوچھا۔

"یہاں تین عورتیں آئی تھیں۔ وہ تیسری عورت کہاں ہے؟"

"وہ' وہ بھاگ گئی ہے۔" اس نے لیبارٹری کے پیچھے کھلنے والی کھڑکی کی جانب اشارہ کیا۔

دو آدمی فوراً ہی کھڑکی کے راستے باہر آئے اور اس عورت کی تلاش میں نکل گئے۔ دو آدمیوں نے ڈاکٹر کو فرش پر سے اٹھایا۔ کچھ اور لوگوں نے زخمی ڈاکٹر کو ایک کار کی پچھلی سیٹ تک پہنچانے میں مدد دی۔ پھر اسے طبی امداد کے لے کسی قریبی ہسپتال میں لے گئے۔ انصار یوسفی بھی اپنے باپ کے ساتھ چلا گیا۔ وہاں جو لوگ رہ گئے تھے انہوں نے ان دو عورتوں کو گھیر لیا اور ان سے سوالات کرنے لگے۔

ایک عورت نے جواب دیا۔ "میں نہیں جانتی کہ وہ تیسری عورت کون تھی ڈاکٹر یوسفی ایج میٹر سے میری عمر معلوم کرنے کے بعد اسے نوٹ کر رہے تھے۔ اچانک اُس تیسری عورت نے پیچھے سے ڈاکٹر پر حملہ کیا۔ ایک شیشے کی بوتل ڈاکٹر کے سر پر توڑ دی۔ وہ چوٹ کھا کر جیسے ہی گرنے لگے' اس عورت نے ان کے ہاتھ سے ایج میٹر چھین لیا اور اسے لے کر کھڑکی کے راستے فرار ہو گئی۔"

ایج میٹر غائب ہو گیا۔ تمام مرد ایک دوسرے کو یوں تکنے لگے جیسے کوئی سہانا خواب ٹوٹ گیا ہو اور عورتوں کے چہرے خوشی سے یوں کھل گئے جیسے حسین خواب کی تعبیر سامنے آ گئی ہو۔

ڈاکٹر جبار یوسفی بوڑھا اور لاغر تھا۔ جسم میں برائے نام خون تھا' جو لیبارٹری کے فرش پر بہہ گیا تھا۔ اس لئے ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہی اس نے دم توڑ دیا۔

وہ دو عورتیں جو لیبارٹری میں تھیں انہیں تھانے میں پہنچا دیا گیا تھا۔ انسپکٹر نے ان سے پوچھا۔

"ڈاکٹر نے ایج میٹر کو پہلے کس پر آزمایا تھا؟"

"مجھ پر آزمایا تھا۔" ایک نوجوان لڑکی نے کہا۔

"آپ کا نام کیا ہے؟"

"فریدہ بیگم۔ میں گرلز اسکول کی ٹیچر ہوں۔ ڈاکٹر نے آزمائش کے لئے میرا انتخاب

اس لئے کیا تھا کہ میں معاشرے کی ایک اہم فرد ہوں۔ کیونکہ مجھ سے سینکڑوں ہزاروں لڑکیاں تعلیم حاصل کرتی ہیں۔"

"آپ کا انتخاب کرنے کی اور بھی کوئی وجہ ہے؟"

"جی ہاں' ایک وجہ اور ہے۔ عام طور سے لیڈی ٹیچر کے لئے ملازمت کی یہ شرط ہوتی ہے کہ وہ کم عمر ہو اور شادی شدہ نہ ہو۔ کیونکہ شادی شدہ عورتیں اپنے گھریلو معاملات میں الجھی رہتی ہیں اور ہر سال بچے پیدا کرتی رہتی ہیں۔ اس طرح وہ اسکول میں پڑھنے والی لڑکیوں پر پوری توجہ نہیں دیتیں۔ میں کم عمر ہوں اور ابھی میری شادی نہیں ہوئی ہے۔ ڈاکٹر یوسفی یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ مجھ جیسی لڑکی جو معاشرے میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہے' وہ عمر کے معاملے میں کس حد تک سچ بولتی ہے۔"

"ہوں' تو پھر ایج میٹر نے کیا بتایا؟"

وہ چند لمحوں تک خاموش رہی پھر جھجکتی ہوئی بولی۔

"ڈاکٹر اپنے تجربے میں ناکام رہے یا پھر اس ایج میٹر میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی تھی۔ کیونکہ وہ میری موجودہ عمر سے سات برس زیادہ بتا رہا تھا۔"

"آپ کیسے کہہ سکتی ہیں کہ ایج میٹر میں خرابی پیدا ہو گئی تھی؟"

فریدہ نے جواب دیا۔ "مشین ہو' کوئی آلہ ہو یا انسانی جسم ہو' بعض اوقات سب ہی میں خرابیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا ہے کہ رکشے اور ٹیکسی کے میٹر کبھی کبھی تیزی سے چلتے ہیں اور فاصلے سے زیادہ کرایہ ظاہر کرتے ہیں۔ اسی طرح ایج میٹر کچھ تیز ہو گیا تھا اور میری عمر سے زیادہ عمر بتا رہا تھا۔"

"کیا ڈاکٹر یوسفی نے تسلیم کیا تھا کہ ایج میٹر میں خرابی پیدا ہو گئی ہے؟"

"جی نہیں' وہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ ان کا تجربہ کامیاب ہے۔ اسی لئے انہوں نے ایج میٹر کی خرابی کو تسلیم نہیں کیا۔"

"آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ ڈاکٹر یوسفی جھوٹ کہہ رہے تھے۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں ان کی سچائی کا ثبوت وہ ایج میٹر تھا جسے ایک عورت چرا کر لے گئی ہے۔ کیا آپ اس عورت کو جانتی ہیں؟"

"نہیں' وہ میرے لئے اجنبی تھی۔"

انسپکٹر نے دوسری عورت کو مخاطب کیا۔ "آپ کا نام کیا ہے؟"

"میرا نام حمیدہ بانو ہے۔"

"ڈاکٹر نے آزمائش کے لئے آپ کا انتخاب کیوں کیا تھا؟"

"میں ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں اور ایک سوشل ورکر ہوں نچلے طبقے کی عورتوں اور اونچے طبقے کی عورتوں سے میرا رابطہ قائم رہتا ہے۔ ڈاکٹر یوسفی نے اسی لئے میرا انتخاب کیا تھا کہ اس معاشرے کی تمام عورتوں سے میں ملتی رہتی ہوں۔ کتنے ہی سرکاری اور غیر سرکاری اداروں میں میرا آنا جانا رہتا ہے۔ اس لئے ہر طرح کے مردوں سے بھی سابقہ پڑتا ہے۔ ڈاکٹر یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ مجھ جیسی عورت جو خواتین کی فلاح و بہبود کے لئے ہمیشہ پیش پیش رہتی ہے اور ان کے حقوق کے لئے لمبی لمبی تقریریں کرتی رہتی ہے' وہ اپنی عمر کے معاملے میں کتنا سچ بولتی ہے۔"

"اچھا تو پھر ایج میٹر نے کیا بتایا؟"

حمیدہ بانو نے ناگواری سے منہ بنا کر کہا۔

"وہ ایج میٹر میری نظروں میں ایک کھلونا تھا' جس سے ڈاکٹر کھیل کر خود کو بہت بڑا موجد کہلوانا چاہتے تھے۔ میں مس فریدہ کے خیال سے متفق ہوں اگر وہ واقعی ایج میٹر ہی تھا تو اس میں خرابی پیدا ہو گئی تھی۔ آپ ہی بتائیے کیا میں آپ کو پچاس برس کی لگتی ہوں' میرا تیسرا خاوند اس بات کا گواہ ہے کہ میں کتنی عمر کی ہوں۔ مگر وہ ایج میٹر طوفانی رفتار سے چلتا ہے۔ ساڑھے بیس برس کو پچاس برس بتاتا ہے۔"

انسپکٹر نے دونوں عورتوں کو باری باری دیکھا کچھ سوچ کر کہنے لگا۔

"اگر آپ دونوں کی باتیں درست ہیں کہ وہ ایج میٹر ایک فضول سی چیز ہے تو پھر وہ تیسری عورت اس فضول سی چیز کو لے کر کہاں غائب ہو گئی ہے۔ اسی کی خاطر اس نے ڈاکٹر کو مار ڈالا ہے۔ جس چیز کی چوری ہو اور اس کے لئے قتل بھی ہو' کیا اس کی اہمیت سے انکار کیا جا سکتا ہے؟"

"میں نہیں جانتی کہ اس تیسری عورت نے اس ایج میٹر کو اتنی اہمیت کیوں دی جو ایج میٹر نہیں تھا بلکہ ہم عورتوں کا مذاق اڑانے کا ایک ناکام حربہ تھا۔"

انسپکٹر نے فریدہ بیگم سے پوچھا۔

"آپ بتائیں کہ اس ایج میٹر کی کوئی اہمیت نہیں تھی تو پھر وہ اسے لے کر کیوں بھاگ گئی' اس کے لئے قتل کیوں کیا؟"

فریدہ بیگم نے جواب دیا۔

"اس مہنگائی کے زمانے میں چار پیسے کی کیا اہمیت ہے؟ لیکن ایسے مجرم بھی ہوتے

ہیں جو چار پیسے کے لئے کسی کو قتل کر دیتے ہیں۔ اگر اس نادان عورت نے ڈاکٹر کو ہلاک کیا ہے اور ایج میٹر لے کر چلی گئی ہے تو اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جس انداز میں عورتوں کا مذاق اڑایا جا رہا تھا اسے وہ عورت برداشت نہ کر سکی۔ اس نے یہ نہیں سوچا کہ اسے چرا کر لے جائے گی تو خواہ مخواہ اس فضول سی چیز کی اہمیت بڑھ جائے گی۔"

حمیدہ بانو نے انسپکٹر سے کہا۔

"آپ یقین کریں کہ ایج میٹر کا تجربہ ایسا ہی ہے جیسے کھودا پہاڑ اور نکلا چوہا۔ آپ سے درخواست ہے کہ آپ اس ایج میٹر کو صرف اس لئے اہمیت دیں کہ اس فضول سی چیز کے لئے ایک قتل ہوا ہے۔"

"اچھی بات ہے۔ چلئے اس قتل کے سلسلے میں میری مدد کیجئے اور یہ بتایئے کہ وہ تیسری عورت کون تھی۔ آپ تو اس شہر کی بے شمار عورتوں سے ملتی رہتی ہیں۔ اس عورت کو بھی یقیناً جانتی ہوں گی۔"

"مجھے افسوس ہے کہ میں اسے نہیں جانتی۔ جس وقت وہ ایج میٹر لے کر بھاگ رہی تھی' میں نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی' مگر وہ جسمانی طور پر مجھ سے مضبوط ہے۔ اس نے مجھے دھکا دے دیا میں ایک میز سے ٹکرا گئی' شیشے کی کتنی ہی چیزیں گر کر ٹوٹ گئیں پھر وہ میرے سنبھلنے سے پہلے ہی کھڑکی سے کود کر بھاگ گئی۔"

تھانے میں کچھ اور لوگ بھی موجود تھے۔ یہ لوگ ڈاکٹر کی لیبارٹری میں موجود تھے۔ انسپکٹر نے ان سے بھی پوچھا کہ اگر کوئی اس تیسری عورت کو جانتا ہو تو اس کے متعلق بتائے' لیکن کوئی کچھ نہ بتا سکا۔ وہ تیسری عورت ان سب کے لئے اجنبی تھی۔

دوسرے دن انسپکٹر نے انصار یوسفی سے ملاقات کی۔ انصار یوسفی اپنی کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا' باپ کی موت کا غم غلط کرنے کے لئے وہسکی پی رہا تھا۔ انسپکٹر نے تیسری عورت کے متعلق پوچھا تو وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر باپ کی لائبریری میں گیا اور وہاں سے ایک نوٹ بک اٹھا کر لے آیا پھر انسپکٹر کی طرف اسے بڑھاتا ہوا بولا۔

"ڈیڈی نے اس نوٹ بک میں لکھا ہے کہ وہ تینوں عورتیں کون ہیں اور آزمائش کے لئے ان کا انتخاب کیوں کیا گیا تھا۔"

انسپکٹر نوٹ بک کھول کر پڑھنے لگا۔ مس فریدہ اور حمیدہ بانو کے متعلق وہی باتیں لکھی ہوئی تھیں جو وہ تھانے میں کہہ چکی تھیں۔ تیسری عورت کے متعلق لکھا تھا کہ اس کا نام نازنین تھا اور وہ اس شہر کے ایک چکلے کی طوائف تھی۔

طوائف بھی اس معاشرے کی ایک اہم ہستی ہے۔ شریف آدمیوں کی غلاظتوں کو ڈسٹ بن یا کچرا خانے کی طرح سمیٹ کر اپنی ذات تک محدود کر لیتی ہے اور سوشل ورکر کی طرح مردوں کی فرحت و تازگی کے لئے دن رات مصروف رہتی ہے۔ یہ اتنی خوش اخلاق ہوتی ہے کہ ہر مرد کو مسکرا کر خوش آمدید کہتی ہے۔ ہمیشہ ایمانداری کا سودا کرتی ہے۔ اس ہاتھ لیتی ہے اس ہاتھ دیتی ہے۔ لین دین میں کبھی گڑبڑ نہیں کرتی' صرف اپنے کاروبار کو چمکانے کی خاطر اپنی عمر کم سے کم بتاتی ہے۔

ڈاکٹر یوسفی نے اچھے اور برے ماحول سے ایسی عورتوں کا انتخاب کیا تھا جو معاشرے میں اہم کردار ادا کرتی تھیں۔ نوٹ بک میں ان تینوں عورتوں کے نام اور پتے درج تھے۔ نازنین اتنی نادان تو نہیں تھی کہ اپنے ٹھکانے پر موجود رہتی۔ پھر بھی انسپکٹر نے انصار یوسفی سے کہا کہ وہ اس کے ساتھ نازنین کے کوٹھے تک چلے۔ انسپکٹر نہ کہتا تب بھی انصار اپنے فرض کو سمجھتا تھا کہ اسے اپنے باپ کی قاتلہ نازنین کو عدالت تک پہنچانا ہے۔ اگر بدقسمتی سے اس چکلے میں نازنین نہ ملتی تو خوش قسمتی سے دوسری کتنی ہی نازنینیں پینے پلانے کے لئے مل سکتی تھیں۔

☆======☆======☆

وہ دونوں جب بازارِ حُسن میں پہنچے تو رات جوان ہو رہی تھی۔ کوٹھوں کی کھڑکیوں' بالکونیوں اور برآمدوں میں ہر عمر کی جوانیاں جگمگا رہی تھیں۔ گلیوں میں دل والے اور دولت والے اِترا کر چل رہے تھے اور حسن و شباب کی چکاچوند میں اپنی اپنی پسند کی عمر تلاش کر رہے تھے لیکن سج دھج کر بیٹھنے والیوں کے چہروں پر اتنا گہرا میک اپ تھا کہ سینکڑوں کینڈل پاور کی روشنی میں بھی ان کی صحیح عمر کا اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ سب ہی کچی کلیاں نظر آتی تھیں۔

نازنین کے کوٹھے سے ناچنے گانے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ دونوں بڑے سے ہال میں پہنچے تو نازنین کی بہن مہ جبیں گھنگھرو باندھے تماشائیوں کے درمیان جھوم جھوم کر رقص کر رہی تھی۔ اس کی ماں پولیس انسپکٹر کو دیکھتے ہی جلدی سے دروازے پر آ گئی اور اسے بڑے ادب سے سلام کرتے ہوئے دوسرے کمرے میں چلنے کے لئے کہا۔ انصار انسپکٹر کے ساتھ چلتے ہوئے مہ جبیں کی جانب دیکھنے لگا۔ وہ بہت حد تک نازنین سے مشابہہ تھی۔ انصار نے نازنین کو لیبارٹری میں جانے سے پہلے دیکھا تھا۔ اب مہ جبیں کو دیکھ کر نازنین کی پوری تصویر آنکھوں میں اتر آئی تھی۔ وہ جو کوئی بھی تھی' گھنگھرو باندھے شعلے کی طرح

مچل رہی تھی اور رقص کے کتنے ہی زاویوں سے اپنے حسن و شباب کی شراب چھلکا رہی تھی۔ انصار کے اندر نشے کی پیاس بڑھ گئی تھی۔

مہ جبیں کی ماں انہیں ایک آرام دہ خواب گاہ میں لے آئی۔ انصار ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ انسپکٹر نے بائی جی سے پوچھا۔

"نازنین کہاں ہے؟"

"کون نازنین؟" بائی جی نے پوچھا۔ "کیا آپ میری بڑی لڑکی کو پوچھ رہے ہیں؟"

"میں نہیں جانتا کہ وہ تمہاری بڑی لڑکی ہے یا چھوٹی۔ مجھے اس کی عمر سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ تم اسے یہاں بلاؤ۔"

"اے سرکار! آپ تو گڑھے مُردے اکھاڑنے آئے ہیں' میں اسے کیسے بلاؤں؟ وہ تو مرچکی ہے۔"

انسپکٹر اور انصار دونوں نے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر انسپکٹر نے پوچھا۔

"وہ کب اور کیسے مرگئی؟"

"کیا بتاؤں کہ کیسے مرگئی؟ اسے ڈبل نمونیہ ہو گیا تھا۔ دو دن تک سخت بخار میں مبتلا رہ کر اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔ یہ ایک برس پہلے کی بات ہے لیکن آج اس کے متعلق آپ کیا پوچھنے آئے ہیں؟"

انصار اور انسپکٹر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ نازنین پچھلی شام ڈاکٹر کی لیبارٹری میں موجود تھی اور اس کی ماں بتا رہی تھی کہ وہ ایک برس پہلے ہی مرچکی ہے۔ انسپکٹر نے ناگواری سے پوچھا۔

"کیا تم مذاق کر رہی ہو؟"

"اے سرکار! میری کیا مجال ہے کہ آپ سے مذاق کروں۔ اس محلے کی جتنی طوائفیں ہیں سب ہی گواہی دیں گی کہ میں سچ کہہ رہی ہوں۔ ڈاکٹر فاروقی نازنین کے معالج تھے۔ مجھ سے جب بھی ملاقات ہوتی ہے تو وہ نازنین کی موت پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ بہت مشہور ڈاکٹر ہیں آپ نے بھی ان کا نام سنا ہو گا۔ میں ان کا فون نمبر بتاتی ہوں آپ تصدیق کر لیں۔"

انسپکٹر اس کا بتایا ہوا فون نمبر نوٹ کرنے لگا۔ انصار نے بائی جی سے کہا۔

"کل دوپہر کے وقت میں نے نازین کو اپنے ڈیڈی کی لیبارٹری میں جاتے دیکھا ہے۔ اگر نازنین ایک سال پہلے مرچکی ہے تو پھر میں نے اُس عورت کو دیکھا ہے جو ابھی

دوسرے کمرے میں ناچ رہی ہے۔ اس کا نام کیا ہے؟"

"اس کا نام مہ جبیں ہے۔ یہ اپنی بڑی بہن نازنین کی ہمشکل ہے۔ ٹھہریئے' میں آپ کو دونوں بہنوں کی تصویریں دکھاتی ہوں۔ پھر آپ کو یقین آ جائے گا۔"

وہ الماری کے پاس گئی' پھر اسے کھول کر ایک البم نکال کر لے آئی۔ البم میں دونوں بہنوں کی مختلف اوقات کی کتنی ہی تصویریں تھیں۔ بائی جی وہ تصویریں دکھاتی ہوئی کہہ رہی تھی۔

"دونوں بہنوں میں بے پناہ محبت تھی۔ نازنین کی موت کے بعد مہ جبیں صدمہ سے بیمار پڑ گئی تھی۔ وہ اکثر خود کو نازنین کہتی ہے۔ وہ اس نام کو اپنا کر اپنے اندر اپنی بہن کو محسوس کرتی ہے۔ آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر کہتی ہے کہ میرے سامنے مہ جبیں کھڑی ہے اور میں نازنین ہوں۔ سرکار! خود کو بڑی بہن کے نام سے پکارنا جرم تو نہیں ہے؟"

"ہاں یہ جرم نہیں ہے لیکن یہ اگر خود کو نازنین کہتی ہے تو ہم اسی کی تلاش میں آئے ہیں۔ اس نے ڈاکٹر جبار یوسفی کو اپنا نام نازنین بتایا ہو گا۔"

"کون ڈاکٹر جبار یوسفی؟" بائی جی نے پوچھا۔ "میری بیٹی کسی ڈاکٹر یوسفی کو نہیں جانتی ہے اور نہ ہی کبھی اس کی لیبارٹری میں گئی ہے۔ کیا ڈاکٹر یوسفی نے میری بیٹی کے خلاف کوئی شکایت کی ہے؟"

"وہ شکایت کرنے کے لئے اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ تمہاری بیٹی نے انہیں ہلاک کر دیا ہے۔"

"نہیں........." وہ گھبرا کر ایک قدم پیچھے چلی گئی۔ "یہ میری بچی پر الزام ہے اس نے آج تک ایک چیونٹی کو نہیں مارا۔ اتنے بڑے آدمی کو کیا مارے گی۔"

"کیا وہ کل شام کو ڈاکٹر کی لیبارٹری میں نہیں گئی تھی؟"

"نہیں.. کل شام کو وہ یہاں اپنے کمرے میں آرام کر رہی تھی۔ صرف دوپہر کو اپنی ایک سہیلی سے ملنے گئی تھی۔"

انصار نے کہا۔ "سہیلی سے نہیں' میرے ڈیڈی سے ملنے گئی تھی۔ میں نے دوپہر کو سوا دو بجے اسے لیبارٹری میں جاتے دیکھا ہے۔"

"آپ نے کسی اور کو دیکھا ہو گا۔ میں مہ جبیں کو بلاتی ہوں وہ آپ کو مطمئن کر دے گی کہ دوپہر کے وقت کہاں تھی۔"

یہ کہہ کر وہ خوابگاہ سے چلی گئی۔ انسپکٹر نے انصار سے پوچھا۔

"وہ تینوں عورتیں کل شام کو لیبارٹری میں گئی تھیں۔ آپ کہتے ہیں کہ آپ نے مہ جبیں کو دوپہر کے وقت دیکھا ہے۔ کیا تمہارے ڈیڈی نے اسے دوپہر کو بلایا تھا؟"

"جی ہاں۔ صرف اسی کو نہیں' ان دو عورتوں کو بھی تجربے سے تین گھنٹے پہلے بلایا تھا۔ لیبارٹری کے ساتھ تین کمرے اور ایک لائبریری ہے۔ ڈیڈی نے ان تینوں کو تین مختلف کمروں میں آرام سے لیٹنے کے لئے کہا تھا اور خود لائبریری میں چلے آئے تھے۔ وہاں انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ تینوں عورتیں ائرکنڈیشنڈ کمرے میں آرام کر رہی ہیں' تاکہ وہ ٹھنڈے کمرے میں ٹھنڈے دماغ سے ٹھنڈی ٹھنڈی باتیں سوچتی رہیں۔ اس طرح وہ نارمل کنڈیشن میں رہیں گی اور ایج میٹر ان کے نارمل ٹمپریچر سے ان کی صحیح عمر بتا سکے گا۔ میں لیبارٹری کے کاموں میں انہیں اسسٹ کرتا ہوں لیکن کل انہوں نے مجھے اس لئے لیبارٹری سے باہر رکھا کہ میں نوجوان ہوں اور عورتیں یہ پسند نہیں کرتیں کہ ایج میٹر میرے سامنے ان کی صحیح عمر بتائے۔ اس لئے میں تجربے سے پہلے ہی لیبارٹری سے باہر آ گیا تھا۔

وہاں پریس رپورٹرز' فوٹوگرافرز اور حکومت کے چند اعلیٰ افسران اپنی بیگمات کے ساتھ شام کو آئے تھے۔ ان کے علاوہ اور بہت سی عورتیں تھیں انہوں نے اخبارات میں ایج میٹر کے متعلق پڑھا تھا۔ اس تجربے کے نتائج معلوم کرنے کے لئے وہ چلی آئی تھیں لیکن ان میں سے کسی نے ان تین عورتوں کو نہیں دیکھا تھا۔ لیبارٹری کا دروازہ کھلنے کے بعد وہ دو عورتیں نظر آئی تھیں۔ تیسری عورت کو صرف میں نے دوپہر کے وقت دیکھا تھا اور وہ تیسری عورت یہی مہ جبیں ہے۔"

مہ جبیں کا نام لیتے ہی اس نے دروازے کی جانب دیکھا۔ وہ گھنگھروؤں کی تال پر ایک ادائے ناز سے بل کھاتی ہوئی آ رہی تھی۔ اس نے آتے ہی جھک کر آداب کیا۔

"فرمایئے سرکار! یہ کنیز آپ کی خدمت کے لئے حاضر ہے۔ ماں جی نے بتایا ہے کہ آپ مجھ پر کسی قتل کا الزام لگا رہے ہیں۔ یہ درست ہے کہ میں قاتلہ ہوں۔ میرا پیشہ یہی ہے۔ قانون نے مجھے نگاہوں سے اور اداؤں سے قتل کرنے کا باقاعدہ لائسنس دیا ہے۔"

اس کی باتوں سے ظاہر ہو گیا کہ وہ بڑی تیز طرار ہے۔ انسپکٹر نے اسے ناگواری سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"بیٹھ جاؤ۔ جو کچھ میں پوچھتا ہوں اس کا صحیح جواب دو۔"

وہ بیٹھتی ہوئی بولی۔ "میرا مجرا سننے والے بڑی بے چینی سے میرا انتظار کر رہے ہیں'

اگر میں یہاں زیادہ دیر تک بیٹھی رہ گئی تو آج کی آمدنی ماری جائے گی۔"

انصار نے اس کے حسن کی آنچ سے پگھلتے ہوئے پوچھا۔

"تمہاری ایک رات کی آمدنی کتنی ہے؟"

"کبھی ہزار' کبھی دو ہزار' تماش بین موڈ میں آ جائیں تو پانچ ہزار بھی مل جاتے ہیں۔ کیا آپ بولی دیں گے؟"

"ہاں!" انصار نے کہا۔ "آج اپنی دکان بند کر دو اور اس خوابگاہ کے دروازے میرے لئے کھلے رہنے دو۔ میں تمہیں تین ہزار دوں گا۔"

اس کی بات سن کر بائی جی دوسرے تماشائیوں کو رخصت کرنے چلی گئی۔ مہ جبین اپنے پاؤں کے گھنگھرو کھولنے لگی۔ انسپکٹر نے کہا۔

"انصار صاحب! آپ میری موجودگی میں ایسا سودا نہ کریں۔"

"اس میں حرج ہی کیا ہے؟" مہ جبیں نے پوچھا۔ "آپ تو اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہاں ایسے ہی سودے ہوتے ہیں۔"

"بکواس مت کرو۔" انسپکٹر نے ڈانٹ کر کہا۔ "میری بات کا جواب دو کہ ڈاکٹر جبار یوسفی سے تمہاری ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی؟"

"میں کسی ڈاکٹر جبار یوسفی کو نہیں جانتی ہوں۔"

"تم جھوٹ بولتی ہو۔ ڈاکٹر کی نوٹ بک میں تمہارا نام اور پتہ درج ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ کل سے پہلے بھی تمہاری اُن سے ملاقات ہو چکی ہے۔ انہوں نے ایج میٹر کو آزمانے کے لئے تمہیں کل لیبارٹری آنے کے لئے کہا تھا۔ تم کل دوپہر کو وہاں گئی تھیں۔ شام تک وہاں رہیں۔ پھر موقع پا کر تم نے ڈاکٹر پر حملہ کیا اور ایج میٹر لے کر وہاں سے چلی آئیں۔ انصار صاحب نے اپنی آنکھوں سے تمہیں لیبارٹری میں دیکھا تھا۔"

"اچھا!" مہ جبیں نے حیرانی سے پلکیں جھپکاتے ہوئے انصار کو دیکھ کر پوچھا۔ "کیا واقعی آپ نے مجھے وہاں دیکھا تھا؟"

"ہاں' میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔"

مہ جبیں نے اس کی عینک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"کیا یہ عینک لگا کر آپ نے دیکھا تھا؟"

"آں!" وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "نہیں' میں برآمدے میں کھڑا ہوا رومال سے عینک کے شیشے صاف کر رہا تھا' اسی وقت تم برآمدے کے آخری سرے پر نظر آئیں۔ تم لیبارٹری

کا دروازہ کھول کر اندر جا رہی تھیں۔ دوری کی وجہ سے تمہارا چہرہ دھندلا نظر آ رہا تھا۔ اب تمہیں اس عینک سے دیکھ کر کہہ سکتا ہوں کہ وہ تم ہی تھیں۔"

"آپ کے کہنے سے میں وہاں نہیں ہو سکتی۔ ایک تو آپ کی آنکھیں کمزور ہیں' اوپر سے آپ نے چشمہ نہیں لگا رکھا تھا۔ انسپکٹر صاحب! تعجب ہے کہ آپ ان کی بینائی پر کس طرح بھروسہ کر کے یہاں آئے ہیں۔"

انصار نے کہا۔ "یہ درست ہے کہ میری بینائی کچھ کمزور ہے اس کے باوجود ہم دور سے کسی کو دیکھ کر یہ اندازے سے کہہ سکتے ہیں کہ ہم کسے دیکھ رہے ہیں۔"

"اندازے غلط بھی ہو جاتے ہیں۔" مہ جبین نے کہا۔ "آپ کی گواہی قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ اگر آپ کے علاوہ کسی اور نے مجھے وہاں دیکھا ہو تو بتایئے؟"

انسپکٹر نے کہا۔ "نہیں' کسی اور نے تمہیں نہیں دیکھا ہے لیکن ڈاکٹر کی نوٹ بک میں تمہارا نام اور پتہ درج ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ لیبارٹری میں آنے والی تیسری عورت تم ہی ہو۔ تمہارا نام مہ جبین ہے لیکن تم خود کو نازنین کہتی ہو اور یہی نام تم نے ڈاکٹر یوسفی کو بتایا تھا۔"

وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

"ہاں میں خود کو نازنین کہتی ہوں۔ کاش وہ زندہ رہتیں اور ان کے بدلے میں مر جاتی۔ وہ مجھ سے اتنا پیار کرتی تھیں' اتنا پیار کرتی تھیں کہ مرنے کے بعد بھی نہ مر سکیں۔ میرے اندر سما گئی ہیں۔ بعض اوقات میں بڑی شدت سے یہ محسوس کرتی ہوں کہ میں نازنین ہوں اور مہ جبین مر چکی ہے۔"

یہ کہتے وقت مہ جبین کا چہرہ جوشِ محبت سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک پیدا ہو گئی تھی۔ اس کی آوز بھی قدرے بدل گئی تھی انسپکٹر اور انصار نے محسوس کیا کہ وہ بیٹھے ہی بیٹھے یکلخت بدل گئی ہے۔ اب وہ کچھ دیر پہلے کی مہ جبین نہیں ہے۔ شاید نازنین بن گئی تھی۔

وہ چند لمحوں کی تبدیلی تھی۔ اس کے بعد وہ فوراً ہی سنبھل گئی۔ انسپکٹر نے تعجب سے پوچھا۔

"یہ تمہاری آواز کیسے بدل گئی ہے؟"

"آں' نہیں تو' میری آواز تو بالکل ٹھیک ہے۔ میری یہ سریلی آواز سننے کے لئے روزانہ سینکڑوں تماش بین آتے ہیں۔"

مہ جبین کی آواز واقعی سریلی تھی اور وہ اپنی آواز میں بول رہی تھی۔ انسپکٹر نے سوچا کہ شاید اس کے سننے اور سمجھنے میں کوئی گڑبڑ ہو گئی تھی۔ اس نے پوچھا۔

"کیا تم نے ڈاکٹر جبار یوسفی کو اپنا نام نازنین نہیں بتایا تھا؟"

"میں تو سب ہی کو یہی نام بتاتی ہوں لیکن ڈاکٹر یوسفی کو نہیں جانتی۔ خدا جانے انہیں میرا نام اور پتہ کیسے معلوم ہو گیا تھا۔ ویسے میری اتنی شہرت ہے کہ دل والے اپنے دل کی نوٹ بک میں میرا نام اور پتہ نوٹ کر کے رکھتے ہیں۔ کیا ان کی عمر ایسی تھی کہ وہ میرا پتہ نوٹ کر کے رکھتے؟"

انسپکٹر نے ناگواری سے کہا۔ "فضول باتیں نہ کرو۔ جب تک میں تمہارے متعلق پوری تحقیقات نہیں کر لوں گا اس وقت تک تم حراست میں رہو گی۔"

انصار یوسفی مایوسی سے مہ جبین کو دیکھنے لگا۔ اس نے کچھ دیر پہلے اس حسینہ کی ایک رات کی بولی دی تھی اور انسپکٹر اسے حراست میں لینا چاہتا تھا۔ مہ جبین نے انصار کو قاتل نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا آپ میری ضمانت نہیں دے سکیں گے؟"

"ہاں ہاں کیوں نہیں؟" اس نے جلدی سے کہا۔ "انسپکٹر صاحب! آپ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔ آپ کی تحقیقات مکمل ہونے تک اگر میں مہ جبین کو اپنی کوٹھی میں رکھوں تو کیا آپ کو اعتراض ہو گا؟ میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں پوری طرح ان کی نگرانی کروں گا۔"

انسپکٹر نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "آپ میرے ساتھ آیئے میں اس سلسلے میں کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

انصار انسپکٹر کے ساتھ کمرے سے باہر چلا گیا۔ مہ جبیں اپنا لباس بدلنے کے لئے باتھ روم میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں خوابگاہ میں واپس آئے۔ انسپکٹر نے بائی جی سے نازنین اور مہ جبیں کی دو چار مختلف تصویریں مانگیں۔ بائی جی نے البم سے نکال کر دے دیں۔ پھر اس نے انصار سے کہا۔

"میں ان دو عورتوں سے ملوں گا جو آپ کے ڈیڈی کی لیبارٹری میں تھیں۔ انہوں نے نازنین کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ وہ ان تصویروں کو دیکھتے ہی مجرمہ کو پہچان لیں گی۔ اب میں جاتا ہوں۔ کل صبح آ کر ملاقات کروں گا۔"

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ مہ جبیں لباس بدل کر آئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ اور بائی جی انصار

کی کار میں بیٹھ کر اس کی کوٹھی میں آ گئیں۔ انصار نے بائی جی کے لئے ایک کمرہ کھلوا دیا اور مہ جبیں کو لے کر اپنی خوابگاہ میں چلا گیا۔ ان کے جانے کے بعد بائی جی اپنے کمرے سے نکل کر ڈرائنگ روم میں آئی۔ وہاں صوفوں کے درمیان میز پر ٹیلیفون رکھا ہوا تھا۔ اس نے ریسیور اٹھا کر کسی کے نمبر ڈائل کئے۔ پھر رابطہ قائم ہوتے ہی دھیمی آواز میں کہنے لگی۔

"ہیلو' میں بلقیس بائی بول رہی ہوں۔ میڈم! آپ نے کہا تھا کہ کوئی گڑبڑ نہیں ہو گی' مگر ایک پولیس انسپکٹر میری بیٹی کے پیچھے پڑ گیا ہے۔ ڈاکٹر یوسفی کا لڑکا انصار یوسفی اسے ضمانت پر اپنی کوٹھی میں لے آیا ہے' میں اسی کوٹھی سے فون کر رہی ہوں۔"

دوسری طرف سے کسی عورت نے کہا۔ "تم بے فکر رہو مہ جبیں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ انسپکٹر کو اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ملے گا۔"

بائی جی نے کہا۔ "انسپکٹر میرے ہاں سے نازنین اور مہ جبیں کی تصویریں لے گیا ہے۔ وہ ان دو عورتوں کے پاس جائے گا جو لیبارٹری میں تھیں۔ وہ تصویریں دیکھ کر انسپکٹر کو بتائیں گی کہ مہ جبیں وہاں موجود تھی۔"

"وہ نہیں بتائیں گی۔ میں نے مس فریدہ اور حمیدہ بانو کو پہلے ہی سمجھا دیا ہے۔ پولیس کی شناختی پریڈ میں جتنی عورتیں آئیں گی وہ دونوں مجرمہ کو پہچاننے سے انکار کر دیں گی۔ اس طرح پولیس والے اصل مجرمہ کو تلاش کرتے رہیں گے اور کبھی اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکیں گے۔ جاؤ تم اطمینان سے سو جاؤ۔"

دوسری طرف سے ریسیور رکھ دیا گیا۔ بائی جی بھی ریسیور رکھ کر زیرِ لب بڑبڑاتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

انصار کی خوابگاہ میں وہسکی کی بوتل کھلی ہوئی تھی۔ مہ جبیں پلا رہی تھی' وہ پی رہا تھا۔ نگاہوں کے سامنے شراب اور شباب کا نشہ گڈمڈ ہو رہا تھا۔ وہ مستی میں آ کر اسے آغوش میں لینے کے لئے بڑھا۔ وہ کترانے لگی۔ بازاری عورت جانتی ہے کہ کس طرح مرد کے ہوسناک ارادوں سے بچنا چاہئے۔ قریب آنے سے پہلے اسے خوب پلانا چاہئے۔ اس کے بعد اس سے کترانا چاہئے' دور ہی دور رہ کر اسے للچانا چاہئے' وہ دیوانہ ہو کر اس کی خوشامدیں کرے گا۔ نشے میں لڑکھڑائے گا اور پاس آنے کی کوشش کرے گا۔ اس کوشش میں یا تو تھک کر ہانپنے لگے گا یا نشے میں گر پڑے گا۔ تھک جانے والا گر جانے والا مرد' مرد نہیں ہوتا ایک بیچارہ سا گاہک ہوتا ہے جسے وہ تھپک تھپک کر سلا دیتی ہے۔

انصار پر نشہ حاوی ہو رہا تھا اس کے باوجود کسی قدر ہوش میں تھا۔ ہر شرابی کی طرح خود کو ہوشمند سمجھ رہا تھا لیکن مہ جبیں کچھ زیادہ ہی چالاک تھی۔ اس نے پلانے کے دوران اس کی عینک چھپا دی تھی۔

"کہاں ہے میری عینک؟" وہ بیک وقت عینک کو بھی تلاش کر رہا تھا اور مہ جبیں کے قریب پہنچنے کی بھی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ عینک کے بغیر دھندلی دکھائی دے رہی تھی اور نشے کی زیادتی سے ایک کی بجائے دو نظر آ رہی تھی۔ دو بہنوں کی تصویر کی طرح ایک طرف نازنین دکھائی دے رہی تھی دوسری طرف مہ جبیں۔ مہ جبیں نے کہا۔

"میں آپ کی عینک تلاش کروں گی۔ پہلے آپ یہ بتایئے کہ آپ کے ڈیڈی نے ایج میٹر بنا کر عورتوں سے دشمنی کیوں کی ہے؟"

"انہوں نے کوئی دشمنی نہیں کی بلکہ عورتوں پر احسان کیا ہے۔ اب وہ ایج میٹر کے خوف سے کبھی جھوٹ نہیں بولیں گی۔"

"آپ لوگ عورت کے جھوٹ کے ایک ہی پہلو کو دیکھتے ہیں کہ وہ خود کو جاذبِ نظر بنانے کے لئے اپنی عمر کم بتاتی ہے۔ آپ یہ نہیں سوچتے کہ کتنی ہی لڑکیاں تیس برس اور پینتیس برس تک بن بیاہی بیٹھی رہتی ہیں اور محض اس لئے خود کو کم عمر کہتی ہیں کہ کوئی عزت آبرو سے انہیں شریکِ حیات بنا لے۔

آپ یہ نہیں سوچتے کہ عورتوں کو ملازمت دینے والی فرمیں سب سے پہلی شرط یہی رکھتی ہیں کہ عورت کم عمر ہو۔ ایسی صورت میں ملازمت کرنے کے لئے عورت کو جھوٹ بولنا ہی پڑتا ہے۔

آپ یہ نہیں سوچتے کہ ایج میٹر عام ہو گیا تو ہم طوائفوں کا کتنا زبردست نقصان ہو گا۔ ہمارے گاہک ہمیں اپنی نگاہوں سے تولنے کے بجائے ایج میٹر سے ہماری عمر معلوم کریں گے' عمر کم ہو گی تو بھاؤ بڑھائیں گے' زیادہ ہوئی تو بھاؤ گھٹائیں گے اور میں جانتی ہوں کہ ہمارا بھاؤ گرتا ہی جائے گا کیونکہ بازارِ حُسن میں کھیلی کھلائی عورتیں آتی ہیں۔ باہر کی دنیا میں اچھی خاصی عمر گزارنے اور تجربے حاصل کرنے کے بعد چکلے کے جہنم میں داخل ہوتی ہیں۔ وہاں بھی اگر ایج میٹر نے ان کی عمر کی چغلی کھائی تو پھر وہ سب دھندا کیسے کر سکیں گی۔

آپ نہیں جانتے کہ میری بہن نازنین اپنی عمر کا حساب کرتے کرتے مر گئی ہے۔ وہ جسمانی لحاظ سے بھاری بھرکم تھی جس نوجوان کو وہ چاہتی تھی اس نوجوان نے یہ کہہ کر

اسے ٹھکرا دیا تھا کہ اس کی عمر زیادہ ہے۔ جب مرد کا دل بھر جاتا ہے تو وہ اسے پرانی اور عمر والی سمجھ کر دوسری کی تلاش شروع کر دیتا ہے۔ نازنین یہ صدمہ برداشت نہ کر سکی۔ بارش میں بھیگنے کا بہانہ تھا۔ اسے ڈبل نمونیہ ہو گیا۔ وہ بخار کی حالت میں بھی بڑبڑاتی رہی کہ اس کی عمر زیادہ ہو گئی ہے اور وہ جوانی میں بوڑھی ہو گئی ہے۔

میں جب بھی نازنین کی موت کے متعلق سوچتی ہوں تو مجھے مردوں سے نفرت ہو جاتی ہے۔ مجھے دل و جان سے زیادہ چاہنے والی بہن صرف اس لئے مر گئی کہ اس کی عمر کا حساب کرنے میں ناانصافی کی گئی تھی۔ آپ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ ہم چند سکوں کے عوض اپنی جوانی کا سرمایہ آپ کے حوالے کر دیتی ہیں۔ آپ تو محض عمر کا دھوکا کھا کر خوش ہو جاتے ہیں۔ اب تو میں جب بھی کسی کو دھوکا دیتی ہوں تو میرے اندر نازنین زندہ ہو جاتی ہے۔ یہ اچھا ہی ہوا کہ ایج میٹر چوری ہو گیا۔ آپ کے ڈیڈی بھی اس دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں۔ اب کوئی دوسرا ایج میٹر تیار نہیں ہو سکے گا۔ یہ کتنی خوشی کی بات ہے کہ آپ سب آئندہ بھی عمر کا فریب کھا کر خوش ہوتے رہیں گے۔"

یہ کہہ کر وہ قہقہے لگانے لگی۔ اس کے ساتھ انصار نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔

"دوسرا ایج میٹر میں تیار کروں گا۔ اس کے لئے ڈیڈی نے جو فارمولا تیار کیا تھا اس فارمولے کی تفصیل میرے پاس محفوظ ہے۔"

مہ جبین کا ہنستا ہوا چہرہ یکلخت مرجھا گیا۔ اس نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ "تم جھوٹ بولتے ہو' تمہارے پاس فارمولا نہیں ہے۔"

"جھوٹ اور سچ کا پتہ چل جائے گا۔ میرا پہلا فرض یہ ہے کہ اپنے ڈیڈی کی قاتلہ کو اس کے عبرتناک انجام تک پہنچاؤں۔ اس کے بعد میں دوسرا ایج میٹر بناؤں گا اور اسے سب سے پہلے تم پر آزما کر تمہارے گاہکوں کو بتاؤں گا کہ تم اپنی بہن کی طرح بوڑھی ہو۔"

مہ جبین نے غصے سے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں' اندر ہی اندر دانت پیسنے لگی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وہ ایک کرسی کا سہارا لئے کھڑی تھی۔ اس وقت اس کے دماغ میں انصار کی ایک ہی بات گونج رہی تھی کہ تم اپنی بہن کی طرح بوڑھی ہو۔

وہ کرسی کا سہارا لے کر ایسے جھک گئی جیسے بوڑھی ہو گئی ہو اور وہ سچ مچ بوڑھی ہوتی جا رہی تھی۔ انصار نے دونوں بہنوں کی تصویریں دیکھی تھیں۔ تصویر میں دونوں تقریباً ہمشکل تھیں لیکن نازنین عمر زیادہ ہونے کی وجہ سے ذرا بھدی لگتی تھی۔ وہی بھدا

پن رفتہ رفتہ مہ جبین کے چہرے اور جسامت سے ظاہر ہو رہا تھا۔

انصار آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے لگا۔ وہ دھندلی دھندلی سی نظر آ رہی تھی۔ اس کے باوجود سمجھ رہا تھا کہ مہ جبین کچھ بدلتی جا رہی ہے۔ اپنی سابقہ جسامت سے زیادہ بھاری بھرکم ہوتی جا رہی ہے۔ نشے کے عالم میں بھی اسے ڈاکٹر جیکل اور مسٹر ہائیڈ کی وہ کہانی یاد آئی جس میں وہ دو رخی زندگی گزارتا ہے۔ وہ عام حالات میں ڈاکٹر جیکل کی حیثیت سے نارمل زندگی بسر کرتا ہے اور ایک خاص حالت میں جنسی انتقامی جذبات کے تحت مسٹر ہائیڈ کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔

اور وہ روپ بدل رہی تھی۔ اس کے اندر ایک عمر رسیدہ بہن کی جو شخصیت چھپی ہوئی تھی' وہ اُجاگر ہو رہی تھی۔ وہ اپنے سینے پر ہاتھ مارتی ہوئی بولی۔ "میں خود اپنی بہن ہوں۔ مجھے دیکھ سکتا ہے تو دیکھ' اے آنکھ کے اندھے! عینک کے محتاج' میں نازنین ہوں۔"

اگر تصویر کو سامنے رکھ کر دیکھا جاتا تو وہ ہوبہو نازنین تھی۔ نازنین کے اس روپ میں مہ جبین کہیں گم ہو گئی تھیں اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ "تم سب کیسے مرد ہو؟ ہماری جوانی سے کھیلتے ہو اور ہمارے بڑھاپے کا مذاق اڑاتے ہو۔ میری زندگی میں گاہک بہت آئے لیکن محبوب ایک ہی آیا۔ وہ قسمیں کھا کر کہتا تھا کہ نازنین! تم میری زندگی ہو' میری جان ہو' میرا ایمان ہو لیکن جب میں عمر کی منزلیں طے کرنے لگی' میں ذرا موٹی ہونے لگی' ذرا بھدی ہونے لگی اور میرے بدن کا بستر شکن آلود ہونے لگا تو وہ دوسرے بستر کی تلاش میں مجھے چھوڑ کر چلا گیا اور مجھے یہ سکھا گیا کہ مرد کے زیادہ قریب نہ جاؤ' دور ہی دور سے اپنی کم عمری کا یقین دلاؤ۔ وہ آنکھوں کا اندھا بن کر یقین کر لے گا اور ایک رات کے تین ہزار دے گا۔ جیسا کہ آج ایک رات کے لئے تم نے مہ جبین کو دیا ہے۔

"بتاؤ کہاں ہے مہ جبین' جسے تم نے سولہ برس کی چھوکری سمجھ کر خریدا تھا۔ اس وقت تمہارے سامنے نازنین کھڑی ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ مرد اور عورت دونوں ہی ڈاکٹر جیکل اور مسٹر ہائیڈ کی طرح دوہری زندگی گزارتے ہیں؟ مرد اوپر سے ایماندار اور اندر سے بے ایمان ہوتا ہے۔ عورت باہر سے جوان اور اندر سے بوڑھی ہوتی ہے۔

ہم عورتوں نے تمہارے لئے ایمان کا میٹر ایجاد نہیں کیا۔ تم نے ہمارے لئے عمر کا میٹر کیوں تیار کیا ہے؟ اس ایج میٹر کا فارمولا کہاں ہے؟ لاؤ مجھے دو۔ اگر وہ کسی کاغذ پر لکھا ہوا ہے تو میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گی۔ اگر اس کی ترکیب تمہارے دماغ میں

ہے تو میں تمہاری کھوپڑی توڑ دوں گی۔ اس دنیا کی کوئی عورت یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ کوئی اس کی عمر کا حساب کرے۔ بتاؤ اسے کہاں رکھا ہے؟"

یہ کہہ کر وہ اس کی جانب بڑھی۔ اس کا انداز ایسا ہی تھا کہ انصار اس کا مطالبہ پورا نہ کرے گا تو وہ اس کا سر توڑ دے گی۔ وہ ڈگمگاتے ہوئے کہنے لگا۔ "وہ فارمولا ڈیڈی کی ایک ڈائری میں محفوظ ہے۔ میں اپنی جان سے زیادہ اس ڈائری کی حفاظت کرتا ہوں۔ تم اس کی پرچھائیں تک بھی نہیں پہنچ سکو گی۔"

وہ تیزی سے قریب آ گئی۔ انصار نے اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا۔ اس نے ہاتھ جھٹک کر اس کے منہ پر ایک اُلٹا ہاتھ جما دیا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا صوفے کے قریب فرش پر گر پڑا۔ وہ اتنا کمزور نہیں تھا کہ ایک عورت سے مار کھا کر گر جاتا۔ دراصل شراب نے اسے کمزور بنا دیا تھا۔ نشے کے عالم میں وہ اپنا توازن قائم نہیں رکھ سکتا تھا۔ کوئی ایک انگلی سے چھوتا تب بھی گر پڑتا۔ اس وقت وہ فرش سے اٹھتے ہوئے چکرا رہا تھا۔ اس نے بار بار گرتے اور سنبھلتے ہوئے اس اجنبی عورت کو دیکھا جو کتابوں کے ریک میں ڈاکٹر جبار یوسفی کی ڈائری تلاش کر رہی تھی۔

اس نے جھلا کر کہا۔ "خبردار! میری کسی چیز کو ہاتھ نہ لگانا.........."

وہ ایک ڈائری کھول کر دیکھ رہی تھی۔ انصار کے للکارنے پر اس نے یہ سمجھا کہ وہی اس کی مطلوبہ ڈائری ہے جسے ہاتھ لگانے سے منع کیا جا رہا ہے۔ اس نے ڈائری کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر سینے سے لگا لیا۔ اس ایک چھوٹی سی کتاب میں دنیا کی تمام عورتوں کی ایک مشترکہ کمزوری چھپی ہوئی تھی۔ اگر وہ اسے جلا کر راکھ کر دیتی تو رہتی دنیا تک عورتیں اس کی احسان مند رہتیں اور وہ خود اپنی بڑھتی ہوئی عمر کے راز کو چھپا لیتی۔ وہ اسے سینے سے لگا کر دوڑتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔ انصار نے صوفے کا سہارا لے کر اٹھتے ہوئے پھر اسے للکارا۔

"ٹھہرو.......... رک جاؤ.......... وہ ڈائری لے کر نہ جاؤ۔ اس میں میرے ڈیڈی کی زندگی کے چند اوراق.........."

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی وہ اس کی آواز سے دور ہو گئی تھی۔ اس نے اتنا ہی سنا تھا کہ "وہ ڈائری لے کر نہ جاؤ" یہ سن کر ڈائری کی اہمیت اور بڑھ گئی تھی۔ اسے کھول کر دیکھنے اور پڑھنے کا موقع نہیں تھا۔ اگر موقع ملتا تب بھی اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ ایج میٹر کی تفصیلات واضح الفاظ میں ہیں یا اشاروں میں بیان کی گئی ہیں۔ اتنا ہی سمجھ لینا

کافی تھا کہ وہ اسے ڈائری لے جانے سے روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس لئے وہ اس ننھی سی ڈائری کا بوجھ اٹھائے بھاگی جا رہی تھی۔

وہ کوٹھی سے باہر آئی تو ایک کتا بھونکنے لگا۔ وہ ایک لمحے کے لئے ٹھٹک گئی۔ کتا بے ضرر تھا۔ دور ہی دور سے بھونک رہا تھا۔ اگر کاٹنے کی عادت ہوتی تو اب تک اس پر چھلانگ لگا چکا ہوتا۔ وہ ذرا مطمئن ہو کر پھر بھاگنے لگی۔ کوٹھی کے احاطے سے باہر آتے ہی کسی نے اس پر حملہ کیا۔ حملہ آور ایک درخت کے پیچھے کھڑا تھا۔ اس سے حملہ کرنے میں ایک ذرا سی چوک ہو گئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ہاتھ بھر کی آہنی سلاخ تھی جس کا آخری سرا مڑا ہوا تھا۔ دور سے دیکھنے پر وہ ایک لانبی سی ہتھوڑی نظر آتی تھی۔ اس نے اس سلاخ سے بھاگنے والی کے سر پر حملہ کیا تھا۔ مگر وہ اتنی تیزی سے بھاگ رہی تھی کہ نشانے سے آگے نکل گئی۔ وہ حملہ کرنے والا اپنا توازن نہ سنبھال سکا تھا۔ ضرب لگانے کے زور میں زمین پر اوندھے منہ گر پڑا۔ مہ جبین عرف نازنین نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کی سمجھ میں آیا کہ کوٹھی کا کوئی ملازم اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ وہ اور تیزی سے بھاگنے لگی۔ گرنے والا اجنبی جلدی سے اٹھ کر اس کا پیچھا کرنے لگا۔

وہ ایک پتھریلی سڑک پر آگے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ رات کے سناٹے میں ان کے قدموں کی آوازیں دور تک سنائی دے رہی تھیں۔ دور سے ایک دبلا پتلا سا آدمی عینک لگائے چلا آ رہا تھا۔ اس کے شانے سے ایک کیمرہ لٹک رہا تھا۔ اس کیمرے سے ایک فلیش گن منسلک تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ ایک عورت بدحواسی میں بھاگتی چلی آ رہی ہے تو اس نے کیمرہ سنبھال لیا۔ راستے کی نیم تاریکی میں ایک جھماکا سا ہوا اور بھاگتی ہوئی نازنین کی تصویر اتر گئی۔ پھر اس نے فلم کا نمبر بدلتے ہوئے اس اجنبی کو دیکھا جو ہاتھ میں آہنی سلاخ پکڑے بھاگا آ رہا تھا۔

وہ اجنبی کو کیمرے کی زد میں لانے کے لئے بیچ سڑک پر آ گیا۔ پھر اسے للکارنے لگا۔ "اے رک جاؤ.......... خبردار.......... تم ایک عورت کو وہ کرتے ہو یعنی کہ دہشت زدہ کرتے ہو۔ تمہیں وہ نہیں آتی یعنی کہ شرم نہیں آتی.........."

وہ للکارتا ہی رہ گیا مگر تصویر نہ اتار سکا۔ اس سے پہلے ہی وہ اجنبی اسے دھکا دے کر آگے نکل گیا۔ وہ دبلا پتلا سا فوٹوگرافر معمولی سے دھکے میں چکرا کر سڑک پر گر پڑا۔ گرنے کے باوجود اس کا کیمرہ محفوظ رہا۔ البتہ ناک پر سے عینک نکل کر اس کے قریب گر پڑی۔ فوٹوگرافر نے ذرا سر اٹھا کر کیمرے کے ویو فائنڈر سے دیکھا تو سڑک پر پڑی ہوئی عینک نظر

آئی۔ جس کا ایک شیشہ نصف کے قریب ٹوٹ گیا تھا۔ ٹوٹے ہوئے شیشے سے اور دوسری طرف کے سالم شیشے سے وہ اجنبی ہاتھ میں آہنی سلاخ لئے بھاگتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس نے کیمرے کے بٹن کو دبا دیا۔ ایک ساعت کے لئے بجلی سی کوند گئی۔ پھر وہ بھاگنے والا عینک کے شیشوں سے نظر آتا ہوا کیمرے میں ریکارڈ ہو گیا۔

وہ ڈیڑھ پسلی کا فوٹوگرافر اپنی پسلیوں پر ہاتھ رکھ کر کراہتے ہوئے اٹھ گیا۔ اس نے ٹوٹی ہوئی عینک اپنی ناک پر جمائی اور دور سڑک کے آخری سرے پر دیکھا جہاں وہ اجنبی بھاگا جا رہا تھا۔ اس نے فضا میں گھونسا لہراتے ہوئے کہا۔

"ابے او بیل کے بچے! مجھے وہ مار کے چلا گیا یعنی کہ سینگ مار کے چلا گیا۔ اگر تجھ میں وہ ہے تو ٹھہر جا۔ سامنے آ کر مرد کی طرح وہ کر' میں تجھے وہ کر کے رکھ دوں گا۔"

لیکن اس کی یہ' وہ سننے سے پہلے ہی اجنبی ایک گلی میں مڑ کر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ فوٹوگرافر بھی تیزی سے چلتا ہوا اس طرف جانے لگا۔ وہ دوڑ نہیں سکتا تھا اس لئے کہ اس کی پسلیاں دکھ رہی تھیں۔

دوسری طرف مہ جبین عرف نازنین بھاگتے بھاگتے ٹھوکر کھا کر گر پڑی۔ ڈائری اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر سڑک کے کنارے آ گئی۔ وہ ڈائری اسے جان سے زیادہ عزیز تھی۔ اسے فوراً ہی اٹھ کر ڈائری تک پہنچنا چاہئے تھا لیکن وہ اٹھ نہ سکی۔ اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ اس میں آہستہ آہستہ تبدیلیاں آ رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر عمر رفتہ کی جو سختی اور پژمردگی تھی' وہ شگفتگی میں بدل رہی تھی۔ جسم کے نشیب و فراز ایک البیلی دوشیزہ کے سانچے میں ڈھل رہے تھے۔ نازنین کا وجود گم ہو رہا تھا اور گم شدہ مہ جبین واپس آ رہی تھی۔ اس دوران وہ پیچھا کرنے والا اجنبی اس کے قریب آ پہنچا تھا لیکن اس نے مہ جبین کی طرف دھیان نہیں دیا۔ وہ دوشیزہ سڑک پر ہوتی یا پھولوں کی سیج پر' اسے کسی کی دوشیزگی سے دلچسپی نہ تھی۔ اس نے سڑک پر پڑی ہوئی ڈائری اٹھائی اور اسی طرح تیزی سے بھاگتا ہوا چلا گیا۔

رات کے سناٹے میں فوٹوگرافر کی للکارتی ہوئی آواز قریب آتی جا رہی تھی۔ وہ مہ جبین کے قریب آ کر رک گیا۔ تھوڑی دیر تک سوچنے لگا کہ کیا کرے؟ اس مجرم کا پیچھا کرے یا اس بے یار و مددگار دوشیزہ سے ہمدردی۔ اس کی دکھتی ہوئی پسلیوں میں اب اتنا زور نہیں تھا کہ وہ بھاگنے والے کا پیچھا کرتا۔ اس وقت اسے دوشیزہ ہی میں کشش محسوس ہوئی۔ وہ گھٹنوں کے بل اس پر جھک گیا۔ پھر ٹوٹی ہوئی عینک کے آر پار دیکھتے ہوئے کہنے

لگا۔ "ارے یہ تو وہ نہیں ہے۔ وہ جو بھاگتی جا رہی تھی۔ وہ تو وہ تھی یعنی کہ بوڑھی تھی۔ یہ تو وہ ہے یعنی کہ جوان ہے۔"

مہ جبین سڑک پر گم صم پڑی ہوئی سوچ رہی تھی کہ وہ کہاں ہے؟ ابھی تو انصار کی خواب گاہ میں تھی۔ پھر اس کھلی فضا میں کیسے آ سکتی ہے؟ فوم کے ملائم بستر کے بجائے پتھریلی زمین پر کیسے پہنچ گئی ہے؟ پھر وہ ایک ٹوٹی ہوئی عینک پہنے اجنبی کو دیکھتے ہی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ پوری طرح ہوش میں آتے ہی اسے اپنا پرانا مرض یاد آیا کہ کبھی کبھی اس پر اس کی بہن نازنین کی شخصیت حاوی ہو جاتی ہے۔ وہ پریشان ہو کر سوچنے لگی کہ ابھی میں انصار کو پلا رہی تھی۔ اس دوران ضرور کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔ مجھے اتنا ہی یاد آ رہا ہے کہ ایج میٹر کے متعلق کچھ باتیں ہو رہی تھیں اور مجھے غصہ آ گیا تھا۔ اس کے بعد مجھے ہوش نہ رہا۔ مجھے فوراً ہی انصار کی خوابگاہ میں واپس جانا چاہئے۔ اگر کوئی بات بگڑی ہو تو میں اسے بنا لوں گی۔ یوں بھی مجھ پر خواہ مخواہ ایک قتل کا الزام عائد کیا جا رہا ہے۔ مجھے تمام شبہات سے بالاتر رہنے کی کوشش کرنا چاہئے۔

یہ سوچ کر وہ اٹھنے لگی۔ فوٹوگرافر دیدے پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔

"کیا بات ہے؟ آپ اس سڑک پر وہ کر رہی تھیں یعنی کہ سو رہی تھیں۔"

"تم کون ہو؟" مہ جبین نے بے رخی سے پوچھا۔

اس نے کیمرے کو تھپکتے ہوئے کہا۔ "میں وہ ہوں' میرا نام وہ ہے یعنی کہ جمشید۔ ایک شخص ایک عورت کے پیچھے وہ کر رہا تھا یعنی کہ بھاگ رہا تھا۔ میں اس شخص کے پیچھے وہ کرنے لگا۔ پھر آپ کو دیکھ کر رک گیا۔ کیا میں آپ کی وہ کر سکتا ہوں یعنی مدد کر سکتا ہوں؟"

"شکریہ!" مہ جبین نے بے دلی سے کہا۔ "مجھے آپ کی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اپنی کوٹھی کی طرف جا رہی تھی' اچانک چکرا کر گر پڑی۔ اب بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ میری فکر نہ کریں۔" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی۔ جمشید فوٹوگرافر ہونقوں کی طرح دیکھتا رہ گیا۔ مہ جبین کوٹھی کا راستہ تلاش کرتی ہوئی پھر اسی جگہ پہنچ گئی جہاں سے وہ ڈائری چرا کر بھاگی تھی۔ کوٹھی کے احاطے میں کتے نے اسی طرح بھونکتے ہوئے اس کا استقبال کیا۔ وہ جتنی تیزی سے بھاگتی ہوئی باہر آئی تھی' اتنے ہی اطمینان سے چلتی ہوئی خوابگاہ میں پہنچ گئی۔ انصار اسی طرح مدہوشی کی حالت میں فرش پر پڑا ہوا تھا۔ مہ جبین نے گہری نظروں

سے کمرے کا جائزہ لیا۔ وہ یہ سمجھنا چاہتی تھی کہ اس کی عدم موجودگی میں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی ہے؟ اسے کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آئی۔ کتابوں کے ریک میں کچھ کتابیں بے ترتیب نظر آئیں۔ اس نے آگے بڑھ کر انہیں ترتیب سے رکھ دیا۔ پھر وہ انصار کے پاس آئی اور اس کے شانے کو ہولے ہولے جھنجھوڑتے ہوئے اسے آوازیں دینے لگی۔ پھر اسے یاد آیا کہ وہ آواز کی پہنچ سے دور چلا گیا ہے کیونکہ وہ اسے کئی پیگ پلا چکی تھی۔

وہ کچھ دیر تک سوچتی رہی' اس کے بعد اس نے بڑے اطمینان سے آہستہ آہستہ اپنے نازک بدن کو لباس سے آزاد کر دیا۔ ریشمی لباس فرش پر بکھر گیا اور وہ انصار کے پہلو میں آ کر لیٹ گئی۔ اس نے نشے کی حالت میں بڑبڑاتے ہوئے کروٹ لی۔ ایک ذرا سی آنکھ کھول کر اس نے حسن عریاں کو دیکھا' اپنے بازو اس کی گردن میں حمائل کر دیئے۔ اس کے بعد نشے کے بوجھ سے اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور وہ خراٹے لینے لگا۔ بلا سے خراٹے لیتا رہے۔ دوسری صبح مہ جبین یہ ثابت کر سکتی تھی کہ اس کے گاہک نے تین ہزار روپے وصول کر لئے ہیں۔

دوسری صبح جب انصار کی آنکھ کھلی تو وہ بہت دیر تک اپنے قریب نازک بدن کی نرمی و گرمی محسوس کرتا رہا۔ رفتہ رفتہ وہ سمجھنے لگا کہ اس کے پہلو میں مہ جبین ہے۔ اس نے تین ہزار میں اس کی ایک رات کا سودا کیا تھا اور اب وہ رات گزر چکی ہے۔ پچھلی رات کی تمام باتیں ایک ایک کر کے یاد آنے لگیں۔ اس حد تک یاد آیا کہ وہ مستی کے عالم میں اسے اپنی آغوش میں لینا چاہتا تھا لیکن یہ یاد نہیں آ رہا تھا کہ مہ جبین کب اور کیسے اس کی آغوش میں بے لباس ہو گئی تھی۔ شرابی مدہوش ضرور ہوتا ہے لیکن ذہنی طور پر بالکل ہی اُلو کا پٹھا نہیں ہوتا۔ نشے کے باوجود اتنی سمجھ ہوتی ہے کہ اس کے سامنے کیا کچھ ہو رہا ہے۔ تب اسے یاد آیا کہ پچھلی رات مہ جبین عمر کے معاملے میں اس سے جھگڑا کر رہی تھی لیکن نہیں وہ مہ جبین تو نہیں تھی' وہ کوئی دوسری عورت تھی۔ مجھے عینک کے بغیر اچھی طرح نظر نہیں آ رہا تھا۔ مگر منظر دھندلایا ہوا بھی ہو' تب بھی اتنا تو پتہ چل ہی جاتا ہے کہ منظر بدل گیا ہے یا شخصیت بدل گئی ہے اور مجھے یقین ہے کہ شخصیت بدل گئی ہے۔ وہ یقیناً کوئی دوسری عورت تھی جو میرے ڈیڈی کی ڈائری طلب کر رہی تھی۔ شاید وہی میرے ڈیڈی کی قاتلہ تھی۔ کاش کہ میں واضح طور پر اس کا چہرہ دیکھ سکتا۔ اس شراب نوشی کی عادت نے مجھے اس قابل نہیں رکھا کہ میں اپنی عینک تلاش کر کے اسے پہچان سکتا اور اسے گرفت میں لے کر قانون کے حوالے کر سکتا لیکن اس وقت مہ

جبین تو ہوش میں تھی۔ اس نے تو اس عورت کو ضرور دیکھا ہو گا۔ تعجب ہے کہ اس وقت مجھے مہ جبین کا خیال نہیں آیا۔ کہاں چلی گئی تھی وہ؟

وہ دیر تک سوچتا رہا۔ کچھ باتیں اس کی سمجھ میں آئیں اور کچھ باتوں نے اسے اُلجھا دیا۔ یہ اُلجھنیں مہ جبین دور کر سکتی تھی للذا اسے نیند سے بیدار کرنے کے لئے اس کے بدن کو آہستہ آہستہ سہلانے لگا۔ پھول کو پھول کی سی نزاکت سے چھونا چاہئے۔ اسی نزاکت سے اس کے ہاتھ بھٹکنے لگے اور وہ ہولے ہولے ابھرنے لگی' یہ دھیرے دھیرے ڈوبنے لگا۔ وہ آنکھیں کھول کر انگڑائی لینے لگی۔ نیند میں ڈوبی ہوئی خمار آلود آنکھوں سے شراب کے بھولے ہوئے نشے کو یاد دلانے لگی۔ شراب کی بوتل خالی ہو چکی تھی' شباب کی بوتل لبریز تھی لیکن وہ ایک گھونٹ بھی نہ پی سکا۔ اسی وقت دروازے پر دستک سنائی دی۔

مہ جبین جلدی سے اٹھ بیٹھی اور فرش پر سے اپنا لباس اٹھا کر پہننے لگی۔ انصار نے جھلا کر دروازے کی طرف دیکھا اور ڈانٹ کر پوچھا۔ "کون ہے؟"

بند دروازے کے باہر سے ملازم نے کہا۔ "انسپکٹر صاحب ملنے آئے ہیں۔"

انصار طوعاً و کرہاً اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اگر کوئی اور ہوتا تو وہ کبھی خوابگاہ سے باہر نہ جاتا لیکن باپ کے قتل کے سلسلے میں انسپکٹر سے مل کر یہ جتانا تھا کہ وہ باپ کی خاطر ایک حسینہ کی آغوش سے نکل کر آ گیا ہے۔ اس نے خوابگاہ سے جانے سے پہلے مہ جبین کو حسرت سے دیکھا اور کہا۔

"دل کی حسرت دل میں ہی رہ گئی اور رات یوں ہی گزر گئی۔"

"یوں ہی کیسے گزر گئی؟" مہ جبین نے ایک ادائے ناز سے شکایتاً کہا۔ "آپ نے تو رات بھر مجھے خوب پریشان کیا۔ پینے کے بعد آپ لوگوں کو اتنا ہوش نہیں رہتا کہ کیسے ایک نازک سی عورت کو درندے کی طرح بھنبھوڑتے رہتے ہیں۔"

انصار پھر اُلجھ گیا' اسے گہری نظروں سے تاڑنے لگا کہ وہ کہاں تک درست کہہ رہی ہے۔ بعض مرد عورت کی زبان سے اپنی مردانگی کی تعریف سن کر خوش ہو جاتے ہیں اور مہ جبین اسے درندہ کہہ کر اس کی مردانگی کا اعتراف کر رہی تھی۔ جب عورت ہار مانتی ہو تو انصار جیسے مرد اپنے اوپر لادی ہوئی جیت سے انکار نہیں کرتے۔ وہ خوش ہو کر مسکرانے لگا۔ پھر اس کا ذہن دوسری عورت کی طرف بھٹک گیا۔ اس نے پوچھا۔

"کیا پچھلی رات یہاں کوئی عورت آئی تھی؟ مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں تھوڑی دیر کے لئے تمہیں بھول گیا تھا یا تم میری نظروں سے اوجھل ہو گئی تھیں اور میں اس کمرے

میں کسی دوسری عورت کو دیکھ رہا تھا۔"

"دوسری عورت.........!" مہ جبین نے تجاہلِ عارفانہ سے پوچھا۔ "کیا یہاں کوئی دوسری عورت بھی آئی تھی؟ پتہ نہیں آپ جیسے مرد کتنے بھوکے ہوتے ہیں۔ نہ جانے ایک رات میں کتنے شکار کھیلتے ہیں اور الٹا مجھ سے پوچھ رہے ہیں کہ یہاں میری کوئی سگی آئی تھی یا نہیں؟"

"یہ مذاق کی بات نہیں ہے مہ جبین! میں نے تمہارے علاوہ کسی دوسری عورت کو یہاں نہیں بلایا تھا لیکن یہاں کوئی دوسری ضرور آئی تھی۔ وہ کتابوں کے ریک سے ایک ڈائری نکال کر لے گئی ہے۔ میں نشے میں لڑکھڑا رہا تھا اس لئے اسے روک نہ سکا۔ مگر ایسے وقت تم کہاں تھیں؟"

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ آپ کس عورت کی باتیں کر رہے ہیں۔ میں تمام رات آپ کے ساتھ رہی۔ میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ کسی عورت کو دیکھیں اور میں اسے نہ دیکھ سکوں۔ ہاں یاد آیا' میں آدھے گھنٹے کے لئے باتھ روم میں گئی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس دوران یہاں آئی ہو۔"

اتنے میں دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی۔ اس بار انسپکٹر کی آواز آئی۔

"مسٹر انصار! میں ڈیوٹی پر ہوں' زیادہ دیر آپ کا انتظار نہیں کر سکتا۔ کیا آپ مہ جبین کو ڈرائنگ روم تک لانے کی تکلیف گوارا کریں گے؟"

"جسٹ اے منٹ۔ آپ ڈرائنگ روم میں چلیں' میں ابھی مہ جبین کے ساتھ آ رہا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ باتھ روم کی طرف چلا گیا۔ مہ جبین اپنی زلفیں سنوارنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں ڈرائنگ روم میں آئے تو وہاں انسپکٹر کے علاوہ مس فریدہ اور حمیدہ بانو بھی ان کا انتظار کر رہی تھیں۔ انسپکٹر نے مہ جبین کی جانب ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے ان دونوں عورتوں سے کہا۔

"یہ وہی نازنین ہے جو آپ لوگوں کے ساتھ ڈاکٹر کی لیبارٹری میں موجود تھی۔ اس کا اصل نام مہ جبین ہے لیکن یہ دوسروں کو اپنا نام نازنین بتاتی ہے۔ ڈاکٹر جبار یوسفی کی ڈائری میں اس کے کوٹھے کا پتہ درج تھا۔ اب آپ دونوں تصدیق کر سکتی ہیں کہ یہ وہی مہ جبین عرف نازنین ہے۔"

وہ دونوں عورتیں مہ جبین کو یوں تکنے لگیں جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہوں۔

پھر مس فریدہ نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"اوں ہونہہ وہ تیسری عورت یہ نہیں ہیں۔ وہ تو کوئی اچھی خاصی عمر والی عورت تھی۔"

حمیدہ بانو نے بھی اس کی تائید کی۔ "انسپکٹر صاحب! مس فریدہ ٹھیک کہتی ہیں۔ اگر ان کا نام نازنین ہے تو پھر یہ کوئی دوسری نازنین ہیں۔ میں آج پہلی بار انہیں دیکھ رہی ہوں۔"

انسپکٹر مایوسی سے اس کا منہ تکنے لگا۔ نازنین کا نام سن کر انصار کو خیال آیا کہ پچھلی رات اس کے کمرے میں جو دوسری عورت آئی تھی اس کا چہرہ اگرچہ دھندلایا ہوا تھا تاہم وہ مہ جبین کی ہمشکل معلوم ہوتی تھی۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ اس کی بڑی بہن نازنین ہو سکتی ہے لیکن وہ تو ایک سال پہلے ہی مر چکی تھی۔ اس نے انسپکٹر سے پوچھا۔

"کیا آپ نے اس ڈاکٹر سے ملاقات کی تھی جس نے ایک سال پہلے نازنین کا علاج کیا تھا۔"

"جی ہاں۔ میں نے اس ڈاکٹر سے بھی ملاقات کی تھی اور اس رئیس آدمی سے بھی جس کے پاس نازنین آخری بار داشتہ رہ چکی تھی۔ ان دونوں نے اس کی موت کی تصدیق کی ہے۔"

انصار سر جھکا کر سوچنے لگا۔ اس نے آہستگی سے کہا۔

"وہ مر چکی ہے لیکن کل رات میں نے اسے اپنی خوابگاہ میں دیکھا تھا۔ مجھے کچھ ایسا ہی لگا کہ وہ نازنین ہے۔"

انسپکٹر نے کہا۔ "اس سے پہلے بھی آپ نے لیبارٹری کے دروازے پر کسی عورت کو دیکھا تھا اور یہ کہا تھا کہ وہ عورت مہ جبین ہے۔ اس وقت آپ نے عینک نہیں لگائی تھی۔ کیا پچھلی رات آپ نے عینک لگا کر دیکھا تھا؟"

"نہیں۔ میں عینک کہیں رکھ کر بھول گیا تھا۔ دراصل نشے کے وقت مجھے یاد نہیں رہتا کہ کون سی چیز کہاں رکھی ہے۔"

"آپ کی آنکھوں پر عینک نہیں تھی اور آپ نشے میں تھے۔ نشے کی حالت میں آپ نازنین جیسی ایک عورت تو کیا دس عورتیں دیکھ سکتے ہیں۔"

"لیکن انسپکٹر! میں ثابت کر سکتا ہوں کہ وہ میری خوابگاہ میں آئی تھی۔ وہ کتابوں کے

ریک سے میرے ڈیڈی کی ایک پرانی ڈائری لے گئی ہے۔ اس بے وقوف عورت نے سمجھا تھا کہ ڈائری میں ایج میٹر کی تفصیلات درج ہیں لیکن اسے مایوسی ہو گی۔ اس ڈائری میں میرے ڈیڈی کی زندگی کے صرف واقعات درج ہیں' عورتوں کے مطلب کی کوئی چیز نہیں ہے۔"

اس بات پر وہ دونوں ڈائری کی چوری پر بحث کرنے لگے۔ بڑی دیر کی بحث کے بعد انسپکٹر اس نتیجے پر پہنچا کہ ڈائری چرائی نہیں گئی ہے بلکہ انصار اپنی عینک کی طرح اس ڈائری کو بھی کہیں رکھ کر بھول گیا ہے۔ عینک تو مل گئی ڈائری نہیں ملی۔ جب ڈائری مل جائے گی تو انصار یہ سوچنا چھوڑ دے گا کہ اس کے بند کمرے میں کوئی دوسری عورت آئی تھی۔ مہ جبین نے ہنستے ہوئے کہا۔

"بات یہ ہے انسپکٹر صاحب! کہ ہم عورتوں کی عمر کو ناپتے ناپتے ڈاکٹر صاحب اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اب ان کے صاحبزادے نشے کی حالت میں بیک وقت مختلف عمر کی عورتوں کو دیکھتے ہیں۔ میں اسی خوابگاہ میں موجود تھی' مجھے کوئی نظر نہیں آئی۔ انہوں نے پہلے مجھ جیسی جوان عورت کو دیکھا۔ اس کے بعد میری عمر رسیدہ بہن نازنین کو دیکھنے کا دعویٰ کر رہے ہیں۔ دراصل عورتوں کی بڑھتی اور گھٹتی ہوئی عمر مردوں کے حواس پر چھائی ہوئی ہے اس لئے انصار صاحب نشے میں عورتوں کی عمر کا موازنہ کرتے ہیں یعنی کہ چشمِ تصور میں دیکھتے ہیں لیکن افسوس کہ عینک کے بغیر نہیں دیکھ سکتے۔ اگر دیکھتے بھی ہیں تو دیکھتے کسی کو ہیں اور پہچانتے کسی کو ہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ ان کی طرح ہر مرد کی نظر کمزور ہوتی۔ اس طرح ہر عورت دھندلی دھندلی سی نظر آتی اور کوئی ان کی صحیح عمر تک نہ پہنچ سکتا۔"

"ہر عورت کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ مرد اگر آنکھ کا اندھا نہ ہو تو عقل کا اندھا ضرور ہو۔ مگر افسوس کہ یہ آرزو پوری نہیں ہوتی۔ وہ عورت جو ڈائری چرا کر لے گئی ہے اسے کچھ حاصل نہ ہو گا۔ اصل ڈائری میرے پاس محفوظ ہے میں اس کی مدد سے نیا ایج میٹر بناؤں گا۔" ایسا کہتے وقت وہ سوچ رہا تھا' کاش اس کے پاس ایسی کوئی ڈائری موجود ہوتی..........

☆======☆======☆

روزنامہ "ہلچل" کے ایڈیٹر طارق محمود کو ہلچل مچا دینے والی سرخیاں لکھنے میں کمال حاصل تھا۔ پچھلے دنوں ایج میٹر کی چوری اور ڈاکٹر جبار یوسفی کے قتل پر اس نے تہلکہ مچا

دینے والے کالم لکھے تھے۔ اس روز کے اخبار کو عورتوں نے زیادہ پڑھا تھا۔ مضمون عورتوں کی حمایت میں تھا۔ اس تیسری عورت کے حوصلے کو بھی سراہا گیا تھا جو ایج میٹر چرا کر لے گئی تھی۔ طارق محمود نے لکھا تھا کہ اس تیسری عورت نے ڈاکٹر کو جان بوجھ کر قتل نہیں کیا تھا۔ وہ عورت اپنی اور تمام دنیا کی عورتوں کی توہین برداشت نہیں کر سکی تھی۔ اس لئے وہ ڈاکٹر سے ایج میٹر چھین کر لے جا رہی تھی۔ ڈاکٹر نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ اسی کشمکش میں وہ زخمی ہو گیا۔ وہ عورتوں کی ڈھکی چھپی عمر تک پہنچنے والا خود عمر رسیدہ تھا۔ اتنا بوڑھا تھا کہ معمولی سے زخم کی بھی تاب نہ لا سکا اور ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہی اس نے دم توڑ دیا تھا۔

طارق محمود اچھی طرح سمجھتا تھا کہ عمر کے معاملے میں اگر اس نے عورتوں کی حمایت کی تو اس کے اخبار کی اشاعت بڑھ جائے گی۔ اس سلسلے میں اسے توقع سے زیادہ کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ ملک کے گوشے گوشے سے عورتوں کے ٹیلیگرام اور خطوط آئے تھے۔ ان میں طارق محمود کا شکریہ ادا کیا گیا تھا اور اسے یقین دلایا گیا تھا کہ روزنامہ "ہلچل" ان کا محبوب اخبار ہے۔ انجمن اتحاد الخواتین کی سیکرٹری اور صدر نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اس اخبار کو ملک کی ہر پڑھی لکھی خاتون تک پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کریں گی۔ انجمن کی طرف سے انہوں نے اخبار کی اشاعت کو مزید بڑھانے کے لئے پچیس ہزار روپے کا عطیہ دیا تھا۔ اس طرح وہ اخبار' خواتین کے لئے مخصوص ہو کر اچھا خاصا منافع دے رہا تھا۔

اس روز بھی طارق محمود اپنے دفتر میں بیٹھا یہ سوچ رہا تھا کہ ایج میٹر کی مخالفت میں اور خواتین کی حمایت میں کوئی دھماکہ خیز کہانی تراشنا چاہئے جسے پڑھنے کے بعد اس اخبار سے عورتوں کی دلچسپی اور بڑھ جائے۔ وہ سوچ رہا تھا اور لکھ رہا تھا۔ اسی وقت پولیس انسپکٹر وہاں پہنچ گیا۔ اس نے آتے ہی پوچھا۔

"مسٹر طارق محمود! آپ اس عورت کی حمایت میں کالم کیوں لکھتے ہیں جس نے ڈاکٹر جبار یوسفی کو ہلاک کیا ہے؟"

طارق محمود نے جواباً پوچھا۔ "آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ کسی عورت نے ڈاکٹر کو ہلاک کیا ہے؟ کیا آپ اس عورت کو جانتے ہیں؟ ڈاکٹر جبار یوسفی نے اسے اپنی لیبارٹری میں بلایا تھا۔ یقیناً لیبارٹری میں اس کا نام اور پتہ موجود ہو گا۔ میں کل کے اخبار میں یہ لکھنے والا ہوں کہ وہ عورت قاتلہ نہیں ہے۔ پولیس والے محض شبہ کی بنا پر اس کے خلاف

ثبوت تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ اسی لئے اب تک کسی اخبار والے کو اس کا نام اور پتہ بتایا نہیں گیا ہے۔"

انسپکٹر نے کہا۔ "آپ اخبار والے ذرا سی بات کو نمک مرچ لگا کر بارہ مسالے کی چاٹ بنا دیتے ہیں۔ خصوصاً آپ اس فن میں ماہر ہیں۔ اسی لئے عورتیں آج کل بڑی دلچسپی سے آپ کا اخبار پڑھتی ہیں۔ مجھے آپ سے یہ شکایت ہے کہ آپ تصویر کا دوسرا رُخ نہیں دیکھتے ہیں۔ آپ کا فرض ہے کہ آپ ہم پولیس والوں کی مجبوریوں کو بھی سمجھا کریں۔ ہمیں ایک معمولی سے کیس میں بھی بعض اوقات بہت بڑی الجھنوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اب یہی دیکھئے کہ ڈاکٹر صاحب کی ڈائری میں اس تیسری عورت کا نام نازنین لکھا ہوا ہے۔ وہ کوٹھے کی رہنے والی ہے۔ اس ڈائری کے مطابق نازنین ڈاکٹر کی لیبارٹری میں آئی تھی اور ہماری تحقیقات کے مطابق وہی نازنین ایک سال پہلے ہی مرچکی ہے۔"

طارق محمود نے چونک کر انسپکٹر کو دیکھا۔ پھر جلدی سے کاغذ اور قلم کو سنبھالتے ہوئے بولا۔ "ذرا ٹھہریئے۔ مجھے کل کے اخبار کے لئے ایک ہلچل مچا دینے والی سرخی مل گئی ہے۔"

یہ کہہ کر وہ سرخی لکھنے لگا۔ "بازارِ حُسن کی نازنین کی روح نے ڈاکٹر جبار یوسفی کو قتل کیا ہے۔"

انسپکٹر نے اس سرخی کو پڑھنے کے بعد کہا۔ "میں نے آپ سے یہ تو نہیں کہا ہے کہ نازنین کی روح نے ڈاکٹر کو قتل کیا ہے۔"

"آپ نے یہ نہیں کہا لیکن کہنے کا انداز یہی ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ وہ ایک سال پہلے مرچکی ہے۔ اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ نازنین کی روح ڈاکٹر کی لیبارٹری میں گئی۔ ڈاکٹر کو اپنا نام اور پتہ بتایا اس سے ایج میٹر چھین لیا اور اسے قتل کر کے رخصت ہو گئی۔ قانون کے ہاتھ زندہ مجرموں تک پہنچ سکتے ہیں لیکن کسی مجرم روح تک نہیں پہنچ سکتے۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے کل کے اخبار کے لئے بہت ہی دلچسپ مواد فراہم کیا ہے۔"

انسپکٹر نے کہا۔ "کمال ہے آپ بات کو کہاں سے کہاں پہنچا رہے ہیں۔ میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ نازنین کی روح آئی تھی۔ ہمیں اس کی چھوٹی بہن مہ جبین پر شبہ ہے۔ یہ دیکھئے' یہ دونوں بہنوں کی تصویریں ہیں۔ دونوں کے چہروں پر صرف عمر کا فرق ہے مہ جبین کم عمر نظر آتی ہے' نازنین عمر رسیدہ ہونے کے باعث موٹی اور بھدی دکھائی دیتی

ہے۔"

طارق محمود تصویر کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے پوچھا۔ "کیا لیبارٹری میں آنے والی دوسری دو عورتوں نے مہ جبین کو مجرمہ کی حیثیت سے پہچان لیا ہے؟"

"نہیں۔ وہ دونوں کہتی ہیں کہ لیبارٹری میں مہ جبین نہیں آئی تھی۔ نازنین کی تصویر دیکھ کر بھی یہی کہتی ہیں کہ وہاں نازنین نہیں آئی تھی۔ بہرحال ایک مردہ عورت کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں مہ جبین پر صرف اس لئے شبہ کر رہا ہوں کہ وہ دوسروں کو اپنا نام نازنین بتاتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے ڈاکٹر کو بھی یہی نام بتایا ہو۔ میرے خیال میں وہ لیبارٹری میں آئی' وہاں ان دو عورتوں کو اپنی رازدار بنایا' ڈاکٹر کو زخمی کیا اور ایج میٹر لے کر چلی گئی۔ وہ دو عورتیں محض اس لئے اسے پہچاننے سے انکار کر رہی ہیں کہ اس نے ایج میٹر چرا کر دنیا کی تمام عورتوں پر احسان کیا ہے۔"

"یہ محض آپ کے خیالات ہیں۔ ویسے میں آپ کے خیالات بھی شائع کروں گا لیکن آپ کسی طرح یہ ثابت نہیں کر سکیں گے کہ وہ دو عورتیں مہ جبین کو قانون کی گرفت سے بچا رہی ہیں۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی دروازے پر سے جمشید فوٹوگرافر کی آواز سنائی دی۔ "کیا مجھے اندر آنے کی وہ مل سکتی ہے یعنی کہ اجازت مل سکتی ہے؟"

طارق محمود نے ناگواری سے کہا۔ "آج پھر بور کرنے آ گئے ہو۔ میں کئی بار کہہ چکا ہوں کہ میرے اخبار میں تمہاری اوٹ پٹانگ تصویریں شائع نہ ہو سکیں گی۔ اخبار میں ایسی تصویریں شائع ہوتی ہیں جن میں تھرلنگ اور سسپنس ہو۔ فوٹوگرافر اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر ایسی تصویریں اتارتے ہیں۔"

جمشید نے قریب آتے ہوئے کہا۔ "پچھلی رات میں نے بھی اپنی وہ ہتھیلی پر رکھ کر وہ اتاری ہیں۔ یہ دیکھئے۔" اس نے ایک لفافے سے ایک تصویر نکال کر آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "آپ کا اخبار عورت کی وہ پر بہت کچھ لکھتا ہے۔ یعنی مظلومیت پر بہت کچھ لکھتا ہے۔ کل رات ایک مظلوم عورت ایک ظالم مرد سے وہ بچا کر یعنی عزت بچا کر بھاگ رہی تھی۔ اسی وقت میں نے اس کی وہ اتار لی یعنی کہ یہ تصویر اتار لی.........."

طارق محمود ہاتھ میں تصویر لے کر دیکھتے ہی چونک پڑا۔ اس نے حیرت سے کہا۔ "ارے یہ تو نازنین کی تصویر ہے۔"

"نازنین!" انسپکٹر اچھل کر کھڑا ہو گیا اور میز پر جھک کر اس تصویر کو دیکھنے لگا۔ اس

میں کسی شبے کی گنجائش نہیں تھی کہ جمشید مردہ نازنین کی تصویر اتار کر لے آیا تھا لیکن تصویر میں وہ مُردہ نہیں تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے ڈائری کو تھامے اور اسے سینے سے لگائے بدحواسی میں بھاگی جا رہی تھی۔ بھاگنے کے دوران ہی جمشید نے تصویر اتار لی تھی۔
انسپکٹر نے جمشید سے پوچھا۔

"کیا یہ تصویر تم نے پچھلی رات اتاری ہے؟"

"جی ہاں۔"

"تم جھوٹ بولتے ہو' یہ عورت ایک سال پہلے ہی مر چکی ہے پھر تم نے اس کی تصویر کیسے اتار لی؟"

"اب میں کیا بتاؤں وہ تصویر اتارتے وقت وہ نہیں تھی یعنی مردہ نہیں تھی۔ اگر وہ ہوتی تو زندہ وہ کی طرح بھاگتی ہوئی نظر نہ آتی۔ یہ تصویر اس بات کا وہ ہے۔"

طارق محمود اب تک اس تصویر کو توجہ سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے انسپکٹر سے کہا۔
"جمشید ٹھیک کہتا ہے۔ اگر آپ کی تحقیقات کے مطابق وہ ایک سال پہلے مر چکی ہے تو پھر اس کی موت 1975ء میں ہوئی تھی۔ اب اس تصویر کو دیکھئے اس میں نازنین نے جو ڈائری پکڑی ہوئی ہے اس پر جلی اعداد میں 1976ء لکھا ہوا ہے۔ اس تصویر کے مطابق یہ اپنی موت کے ایک سال بعد سال رواں کی ڈائری لئے بھاگ رہی ہے۔"

انسپکٹر اس تصویر کو لے کر دوبارہ توجہ سے دیکھنے لگا۔ واقعی تصویر میں نازنین سال رواں کی ڈائری تھامے ہوئے تھی۔ اس نے جمشید سے پوچھا۔ "تم نے کل رات اسے کہاں دیکھا تھا؟"

"گلبرگ کے علاقے میں وہ تیرہ نمبر کی وہ ہے نا۔ وہاں بھاگی جا رہی تھی۔"

انسپکٹر نے جھلا کر پوچھا۔ "یہ وہ کیا چیز ہے؟ تم سیدھی طرح بات کیوں نہیں کرتے۔"

"وہ دراصل میرا وہ ہے یعنی کہ تکیہ کلام۔ میں دراصل وہ کہہ رہا تھا کہ وہ تیرہ نمبر کی گلی میں بھاگی جا رہی تھی۔"

انسپکٹر بڑبڑانے لگا۔ "گلبرگ .... تیرہ نمبر کی گلی .... انصار یوسفی کی کوٹھی بارہ نمبر میں ہے اور وہ تیرہ نمبر کی گلی میں دیکھی گئی ہے۔ انصار کا بیان ہے کہ پچھلی رات اس نے اپنی خواب گاہ میں نازنین کو دیکھا تھا۔ وہ کتابوں کے ریک سے ڈائری لے کر بھاگی تھی اور اس تصویر میں بھی نازنین کے ہاتھوں میں ڈائری ہے۔ اس طرح واقعات کا یہ

تسلسل قائم ہوتا ہے کہ نازنین سچ مچ انصار کی خوابگاہ میں گئی تھی۔ وہاں سے وہ ڈائری لے کر بھاگتی ہوئی بارہ نمبر کی گلی سے نکل کر تیرہ نمبر کی گلی سے گزر رہی ہے۔ میں نے انصار کے بیان پر یقین نہیں کیا تھا کیونکہ اس نے بغیر عینک سے اسے دیکھا تھا۔ اب سوچنا پڑتا ہے کہ نازنین زندہ ہے' وہ ایچ میٹر چرانے اور ڈاکٹر کو ہلاک کرنے کے بعد کہیں روپوش ہو گئی ہے۔ اس کی موت کی تصدیق کرنے والے سب جھوٹے ہیں۔ مہ جبین پر میرا شبہ غلط تھا۔ اس کا جرم صرف اتنا ہے کہ اس نے بہن کے متعلق غلط بیان دیا ہے۔ اب میں نئے سرے سے اس کیس کو ہینڈل کروں گا۔"

وہ نازنین کی تصویر لے کر دفتر سے جانے لگا۔ جمشید نے آگے بڑھ کر کہا۔ "جناب میں نے اپنی وہ ہتھیلی پر رکھ کر نازنین کی وہ اتاری ہے یعنی کہ تصویر اتاری ہے۔ مجھے اس کا وہ ملنا چاہئے یعنی کہ معاوضہ ملنا چاہئے۔"

انسپکٹر نے اس کے شانے کو تھپکتے ہوئے کہا۔

"تم نے اس کیس میں میری بہت بڑی مدد کی ہے۔ تمہیں معاوضہ بھی ملے گا اور انعام بھی۔ آئندہ اس قسم کی جب بھی تصویر اتارو' سیدھے میرے پاس لے آؤ۔ تمہاری اچھی خاصی آمدنی ہو جایا کرے گی۔"

جمشید نے خوش ہو کر لفافے سے دوسری تصویر نکالتے ہوئے کہا۔

"خدا آپ کو وہ نصیب کرے۔ اس سلسلے کی ایک اور وہ ہے یعنی کہ تصویر ہے۔ یہ دیکھئے.........."

انسپکٹر نے تصویر کو ہاتھ میں لے کر دیکھا وہ ایک ٹوٹی ہوئی عینک کا کلوز اپ تھا۔ عینک کے شیشوں میں ایک بھاگتا ہوا شخص نظر آ رہا تھا۔ اس نے دائیں ہاتھ میں ایک لوہے کی سلاخ تھام رکھی تھی۔ بھاگنے کا ایکشن یوں تھا کہ اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا صرف پشت نظر آ رہی تھی۔ جمشید نے کہا۔

"یہ شخص نازنین کا وہ کر رہا تھا۔ میں نے سامنے سے اس کی تصویر اتارنی چاہی لیکن اس نے مجھے زور سے وہ دے کر سڑک پر گرا دیا اور آگے نکل گیا۔ میں پیچھے رہ گیا اس لئے تصویر میں اس کی وہ نظر آ رہی ہے یعنی کہ پشت نظر آ رہی ہے۔"

انسپکٹر تصویر کو دیکھ کر سوچنے لگا کہ یہ شخص کون ہو سکتا ہے۔ جس طرح یہ آہنی سلاخ لئے بھاگ رہا ہے اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نازنین کو ہلاک کرنا چاہتا ہے یا اس سے کچھ چھیننا چاہتا ہے۔ کیا وہ ڈائری چھیننا چاہتا تھا؟ اس کے ذہن میں یہ سوال ابھر آیا

ڈائری کی اہمیت واضح ہو گئی۔ یہ بات سمجھ میں آگئی کہ اس ڈائری کو کوئی مرد بھی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عورتوں کی عمر سے مردوں کو زیادہ دلچسپی ہوتی ہے۔ کوئی مجرمانہ ذہنیت رکھنے والا اسی ڈائری کی خاطر نازنین کا پیچھا کر رہا تھا۔ جس کے ذریعے عورتوں کی گھٹتی بڑھتی عمر کا راز فاش ہوتا ہے۔

☆======☆======☆

وہ آہنی سلاخ والا ایک صوفے پر بیٹھا ہانپ رہا تھا۔ اس کے سامنے والے صوفے پر ایک چھوٹے سے قد کا گینڈے نما انسان بیٹھا ہوا ڈائری کے اوراق الٹ رہا تھا۔ پہلے صفحے سے لے کر آخری صفحے تک ڈائری کو کھنگالنے کے بعد اس نے جھلا کر اسے ایک طرف پھینک دیا۔ پھر سامنے بیٹھے ہوئے شخص کو غصے سے گھورتے ہوئے کہا۔

"یہ کیا اٹھا لائے ہو؟ اس میں ایج میٹر کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں لکھا ہوا۔"

"جناب! انصار اُس عورت سے یہی کہہ رہا تھا۔ آپ کے حکم کے مطابق میں انصار کا پیچھا کر رہا تھا۔ آپ کے خیال کے مطابق وہ تیسری عورت مہ جبین تھی جو ایج میٹر لے کر فرار ہو گئی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ اس سے ایج میٹر چھین لوں گا یا پھر اسے اٹھا کر لے آؤں گا لیکن وہاں ڈائری کی بات نکل پڑی۔ میں خواب گاہ کے باہر کھڑکی سے لگا کھڑا تھا۔ کھڑکی بند تھی لیکن اس کا ایک شیشہ ٹوٹا ہوا تھا۔ اندر کا پردہ ذرا سرکا ہوا تھا۔ باہر سے دیکھنے پر خواب گاہ کا وہ حصہ نظر آ رہا تھا جہاں مہ جبین اسے وہسکی پلا رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ نشے میں بہکنے لگا۔ مہ جبین اس سے کتراتی ہوئی، پیچھے ہٹتی ہوئی میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ پھر مجھے یاد نہیں کہ ان کے درمیان کس طرح ڈائری کی بات شروع ہوئی۔ انصار کہہ رہا تھا کہ ایک ڈائری میں ایج میٹر تیار کرنے کی تمام تفصیلات لکھی گئی ہیں۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ مہ جبین پر ہاتھ ڈالنے کے بجائے میں انصار سے وہ ڈائری حاصل کروں گا۔ اتنے میں مجھے اس خوابگاہ میں کسی دوسری عورت کی آواز سنائی دی۔ پتہ نہیں مہ جبین کہاں چلی گئی تھی۔ وہ بڑے غصے سے عمر کے موضوع پر باتیں کر رہی تھی۔ پھر اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر انصار کے منہ پر طمانچہ رسید کیا۔ وہ مدہوشی میں لڑکھڑاتے ہوئے گر پڑا۔ اس وقت میں نے اس عورت کو دیکھا کیونکہ وہ خواب گاہ کے اس حصے میں آ گئی تھی جو مجھے نظر آ رہا تھا۔ وہ عورت مہ جبین کی ہمشکل تھی لیکن مہ جبین نہیں تھی کیونکہ مہ جبین جوان ہے اور وہ عورت بوڑھی تھی۔ جسمانی لحاظ سے موٹی اور بھدی تھی۔ وہ انصار کو زمین پر گرانے کے بعد کتابوں کے ریک سے ایک ڈائری نکال

کر کمرے سے باہر جا رہی تھی۔ میں فوراً ہی دوڑتا ہوا کوٹھی کے احاطے سے باہر آ گیا۔ میں نے سوچا تھا کہ جیسے ہی وہ باہر نکلے گی میں زخمی کر کے اس سے ڈائری چھین لوں گا۔"

اس گینڈے نما شخص نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"بس کرو اتنی لمبی چوڑی کہانی سنانے کا فائدہ کیا ہے۔ وہ ڈائری یہ نہیں ہے جسے تم حاصل کرنا چاہتے تھے۔ انصار نے اصل ڈائری کہیں چھپا کر رکھی ہے۔ اس ڈائری کو حاصل کرنے کے لئے ہمیں انصار کی کمزوریوں سے کھیلنا ہو گا۔ وہ عورت اور شراب کا رسیا ہے ہم اسے شراب اور شباب میں اُلجھا کر ہی ڈائری حاصل کر سکتے ہیں۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی باہر کار کا ہارن سنائی دیا۔ آہنی سلاخ والا اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس آیا اور باہر کی جانب دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "جناب! مادام روزینہ آئی ہیں۔"

"ٹھیک ہے تم باہر جاؤ اور مادام کو یہاں بھیج دو اور سنو' کیا مادام نے ایج میٹر کے متعلق تم سے کچھ پوچھا تھا؟"

جی ہاں' میں نے انہیں یقین دلایا ہے کہ وہ تیسری عورت ہماری نظروں میں ہے' ہم بہت جلد اس سے ایج میٹر چھین لیں گے۔"

"ٹھیک ہے تم جاؤ۔"

وہ چلا گیا' تھوڑی دیر بعد مادام روزینہ اپنی ساڑھی کے آنچل کو سنبھالتی' اٹھلاتی لہراتی اور تبسم کی بجلیاں گراتی اس کے سامنے والے صوفے پر آ کر بیٹھتی ہوئی بولی۔

"نادر صاحب! آپ جانتے ہیں کہ میں کتنی مصروف رہتی ہوں' بار بار یہاں نہیں آ سکتی' آپ نے کہا تھا کہ فون پر باتیں کریں گے۔ میں ساری رات اپنے سرہانے فون رکھے آپ کی کال کا انتظار کرتی رہی' مگر آپ کی کال نہیں آئی' مجھے ہی آنا پڑا۔"

"مادام! آپ ساری رات میری کال کے انتظار میں جاگتی رہیں اور میں ساری رات آپ کے حکم کے مطابق مہ جبین کا پیچھا کرتا رہا۔ وہ پچھلی رات انصار کی خوابگاہ میں تھی' میرا ایک آدمی اسے ہلاک کرنے گیا تھا لیکن اس کی خوابگاہ میں دوسری عورت چلی آئی' پھر معلوم نہ ہو سکا کہ مہ جبین کہاں چلی گئی۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" مادام روزینہ نے پوچھا۔ "مہ جبیں خوابگاہ سے کہاں جا سکتی ہے' آپ کے آدمی نے اس کا پیچھا کیوں نہیں کیا؟"

"میرے آدمی نے اس لئے مہ جبیں کا پیچھا نہیں کیا کہ اس دوسری عورت کی

اہمیت اس سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔ وہ ایک ایسی ڈائری چرا کر بھاگ رہی تھی جس میں ایج میٹر تیار کرنے کی تفصیلات درج تھیں۔"

"اچھا......." مادام نے ذرا سنبھل کر دلچسپی سے پوچھا۔ "کیا واقعی انصار کے پاس ایسی کوئی ڈائری ہے؟"

"تعجب ہے مادام کہ آپ کسی ایسی ڈائری کے متعلق نہیں جانتی ہیں جبکہ آپ ڈاکٹر جبار یوسفی کی بیوہ ہیں' آپ کو اتنا تو معلوم ہونا چاہئے کہ آپ کے سوتیلے بیٹے نے آپ سے کیا کچھ چھپا رکھا ہے؟"

"آپ اسے میرا بیٹا نہ کہیں' بیٹا کہنے سے لوگ یہی سمجھیں گے کہ میری عمر زیادہ ہے حالانکہ آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ میں ابھی کتنی کم سن ہوں' اسی لئے میں نے کبھی اس لڑکے کا سامنا نہیں کیا' اس نے بھی آج تک مجھے نہیں دیکھا ہے لیکن اب ایک دوسرے کا سامنا ہو گا' کیونکہ مجھے اپنے مرحوم شوہر کی جائیداد سے اپنا حصہ وصول کرنا ہے مگر اس سے پہلے میں مہ جبیں سے انتقام لینا چاہتی ہوں' جس نے میرے خاوند کو قتل کیا ہے' میں اسے زندہ نہیں دیکھنا چاہتی' اسی لئے میں نے آپ کو معاوضہ کی آدھی رقم پیشگی دی تھی لیکن آپ نے اب تک اسے ٹھکانے نہیں لگایا۔"

"میرا آدمی اسی مقصد کے لئے گیا تھا لیکن میں پہلے ہی یہ کہہ چکا ہوں کہ مہ جبیں اچانک ہی اس کی خوابگاہ سے لاپتہ ہو گئی تھی اور اس کی جگہ کوئی دوسری عورت آ گئی تھی۔"

"یہی تو میں نے بھی پوچھا تھا کہ یہ کیسے ہو گیا؟ مہ جبیں کہاں چلی گئی؟ وہ دوسری عورت کون تھی؟ کیا آپ کے آدمی نے اس کا حلیہ بتایا ہے؟"

"ہاں' وہ دوسری عورت مہ جبیں کی ہمشکل تھی لیکن کچھ بوڑھی سی نظر آتی تھی۔"

مادام روزینہ نے چونک کر کہا:

"اوہ' اگر وہ مہ جبیں کی ہمشکل تھی تو اسے ہی مار ڈالنا چاہئے تھا۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ اس دوسری عورت سے آپ کو کیا دشمنی ہے؟"

"آپ نہ پوچھیں کہ مجھے کس سے دشمنی ہے اور کیوں ہے؟ بس اتنا سمجھ لیجئے کہ وہ مہ جبین کی ہمشکل ہے' اس لئے وہی میرے خاوند کی قاتلہ ہو سکتی ہے اور وہی عورت نازنین ہو سکتی ہے جو اتنے پُراسرار طریقے سے لیبارٹری میں گئی تھی کہ اس وقت مہ جبیں اور نازنین کے درمیان جو عمر کا فرق ہے وہ سمجھ میں نہیں آیا تھا' ویسے آپ کو یہ سب کچھ

سمجھنے کی کیا ضرورت ہے' آپ اپنے کام سے کام رکھیں۔ مہ جبیں یا نازنین میں سے جو بھی ہتھے چڑھ جائے فوراً ختم کر دیجئے۔"

"اگر آپ پہلے ہی یہ بات کہہ دیتیں تو کل رات نازنین کا کام تمام ہو جاتا۔ آپ نے تو صرف مہ جبین کو ختم کرنے کے لئے کہا تھا۔ بہرحال نازنین اس کی ہمشکل ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ مہ جبیں کی بڑی بہن ہے یا اس کی ماں ہے' میں کوٹھے پہ جا کر اس کے متعلق معلومات حاصل کروں گا۔"

"کوٹھے پہ جانے سے آپ کو کچھ حاصل نہ ہو گا۔ وہاں نازنین نام کی کوئی عورت نہیں ملے گی' آپ کو یہی بتایا جائے گا کہ وہ ایک سال پہلے مر چکی ہے' اس کی موت کی تصدیق کرنے والے ڈاکٹر اور اس کے یار موجود ہیں۔"

"آپ اس کے متعلق بہت کچھ جانتی ہیں' آپ نے پہلے نازنین کے متعلق کچھ نہیں بتایا اور اب بھی بہت کچھ چھپا رہی ہیں۔"

"میں اتنا ہی بتاتی ہوں جتنا کہ ضروری ہوتا ہے۔"

"مادام! کسی کو قتل کرنے کے لئے اس کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ نازنین کے متعلق جو کچھ جانتی ہیں وہ مجھے بتا دیں۔ اس طرح اسے شکار کرنے میں آسانی ہو گی۔"

مادام روزینہ صوفے پر پہلو بدلتی ہوئی کچھ سوچنے لگی' پھر اس نے کہا۔

"میں اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا سکتی' وہ دونوں آپس میں بہنیں ہیں۔ وہ آپ کو کبھی ایک جگہ نظر نہیں آئیں گی۔ جہاں آپ مہ جبیں کو دیکھیں گے وہاں کبھی نازنین کو نہیں دیکھ سکیں گے' اگر اتفاقاً نازنین کو دیکھ لیا تو مہ جبیں نظر نہیں آئے گی۔"

"آپ تو پہیلیاں بجھوا رہی ہیں' صاف صاف بتایئے تاکہ میری سمجھ میں بھی کچھ آئے۔"

"صاف اور سیدھی بات یہ ہے کہ مہ جبیں اور نازنین دو الگ ہستیاں نہیں ہیں ایک ہی شخصیت کے دو روپ ہیں' ایک جوانی کا دوسرا بڑھاپے کا۔ یہ ایک نفسیاتی کیس ہے' اسے ماہر نفسیات اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ بعض اوقات عورت اپنی بڑھتی ہوئی عمر کے متعلق اتنی شدت سے سوچتی ہے کہ سوچتے سوچتے وہ جسمانی طور پر تبدیل ہو جاتی ہے' یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے آپ کا ذہن مشکل سے تسلیم کرے گا اور پھر آپ کے تسلیم کرنے یا نہ کرنے سے کیا فرق پڑتا ہے' آپ کو تو صرف معاوضہ لینا ہے اور قتل کرنا

ہے خواہ وہ مہ جبیں ہو یا نازنین۔"

"اچھی بات ہے' آج رات مہ جبیں جہاں بھی ہو گی قتل کر دی جائے گی۔"

مادام روزینہ نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "آج رات یہ کام ہو گیا تو صبح آپ کو معاوضے کی رقم مل جائے گی' آپ اس ڈائری کے پیچھے اپنا وقت برباد نہ کریں' اسے میں حاصل کر لوں گی۔"

یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلی گئی' نادر جیب سے سگار نکال کر سلگاتے ہوئے ایک ہی عورت کے دو روپ کے بارے میں سوچنے لگا۔ کیا عورت اپنی عمر کے متعلق اتنی شدت سے سوچتی ہے کہ جسمانی طور پر تبدیل ہو کر کبھی نازنین کی طرح بوڑھی اور کبھی مہ جبیں کی طرح نوجوان بن جاتی ہے' یہ نفسیاتی مسئلہ نادر کے حلق سے نہیں اتر رہا تھا۔

☆======☆======☆

انصار نے پلٹ کر دیکھا تو سامنے ایک لانبے قد کا دبلا پتلا سا آدمی اپنی بتیسی نکالے کھڑا تھا' اس کے شانے سے کیمرہ لٹک رہا تھا' اس نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"میرا نام وہ ہے' میں آپ سے بہت ضروری وہ کرنے آیا ہوں۔"

انصار حیرانی سے پلکیں جھپکا جھپکا کر دیکھنے لگا' اس کی حیرانی دیکھ کر اس نے کہا۔

"شاید آپ نہیں سمجھے' میرا نام وہ ہے' وہ یعنی جمشید ہے میں آپ سے بہت ضروری وہ .... وہ .... لاحول ولاقوۃ' میرا وہ کسی کی سمجھ میں ہی نہیں آتا۔ میں آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں آپ سے بہت ضروری باتیں کرنے آیا ہوں۔"

"فرمایئے۔" انصار نے کہا۔ "آپ ایسی کون سی ضروری باتیں کرنا چاہتے ہیں؟"

"میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کل رات آپ کے گھر سے وہ چوری ہو گئی تھی یعنی ڈائری چوری ہو گئی تھی۔ مجھے انسپکٹر صاحب نے بتایا ہے' میں آپ کے غم میں برابر کا وہ ہوں۔"

انصار نے اسے ناگواری سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے ڈائری کے چرائے جانے کا کوئی غم نہیں ہے۔ کیا یہی ضروری باتیں آپ کرنا چاہتے تھے؟"

"جی نہیں' اور بھی دوسری ضروری وہ ہیں۔ میں وہ ہوں یعنی فوٹوگرافر ہوں' جس عورت نے آپ کی وہ چرائی ہے' میں نے اس کی وہ اتار لی ہے یعنی تصویر اتار لی ہے' کیا وہ آپ دیکھنا پسند فرمائیں گے؟ یہ دیکھئے۔"

اس نے لفافے سے نازنین کی تصویر نکال کر اس کی طرف بڑھا دی۔ تصویر کو دیکھتے

ہی انصار کی دلچسپی بڑھ گئی' اسے تصویر میں مہ جبیں کا بڑھاپا نظر آ رہا تھا۔ اسے یاد آ رہا تھا کہ پچھلی رات اس نے نشے کی حالت میں اسی عورت کو دیکھا تھا۔ تصویر میں جو ڈائری نظر آ رہی تھی وہ اس کے ڈیڈی کی تھی۔ وہ بغیر عینک کے اس ڈائری کو پہچان سکتا تھا۔ اس نے جمشید سے کہا۔

"آپ بہت کام کے آدمی ہیں۔ انسپکٹر کو میری بات کا یقین نہیں آ رہا تھا کہ کوئی دوسری عورت میری خوابگاہ میں آئی تھی اور ڈائری چرا کر لے گئی تھی' یہ تصویر اس بات کا مکمل ثبوت ہے کہ میری خوابگاہ میں آنے والی نازنین ہی تھی' وہ مردہ نہیں ہے زندہ ہے' ہمیں اب تک دھوکہ دیا جا رہا تھا۔"

"انسپکٹر صاحب بھی یہی کہہ رہے تھے یہ عورت وہ نہیں ہے وہ ہے۔ یعنی مردہ نہیں ہے زندہ ہے۔ اسی لئے وہ پھر سے تحقیقات کرنے گئے ہیں۔ کچھ بھی ہو یہ میری فوٹوگرافی کا وہ ہے کہ ایک مردہ عورت کو وہ ثابت کر دیا۔ یعنی یہ ثابت ہو گیا ہے کہ وہ زندہ ہے۔ روزنامہ "ہلچل" کے ایڈیٹر طارق محمود نے اس تصویر کے وہ دیئے ہیں' یعنی پچاس روپے دیئے ہیں۔ انسپکٹر صاحب نے اتنے ہی وہ دیئے ہیں اور سرکار سے وہ دلانے کا وعدہ کیا ہے' یعنی انعام دلانے کا وہ کیا ہے' اگر آپ بھی ایک تصویر وہ کر لیں تو میری وہ ہو جائے گی یعنی آمدنی ہو جائے گی' میرا پیشہ یہی ہے۔"

انصار نے اس کے شانے تھپکتے ہوئے کہا۔

"میں یہ تصویر ضرور خریدوں گا' آؤ اندر چلو میں ابھی تمہیں پچاس روپے دوں گا۔"

جمشید اس کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے پورچ سے گزرتا ہوا کوٹھی کے اندر ڈرائنگ روم میں آ گیا' وہ انصار کو پچھلی رات کا واقعہ بتا رہا تھا کہ ایک شخص آہنی سلاخ لئے ہوئے کس طرح نازنین کا پیچھا کر رہا تھا' اس نے بھی تصویر اتارنے کے بعد آہنی سلاخ والے کا پیچھا کیا تھا' وہ بدمعاش ڈائری لے کر بھاگ گیا' وہ مزید اس کا پیچھا نہ کر سکا کیونکہ بیچ سڑک پر ایک لڑکی اوندھے منہ پڑی ہوئی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر مجبوراً رک گیا۔ اس وقت اس کی سمجھ میں یہ نہیں آیا تھا کہ بھاگنے والی اور سڑک پر پائی جانے والی دونوں ہمشکل ہیں' ان کے درمیان صرف عمر کا فرق ہے' یہ بات اس لئے سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ نازنین اس کے سامنے تیزی سے بھاگتی ہوئی گزر گئی تھی۔ فوٹو پرنٹ کرنے کے بعد اس کی سمجھ میں آیا کہ سڑک پر پائی جانے والی اس تصویر والی کی ہمشکل تھی۔

اس کی باتیں سن کر انصار سوچ رہا تھا کہ نازنین کی ہمشکل مہ جبیں ہے اور کوئی

دوسری نہیں ہو سکتی' اس نے جمشید سے پوچھا:

"کیا واقعی وہ دونوں ہمشکل تھیں؟ کیا سڑک پر پائی جانے والی نازنین کے مقابلے میں جوان تھی؟"

"جی ہاں وہ جوان تھی اور نازنین کی چھوٹی وہ تھی یہ بات مجھے روزنامہ وہ کے دفتر سے معلوم ہوئی ہے۔ انسپکٹر صاحب نے وہ صاحب کو یعنی طارق صاحب کو ان دونوں بہنوں کی تصویر دکھائی' طارق صاحب نے مجھے بتایا کہ وہ کل تمام رات آپ کے یہاں تھی۔ اگر یہ سچ ہے تو آپ ہی وہ کر سکتے ہیں یعنی بتا سکتے ہیں کہ مہ جبیں کل رات آپ کی اس کوٹھی سے نکل کر وہ پر کیسے پہنچ گئی تھی' یعنی سڑک پر کیسے پہنچ گئی تھی؟"

"یہی میں بھی سوچ رہا ہوں کہ وہ میری خوابگاہ میں تھی' پھر سڑک پر کیسے پہنچ گئی' اس تصویر کو دیکھنے کے بعد یقین ہو گیا ہے کہ نازنین زندہ ہے' جب وہ ڈائری چرا کر بھاگ رہی تھی تو مہ جبیں نے بھی اس کا ساتھ دیا ہو گا۔ وہ اپنی بہن کو بخیریت کوٹھی سے نکال کر لے گئی ہو گی' پھر کہیں ٹھوکر کھا کر گر پڑی ہو گی۔ اور ایسے ہی آپ اس کے قریب پہنچ گئے تھے۔"

جمشید نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"جی نہیں' بھاگنے والی دو نہیں ایک تھی' صرف نازنین وہ کر رہی تھی یعنی بھاگ رہی تھی' میں نے مہ جبیں کو وہ کرتے نہیں دیکھا' جب میں آگے بڑھا تو اسے بیچ سڑک پر پایا۔"

انصار پریشانی سے سوچنے لگا کہ مہ جبیں سڑک پر کیسے پہنچ گئی تھی اگر وہ اپنی بہن کے ساتھ ڈائری چرا کر لے گئی تھی تو پھر خوابگاہ میں واپس کیسے چلی آئی' وہ بہت دیر تک سوچتا رہا لیکن اس الجھن کو نہ سلجھا سکا۔

کچھ دیر بعد اس نے ملازم کو چائے لانے کا حکم دیا۔ پھر ریسیور اٹھا کر انسپکٹر کے نمبر ڈائل کرنے لگا' اس سے رابطہ قائم ہونے کے بعد اس نے نازنین کے متعلق پوچھا' انسپکٹر نے بتایا کہ نازنین جس کے زیرِ علاج تھی وہ ڈاکٹر اور اس کے گاہک اور بازارِ حسن کے چیئرمین وغیرہ سبھی اس کی تصدیق کر رہے ہیں۔ اس محلے کے کتنے ہی لوگوں نے بتایا ہے کہ وہ نازنین کے جنازے کو کاندھا دے چکے ہیں۔ روزنامہ "ہلچل" کے ایڈیٹر یہ خبر شائع کرنے والے ہیں کہ ڈاکٹر جبار یوسفی کو نازنین کی روح نے ہلاک کیا ہے' سوچا جائے تو ان حالات میں یہی ایک سوال ابھرتا ہے کیا واقعی اس کی روح نے ڈاکٹر کو ہلاک کیا ہے؟

جواب میں انصار نے کہا۔

"میرے ذہن میں ایک تدبیر ہے' ہو سکتا ہے کہ اس تدبیر پر عمل کرنے سے مہ جبیں یا نازنین کی اصلیت سامنے آ جائے' کیا آپ تھوڑی دیر کے لئے یہاں آنا پسند کریں گے؟"

انسپکٹر نے آنے کا وعدہ کر کے ریسیور رکھ دیا۔

☆======☆======☆

رات کے دس بجے تھے' انصار اپنی خواب گاہ میں بیٹھا وہسکی کا دوسرا پیگ چڑھا رہا تھا' حالانکہ جو تدبیر اس نے انسپکٹر کے سامنے پیش کی تھی اس پر عمل کرنے کے لئے ضروری تھا کہ وہ شراب سے پرہیز کرتا' لیکن وہ عادت سے مجبور ہو کر پی رہا تھا۔ جمشید اس کے سامنے بیٹھا ہوا اس کا منہ تک رہا تھا۔ تدبیر کے مطابق وہاں جمشید فوٹوگرافر کی موجودگی بھی بہت ضروری تھی۔

تدبیر یہ تھی کہ مہ جبیں کو دوبارہ خوابگاہ میں بلایا جائے۔ انصار کا خیال تھا کہ مہ جبیں یا اس کی بہن نازنین اصل ڈائری حاصل کرنے کی ضرور کوشش کریں گی۔ اگر مہ جبیں سے پھر ایک رات کا سودا کر لیا جائے اور اسے خود ہی یہاں آنے کا موقع دیا جائے تو اس کی بہن نازنین بھی اس کے پیچھے آئے گی۔ (اگر وہ زندہ ہو)

جمشید کو اسی لئے وہاں روکا گیا تھا کہ اگر نازنین آئے تو اس کی مختلف تصویریں اتار لی جائیں۔ انسپکٹر نے کہا تھا کہ اس کے سپاہی کوٹھی کے باہر موجود رہیں گے اگر نازنین یا کوئی بھی عورت ڈائری لے کر کوٹھی سے نکلے گی تو وہ اسے حراست میں لے لیں گے۔

اس رات کے لئے مہ جبیں سے سودا ہو چکا تھا' اسے پیشگی رقم دے دی گئی تھی۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ آدھی رات کے بعد مجرے سے فارغ ہو کر وہاں آئے گی لیکن آدھی رات سے پہلے ہی ملازم نے بتایا کہ کوئی عورت ملنے آئی ہے' انصار نے جمشید سے کہا کہ وہ پاس والے کمرے میں چلا جائے۔ اگر خوابگاہ میں نازنین آئے یا کوئی دوسری عورت ڈائری کے سلسلے میں جھگڑا کرے تو وہ ایسے مواقع کی خاص خاص تصویریں اتار لیا کرے۔

جمشید دوسرے کمرے میں چلا گیا' اس کے جاتے ہی وہ اٹھلاتی لہراتی اور تبسم کی بجلیاں گراتی ہوئی خوابگاہ میں آ گئی۔ انصار مدہوش نہیں تھا لیکن اتنی پی چکا تھا کہ سرور میں آ گیا تھا۔ اس نے خمار میں ڈوبی ہوئی نظروں سے آنے والی کو دیکھا تو وہ دنیا کی سب سے

حسین عورت نظر آئی' نشے کی خوبی یہ ہے کہ عورت کی عمر کا پتہ نہیں چلتا' بوتل کے سامنے آکر آدھی عمر گھٹ جاتی ہے' چالیس برس کی بڑھیا بیس برس کی حسین گڑیا نظر آتی ہے' آنے والی نے کہا۔

"میں انجمن اتحاد الخواتین کی سیکرٹری ہوں' تم سے ایج میٹر کے متعلق باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

"آؤ یہاں بیٹھو۔" انصار نے بڑے پیار سے اپنے قریب بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

"روزینہ!" وہ بڑی بے تکلفی سے اس کے قریب بیٹھ گئی۔

انصار نے اپنے گلاس سے آخری گھونٹ پینے کے بعد کہا۔

"جب میں دس برس کا تھا تو میرے ڈیڈی نے ایک جوان لڑکی سے شادی کی تھی اب تو وہ بوڑھی ہو گئی ہو گی' اس کا نام بھی روزینہ ہے' وہ مجھ سے اس لئے نفرت کرتی ہے کہ مجھے بیٹا کہے گی تو بہت زیادہ عمر والی سمجھی جائے گی' اسے انصار نام کے ہر نوجوان سے نفرت ہے اور میں روزینہ نام کی ہر عورت کو بوڑھی سمجھتا ہوں لیکن تعجب ہے کہ تم بوڑھی نظر نہیں آرہی ہو' یوں لگتا ہے کہ تم وینس کے مجسمے کی طرح صدیوں سے جوان ہو' اور ایج میٹر تمہاری جوان عمری کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔"

روزینہ اس کے خالی گلاس میں وہسکی انڈیلنے لگی' پھر اس نے گلاس اٹھا کر اس کی جانب بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"آخر ایج میٹر تیار کرنے کا فائدہ کیا ہے' یہ دنیا اتنی رنگین نہیں ہے ہم عورتیں اپنی عمر گھٹا کر یا جوانی کا خول چڑھا کر اسے تم لوگوں کے لئے رنگین بناتی ہیں' اگر ہماری زندگی میں تھوڑا سا جھوٹ اور فریب نہ ہو تو یہ دنیا پھیکی پھیکی اور ویران نظر آئے گی' تم جس رنگ کے شیشے کی عینک لگا کر دیکھو گے۔ آس پاس کے نظارے اسی رنگ کے نظر آئیں گے' نشے کی عینک چڑھا کر دیکھو گے تو اس دنیا کی کوئی روزینہ بوڑھی نظر نہیں آئے گی' وہ نشے کی ترنگ اور دل کی امنگ کی طرح جوان دکھائی دے گی۔

دیکھو' میری باتیں سمجھنے کی کوشش کرو' انسان سچائی کی تلخیوں سے گھبرا گیا ہے' وہ چھوٹے چھوٹے جھوٹ سے بہلنا چاہتا ہے' تم خود ہی کہو' اگر ایج میٹر ابھی یہ کہے کہ میں کم عمر نہیں ہوں' بوڑھی ہوں تو کیا تم یقین کر لو گے؟"

"نہیں .... کبھی نہیں۔" وہ نشے میں لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے کہنے لگا۔ "جو

تمہیں بوڑھی کہے گا میں اس کی زبان کھینچ لوں گا' میں ایسے ایج میٹر کو توڑ کر پھینک دوں گا جو تمہاری توہین کرے گا۔"

"تمہارے پاس ایج میٹر نہیں ہے' وہ چوری ہو چکا ہے' تم اس ڈائری کو جلا ڈالو جس میں ایج میٹر بنانے کے طریقے لکھے ہیں۔"

"آں .... ڈائری .... نہیں ایسی کوئی ڈائری میرے پاس نہیں ہے۔"

"نشے کی حالت میں انسان سچ کہتا ہے لیکن تم جھوٹ بول رہے ہو۔ تمہارے پاس ڈائری ہے۔"

"تمہاری قسم' ایسی کوئی ڈائری نہ میرے پاس ہے نہ میرے باپ کے پاس تھی' میں نے مہ جبیں کو چڑانے کے لئے جھوٹ کہا تھا۔ اس کی بہن نازنین نے سمجھا کہ میں سچ کہہ رہا ہوں' وہ ایک فضول سی ڈائری چرا کر لے گئی۔ ایک بات بتاؤں' وہ نازنین جو ایک سال پہلے مر گئی تھی' اب زندہ ہو گئی ہے اگر وہ یہاں آئے گی تو میں تمہیں اس سے ملاؤں گا۔"

"تم نازنین کی باتیں نہ کرو' ڈائری کے متعلق بتاؤ' کیا واقعی ایج میٹر بنانے کے طریقے کہیں درج نہیں ہیں؟"

"نہیں' میرے ڈیڈی کو کیا معلوم تھا کہ وہ اچانک مر جائیں گے اگر معلوم ہوتا تو وہ ایج میٹر بنانے کی تفصیلات لکھ کر میرے حوالے کر دیتے لیکن انہوں نے ایسی دانشمندی کا ثبوت نہیں دیا۔ میں تمہاری جوانی کی قسم کھاتا ہوں کہ میں جھوٹ نہیں کہہ رہا ہوں' آؤ میری سچائی پر مجھے بوسہ دو۔"

روزینہ ایک جھٹکے سے کھڑی ہو گئی' پھر اس کے سر پر ایک چپت مارتے ہوئے بولی۔

"اُلو کے پٹھے! میں تیرے باپ کی بیوی تھی' اب بیوہ ہوں' کیا تو میرا بوسہ لے گا۔ اگرچہ میں نے تیری ماں کہلانا کبھی منظور نہیں کیا لیکن تم کیسے لوگ ہو کہ نشے میں ماں اور محبوبہ کی عمر کا فرق نہیں سمجھ سکتے' تم ایک نہیں' ہزار ایج میٹر بناؤ مگر تم اسی طرح بھٹکو گے اور عمر کا فریب کھاؤ گے اور ایک کم عمر داشتہ سمجھ کر اپنی ماں سے بوسہ طلب کرو گے' لعنت ہے تم پر۔ میں تو اس لئے یہاں آئی ہوں کہ تمہارا قصہ ہی تمام کر دوں۔ نہ ڈائری رہے گی' نہ تم میرے خاوند کی جائیداد کے حصہ دار بن کر رہو گے۔"

یہ کہہ کر اس نے انصار کی ناک پر سے عینک کھینچ لی' انصار نے غصہ سے کہا۔

"چڑیل' میری عینک واپس کر دے' میں تجھے پہچان گیا ہوں' تُو میری جان کی دشمن ہے۔"

وہ دونوں ہاتھوں سے راستہ ٹٹولتے ہوئے ایک اندھے کی طرح روزینہ کی طرف بڑھنے لگا۔ عینک کے بغیر نگاہوں کے سامنے ہر چیز دھندلا گئی تھی۔ نشے کی وجہ سے سر گھوم رہا تھا۔ قدم ڈگمگا رہے تھے' وہ خود کو نہیں سنبھال سکتا تھا۔ پھر روزینہ کا ہاتھ کیسے پکڑ سکتا تھا۔ روزینہ نے وہسکی کی بوتل اٹھا کر اس کے سر پر دے ماری' بوتل ٹوٹ کر بکھر گئی۔ سر لہولہان ہو گیا اور وہ چکرا کر گر پڑا۔

دوسرے کمرے میں جمشید کیمرہ سنبھالے کھڑکی کے پاس کھڑا تھا لیکن وہ اتنے اہم موقع کی تصویر نہ اتار سکا کیونکہ اس کے دونوں ہاتھ کانپ رہے تھے' اس ڈیڑھ پسلی کے آدمی کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے بوتل اسی کے سر پر توڑی گئی ہے' اس نے اپنی زندگی میں کبھی کسی کو قتل ہوتے اور کسی کا خون بہتے نہیں دیکھا تھا' اس لئے وہ خوفزدہ تھا' اسے اس بات کا بھی ڈر تھا کہ تصویر اتارتے ہی روزینہ ٹوٹی ہوئی بوتل لے کر اس پر پل پڑے گی' اس خیال کے آتے ہی وہ جس کمرے میں تھا اسے اندر سے بند کرنے لگا۔

روزینہ کی توجہ انصار پر تھی' وہ بے حس و حرکت فرش پر پڑا ہوا تھا اور یوں سانس لے رہا تھا جیسے آہستہ آہستہ دم توڑ رہا ہو' وہ حقارت سے کہنے لگی:

"میں نے تمہارے باپ کو بھی اسی طرح ہلاک کیا تھا' کسی کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ ہماری عمر کو ننگا کرے؟ اس روز لیبارٹری میں دوپہر کو مہ جبیں آئی تھی' میں نے اسے رخصت کر دیا' اس کی جگہ میں لیبارٹری میں موجود رہی اور ڈاکٹر کو سمجھاتی رہی کہ وہ ایج میٹر کو عام نہ کرے' بہتر ہے کہ اسے ضائع کر دے لیکن وہ اپنے ارادے سے باز نہیں آیا۔ مجبور ہو کر میں نے اسے ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا اور ایج میٹر لے کر وہاں سے چلی آئی۔ اس ایج میٹر کو میں نے توڑ کر برباد کر دیا ہے۔ لیبارٹری میں آنے والی دونوں عورتیں مس فریدہ اور حمیدہ بانو کبھی میرے خلاف گواہی نہیں دیں گی' کیونکہ میں نے ایج میٹر کو برباد کر کے دنیا کی تمام عورتوں پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ مہ جبیں پر بھی مجھے پورا بھروسہ تھا کہ وہ میرے خلاف گواہی نہیں دے گی' کیونکہ وہ ایک طوائف ہے اور کوئی طوائف یہ نہیں چاہتی کہ ایج میٹر عام ہو جائے اور اس کے گاہک دام لگانے سے پہلے ایج میٹر سے اس کی عمر کا حساب کریں۔

لہٰذا مجھے مہ جبیں پر بھروسہ تھا مگر اسے ایک بیماری ہے۔ وہ اپنی بڑھتی ہوئی عمر کو شدت سے سوچتی ہے تو سوچتے سوچتے اپنی بوڑھی بہن نازنین کا روپ اختیار کر لیتی ہے' وہ جسمانی لحاظ سے صرف مہ جبیں ہے لیکن دوہری شخصیت کے اعتبار سے نازنین بھی

ہے' اس سے اس بات کا خطرہ ہے کہ نازنین کے روپ میں اسے بہت غصہ آتا ہے' وہ غصہ کی حالت میں کسی کو بھی بتا سکتی ہے کہ لیبارٹری میں آنے والی تیسری عورت میں ہوں' اس لئے میں نے مہ جبیں کو بھی راستے سے ہٹانے کا انتظام کر لیا ہے' وہ مر جائے گی تو پولیس والے مہ جبیں اور نازنین کے الجھاوے سے نہیں نکل سکیں گے۔"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی' کیونکہ انصار مرنے کے بجائے آہستہ آہستہ سر اٹھا رہا تھا' اس کا چہرہ لہو میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹنے لگی۔ انصار تھرتھراتے ہوئے فرش پر سے اٹھنے لگا۔ شراب کا نشہ ہرن ہو گیا تھا۔ اب جان لینے کا نشہ حاوی تھا' اس نے دونوں ہاتھ اس طرح بڑھائے جیسے روزینہ کا گلا گھونٹنا چاہتا ہو لیکن اس کی ظاہری حالت سے پتہ چل رہا تھا کہ اس کے ہاتھوں میں گلا گھونٹنے کی سکت نہیں ہے۔

روزینہ وہاں سے فرار ہو سکتی تھی لیکن انصار کو زندہ چھوڑ کر جانے کا مطلب یہ ہوتا کہ اس کے جرم پر سے پردہ اٹھنا شروع ہو جاتا وہ جانا نہیں چاہتی تھی' اس ادھ مرے کو تھکا کر گرانا چاہتی تھی' اتنے میں اس کے پیچھے والی کھڑکی سے جمشید نے کہا:

"اے خبردار! ادھر وہ کرو' یعنی کہ ادھر منہ کرو۔"

روزینہ نے چونک کر ادھر دیکھا' وہاں ایک شخص کو کیمرے کے ساتھ دیکھ کر وہ گھبرا گئی' جمشید نے کیمرے کا بٹن دبایا مگر اس سے پہلے ہی اس نے منہ پھیر لیا۔ اس وقت تک انصار قریب آ گیا تھا' اس نے روزینہ کی گردن کی جانب ہاتھ بڑھائے لیکن وہ اس کے شانوں پر ٹیک کر رہ گیا۔ اس کی آخری قوتیں بھی ساتھ چھوڑ رہی تھیں۔ روزینہ نے اسے کمزور پڑتے دیکھ کر فوراً ہی اس کی گردن دبوچ لی۔

انصار میں اب جان ہی کیا رہ گئی تھی' اس لئے ایک عورت کے نازک ہاتھ اس کا گلا دبوچ رہے تھے اور اس کے دیدے پھیلتے جا رہے تھے جمشید نے پھر کیمرے کا بٹن دبایا۔ فلیش بلب کی روشنی کا ایک جھماکا ہوا اور تصویر اتر گئی' لیکن اس وقت بھی روزینہ کی پشت کیمرے کی جانب تھی۔ جمشید اسے للکارنے لگا۔

"اے' تم اس کا وہ دبا کر یعنی گلا دبا کر میرے پاس نہیں آ سکتیں میں بہت وہ ہوں' میں عورتوں سے لڑنا اپنی وہ سمجھتا ہوں' یعنی توہین سمجھتا ہوں' اسی لئے میں نے دروازے وہ کر دیئے ہیں' تم اندر نہیں آ سکو گی۔"

اس وقت تک انصار ہمیشہ کے لئے ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ اس کی لاش فرش پر پڑی ہوئی تھی' اس کی موت کا یقین ہوتے ہی روزینہ وہاں سے بھاگنے لگی' کیمرے کا فلیش بلب

ایک بار پھر روشن ہو کر بجھ گیا۔ وہ بھاگتی ہوئی خواب گاہ سے باہر چلی گئی' جمشید بند کمرے میں کھڑکی کے پاس کھڑا رہ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ روزینہ شاید کہیں چھپ گئی ہے۔ اگر اس نے دروازہ کھولا تو وہ اس پر بھی حملہ کرے گی۔ خواب گاہ میں انصار کی لاش کو اور بہتے ہوئے لہو کو دیکھ کر اس کا سر چکرا رہا تھا۔ وہ منہ پھیر کر ایک جگہ بیٹھ گیا اور خود میں حوصلہ پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگا' یہ سوچ کر اپنی حوصلہ افزائی آپ کرنے لگا کہ اس نے قتل کی واردات کی تصویریں اتار کر بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔

بہت دیر بعد اس نے دروازہ کھول کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ جا چکی ہے تو وہ دوڑتا ہوا ٹیلیفون کے پاس آیا اور ریسیور اٹھا کر انسپکٹر کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔

تقریباً دو گھنٹے کے بعد وہ اپنے ڈارک روم میں فلم نیگیٹو کی دھلائی کر رہا تھا۔ انسپکٹر اس کے پاس کھڑا ہوا تصویریں دیکھنے کا بے چینی سے منتظر تھا۔ ان تصویروں کے ذریعہ وہ مادام روزینہ کو مجرمہ ثابت کر سکتا تھا۔ اس وقت وہ جمشید کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا کہ اس کے اس کارنامے کا معقول معاوضہ دیا جائے گا اور سرکار کی طرف سے اسے انعام بھی ملے گا۔

لیکن نیگیٹو دھلنے کے بعد کسی عورت کا چہرہ نظر نہیں آیا۔ ان کے پرنٹ تیار ہونے کے بعد انسپکٹر نے تصویریں دیکھیں تو غصہ سے جھلا گیا۔ کیونکہ تمام تصویروں میں روزینہ کی پشت نظر آ رہی تھی' جس تصویر میں وہ انصار کا گلا دبوچ رہی تھی' اس میں بھی اس کے سر کا پچھلا حصہ نظر آ رہا تھا اور انصار کا خون آلود چہرہ سامنے تھا اور اس کے پھیلے ہوئے دیدے نظر آ رہے تھے۔

انسپکٹر نے تمام تصویریں جمشید کے منہ پر پھینکتے ہوئے کہا۔

”تمہیں فوٹوگرافر بننے کا مشورہ کس نے دیا تھا جب بھی تصویریں اتارتے ہو تو مجرم کا چہرہ غائب کر دیتے ہو' اس رات بھی جب ایک اجنبی آہنی سلاخ لئے نازنین کا پیچھا کر رہا تھا' تم نے اس کی پشت کی جانب سے تصویر اتاری تھی' روزینہ کی تصویروں میں بھی اس کی پشت نظر آ رہی ہے۔ ہم عدالت میں یہ ثابت نہیں کر سکیں گے کہ یہ سب روزینہ کی تصویریں ہیں۔“

”جناب! میں کیا کر سکتا ہوں' وہ قاتلہ بہت وہ ہے یعنی چالاک ہے وہ ہمیشہ اپنی پشت کیمرے کی طرف وہ کر لیتی تھی' اس میں میری کوئی وہ نہیں ہے۔“

انسپکٹر نے جھلا کر تمام تصویریں سمیٹ لیں' انہیں اس خیال سے جیب میں رکھ لیا کہ شاید وہ سب کسی کام آ جائیں۔ اگرچہ ہر تصویر میں روزینہ کی پشت نظر آ رہی تھی لیکن روزینہ ان تصویروں کو دیکھ کر خوفزدہ ہو سکتی تھی اور اپنے جرم کا اعتراف کر سکتی تھی۔

جب وہ روزینہ کی کوٹھی میں پہنچا تو وہاں ڈرائنگ روم میں روزینہ کی حمایت کرنے والی کتنی ہی عورتیں اور مرد بیٹھے ہوئے تھے' ان میں روزنامہ ”ہلچل“ کے ایڈیٹر طارق محمود بھی تھے۔ انجمن اتحاد الخواتین کی صدر بھی تھیں۔ ان کے علاوہ حکومت کے اعلیٰ افسران سے ڈھکے چھپے تعلقات رکھنے والی حسینائیں بھی روزینہ کی حفاظت کے لئے موجود تھیں۔ انسپکٹر نے اسے مجرم ثابت کرنے کے لئے وہ تصویریں پیش کیں تو روزینہ نے بڑی ڈھٹائی سے کہہ دیا کہ وہ اس کی تصویریں نہیں ہیں۔

طارق محمود نے کہا:

”انسپکٹر! پتہ نہیں آپ کس عورت کا جرم مادام روزینہ کے سر تھوپ رہے ہیں۔ ان تصویروں میں مادام کہیں نظر نہیں آ رہی ہیں۔“

انسپکٹر نے کہا۔ ”وہ فوٹوگرافر اس بات کا گواہ ہے کہ مادام نے اپنے سوتیلے بیٹے کو ہلاک کیا ہے اور اس کے سامنے اعتراف کیا ہے کہ اپنے خاوند کو بھی انہوں نے ہلاک کیا تھا' ان کی زبانی پتہ چلا کہ مہ جبیں دوہری شخصیت کی حامل ہے۔ بعض اوقات اس پر نازنین کی شخصیت حاوی ہو جاتی ہے۔ ہم اب تک دھوکہ کھاتے رہے' مہ جبیں اور نازنین کے درمیان الجھتے رہے اور مادام نے ہمیں مزید الجھانے کے لئے آج ہی رات مہ جبیں کو قتل کرا دیا ہے۔ اس کے مرنے سے مادام کا یہ فائدہ ہوتا کہ ہمارا دھیان مادام کی طرف نہ جاتا لیکن ان کی بدقسمتی ہے کہ ایک فوٹوگرافر نے اپنی آنکھوں سے انہیں انصار کو قتل کرتے دیکھا ہے۔“

”آپ کا فوٹوگرافر اور اس کی تصویریں سب بیکار ہیں۔“ طارق محمود نے کہا۔ ”میں جمشید کو اچھی طرح جانتا ہوں وہ اول درجے کا احمق اور بزدل ہے۔ عدالت میں ایسے احمق آدمی کی گواہی قبول نہیں ہو گی۔“

اس کی بات ختم ہوتے ہی دروازے سے جمشید کی آواز سنائی دی۔

”کیا مجھے اندر آنے کی وہ مل سکتی ہے؟ جناب انسپکٹر صاحب! جب آپ میرے ڈارک روم سے چلے گئے تو میرے وہ میں وہ آیا۔ یعنی میرے دماغ میں ایک آئیڈیا آیا۔

میں فوراً ہی آپ سے وہ کرنے آ گیا' کیا میں آپ کو اپنا وہ بتا سکتا ہوں۔"

کوئی اور وقت ہوتا تو انسپکٹر اسے جھڑک کر بھگا دیتا لیکن اس وقت تمام مخالفوں کی موجودگی میں جمشید اسے اپنا اپنا سا محسوس ہوا۔ اس نے کہا۔ "یہاں آؤ اور جلدی سے بتاؤ کہ کیا آئیڈیا لے کر آئے ہو۔"

جمشید نے قریب آتے ہوئے کہا۔

"آپ نے وہ کرنے والوں یعنی محبت کرنے والوں کی باتیں سنی ہوں گی۔ وہ کہتے ہیں میری جان میں تمہاری آنکھوں میں بستا ہوں۔ مگر آپ جانتے ہیں آنکھوں میں تو ساری دنیا وہ ہوتی ہے۔ آپ میرے سامنے ہوں گے تو میری آنکھوں کی وہ میں یعنی پتلیوں میں آپ نظر آئیں گے اور آپ کی آنکھوں کی وہ میں مَیں نظر آؤں گا۔"

"یہ تم کیا بکواس کر رہے ہو؟"

"بکواس نہیں وہ ہے یعنی کہ حقیقت ہے۔ اس طرح انصار کی آخری وہ دیکھئے یعنی تصویر دیکھئے۔ اس میں انصار کے دیدے پھیلے ہوئے ہیں اور اس کی آنکھوں کی وہ میں روزینہ نظر آ رہی ہے۔"

وہ ایسا اچھوتا آئیڈیا تھا کہ انسپکٹر حیرت سے اُچھل پڑا۔ اس نے وہ تصویر دیکھی جس میں روزینہ انصار کا گلا دبوچ رہی تھی۔ انصار کے دیدے پھیلے ہوئے تھے اور ان میں روزینہ کا ننھا سا مبہم سا عکس نظر آ رہا تھا۔

جمشید نے کہا۔ "اس میں صاف طور سے وہ نظر نہیں آئے گی۔ میں اس کے بڑے سائز کا وہ لایا ہوں یعنی کہ بڑے سائز کا فوٹو لایا ہوں۔ یہ دیکھئے۔ اس نے بڑے سے لفافے سے ایک بڑی سی تصویر نکالی' بڑی تصویر کی مناسبت سے انصار کی آنکھوں کا بہت بڑا کلوز اپ نکلا۔ ان آنکھوں کی بڑی بڑی پتلیوں میں مادام روزینہ صاف نظر آ رہی تھی۔

اس تصویر کو اس کے سب ہی حمایت کرنے والوں نے دیکھا اور سب ہی کے چہرے لٹک گئے۔ احمق فوٹوگرافر اپنی کامیابی پر بتیسی نکالے کھڑا تھا۔ انسپکٹر نے فاتحانہ انداز سے روزینہ کو دیکھا تو وہ ایک دم سے مرجھا گئی تھی۔ اس پر چڑھا ہوا مصنوعی جوانی کا خول اتر رہا تھا۔ وہ بیٹھے ہی بیٹھے اپنی جھوٹی عمر سے بہت آگے نکل گئی تھی۔ اس وقت کسی ایج میٹر کے بغیر ہی اس کا بڑھاپا واضح ہوتا جا رہا تھا۔

☆====== ختم شد ======☆